بہار میں
اردو زبان و ادب کا اِرتقا
۱۸۵۷ء تک

از

اختر اورینوی

بہار میں

اردو زبان و ادب کا ارتقا

سنہ ۱۲۰۴ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

مؤلفہ

سید اختر احمد اختر اورینوی، ایم اے

صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

مارچ سنہ ۱۹۵۷ء

"THESIS APPROVED FOR THE DEGREE OF DOCTOR OF LITERATURE IN URDU OF THE PATNA UNIVERSITY, PATNA."

مکتبہ سوز دانا پوری

فہرست مضامین

تصویریں

نوٹ:۔ میں ۱ تا ۸ تصویروں کے لئے پبلک ریلیشن ڈپارٹمنٹ حکومت بہار کا ممنون ہوں جن سے مجھے ان کے بلاک ملے ۔ حضرت آیت اللہ کی تصویر مجھے جناب فصیح الدین بلخی کے ذریعہ دستیاب ہوئی ۔ اصلی قلمی تصویر جس پر حضرت جوہری کا نام بھی لکھا ہوا ہے ۔ بڑی خانقاہ پھلواری شریف میں موجود ہے ۔

" اُورینوی "

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقدّمہ

فلسفۂ زبان و اقوام

"اصل وطن مادری زبان کی حدود میں ہوتا ہے۔" "زبان سے زیادہ کوئی چیز قومی سیرت اور قوم کی ذہنی و روحانی طاقت کی مظہر نہیں ہوتی۔" مغرب و مشرق کے علماء نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زبان انفرادی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ سماجی تغیّرات لسانی ارتقاء کا باعث ہوتے ہیں۔ زبان کی فطری نشو و نما کے ساتھ ساتھ سماجی قماش کے مطابق بھی اس کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔ یوں تو مندرجۂ بالا خیالات نہایت دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان سے قومی پندار و عصبیت کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ

اس طرز کے خیالات محض مَن مانی باتوں کی بنیاد پر قائم ہیں ۔ دُنیا کی موجودہ زبانوں میں ایک بھی تو ایسی نہیں جو اکیلی ایک قوم کی آغوش میں پلی ہو۔

زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریئے پیش کئے جاتے ہیں۔

زبان کیا ہے؟ زبان خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اس کی مزید تفصیل یوں کرتے ہیں ۔

"پس[1] زبان کی واضح تعریف اِن الفاظ میں کی جا سکتی ہے کہ زبان اِنسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی اِن تمام عضوی اور جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوتِ گویائی شامل ہے۔ اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دُہرا سکتا ہے"

سید احتشام حسین 'ہندستانی لسانیات کا خاکہ' از جان بیمزؔ کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں ۔

"یہ بتانا[2] تو بہت مشکل ہے کہ زبان کسے کہتے ہیں ۔لیکن سمجھنے کے لیئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لیئے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں

---

۱ ہندستانی لسانیات صفحہ ۲۶ ۲ ہندستانی لسانیات کا خاکہ صـ۲۲

کے معنی معیّن کر لئے گئے ہیں تاکہ کہنے اور سُننے والے کے یہاں
تقریبًا ایک ہی جذبہ پیدا ہو ۔ الفاظ ان ذہنی تصویروں کی
ملفوظی علامتیں ہیں جنھیں ہم دوسروں کے ذہن تک پہنچانا
چاہتے ہیں ۔ اس طرح زبان ایک بڑا پیچیدہ موضوع بن جاتی ہے
کیونکہ کہنے والا ایک مکانکی اور جسمانی ذریعہ سے سُننے والے
کے دماغ میں ایک نفسیاتی کیفیت بیدار کرتا ہے اور زبان، تالو،
حلق، دانت، ہونٹ اور پھیپھڑے کے مرکّب اور پیچ در پیچ عمل
سے دماغ کے وہ حصّے تقریبًا یکساں طور پر اثر پذیر ہوتے
ہیں ۔ جن میں خیال پیدا ہوتے ہیں ۔ اور جو آوازوں سے
بنی ہوئی ملفوظی تصویروں کے معنی جانتے ہیں ؎۱

زبان کی تعریف معلوم کر لینے کے بعد زبان کی پیدائش کے متعلق
دو اہم نظریوں سے واقفیت ضروری ہے ۔ ایک نظریہ ہے کہ زبان الہامًا
پیدا کی گئی ۔ اردو میں اس خیال کی ترجمانی احمد دین نے اپنی کتاب
"سرگذشت الفاظ" میں کی ہے ۔ اس نظریہ کی دوسری شکل یہ ہے
کہ زبان براہ راست ودیعتِ فطرت ہے جس میں ارادہ کو کوئی دخل
نہیں ۔ دوسرا نظریہ جو مذہبی نظریہ کے مخالف ہے اس امر کو پیش
کرتا ہے کہ زبان کی پیدائش ارتقائی طور پر ہوئی ہے اور زبان انسانوں ہی
نے پیدا کی ہے انسان کی سماجی ضروریات نے اُسے اظہارِ خیال پر مجبور کیا اور اس کی

؎۱ "ہندستانی لسانیات کا خاکہ" از احتشام حسین صفحہ ۲

ترقّی یافتہ جسمانی اور دماغی ساخت نے اُسے اظہارِ خیال کے وہ ذرائع دِیئے جن تک جانوروں کی رسائی نہ تھی۔" غرض یہ کہ اِس نظریہ کے مطابق زبان کی پیدائش کا مسئلہ ارتقائی اور ارادی ہے۔ مابعدالطبیعیاتی نہیں۔ یہ کسبی نظریہ ہمیں بتاتا ہے کہ بچّہ ماں کے پیٹ سے زبان سیکھ کر پیدا نہیں ہوتا بلکہ اپنے ماحول سے زبان سیکھتا ہے۔ اِسی طرح ابتدائی اِنسانوں نے زبان سیکھی ہوگی۔ لیکن چونکہ نمونہ موجود نہ ہوگا، زبان کے ارتقا میں صدیاں لگ گئی ہوں گی۔

اگر سنجیدہ طور پر مذکورہ بالا مخالف نظریوں کے درمیان محاکمہ کیا جائے تو حقیقت تک رسائی ہوسکتی ہے۔ بائبل کے باب پیدائش سے متاثر ہوکر عیسائی علماءِ کلیسا نے خلقِ عالم و آدم کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا ہے وہی آغازِ زبان کے الہامی نظریہ کی تہہ میں ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ تعالےٰ نے آدم و حوّا کو مٹّی سے پیدا کرنے کے بعد اُنہیں الہاماً زبان سِکھا دی اور وہ گفتگو کرنے لگے۔ ویدوں میں بھی سنسار اور مانو کے رچے جانے کا نقشہ کچھ اسی طرز سے پیش ہوا ہے اور برہمن پنڈتوں کا لسانی نظریہ بھی یہی بتاتا ہے کہ ویدوں کی زبان دیو بھاشا ہے جو آکاش وانی کے ذریعہ وید رشیوں کو سکھائی گئی۔ اور قوموں کے اکثر علمائے دین بھی اسرائیلیات یا ہندو صنمیات سے متاثر ہوکر پیدائشِ عالم کا صحیح تصوّر قائم نہ کرسکے۔ دوسری طرف جدید مادّی فلسفوں نے کائنات کے مرکز، اس کی روحِ اعلیٰ،

اس کے مبدا اور خالق سے مُنہ موڑا اور ارتقائے تمدّن کی ہر شئے کو محض انسانی ارادہ سے وابستہ کردیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اِس عظیم مادّی کائنات کا اِرتقا کس کے اِرادے سے ہوا؟ حیات کس کے ارادے سے پیدا ہوئی؟ انسان کِس کے اِرادے سے وجود میں آیا؟ مادئیین کے لئے خدا کا ابدی و ازلی، قدیر و حکیم ماننا تو دو بھر ہوا۔ لیکن، آخرش، وہ مادّہ کو ہی ازلی و ابدی، فعّال، صاحبِ ارادہ، قادرِ مطلق اور حکیم و بصیر ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر سائنس نے اپنے بنائے ہوئے بُت خود توڑنے شروع کردیئے۔ بیسویں صدی عیسوی کی سائنس نے حرفِ آغاز کے لئے مادّے کی بجائے قوّت (ENERGY) کا سراغ لگایا۔ جینز جنیز، آئنسٹائن اور دوسرے ماہرینِ طبعیات کے نزدیک پہلے قوّت و توانائی مُنزّہ ہے، بعد میں مادّہ کا وجود ہوتا ہے۔ مادّہ کو اب وہ اولیّت و اہمیّت حاصل نہیں رہی۔ مادّہ فنا بھی کیا جا سکتا ہے۔ جوہری توانائی کے راز دریافت ہو جانے کے بعد نُورالانوار کی طرف سائنس کی تشنہ نگاہیں بھی اُٹھنے لگی ہیں۔

بہرکیف جیسے علمائے مذاہب کے ایک بڑے گروہ نے پیدائش عالم و آدم کے بارے میں صحیح تصوّر قائم نہیں کیا، اسی طرح سائنس دانوں کی ایک جماعت بھی گمراہ رہی۔ لیکن حقیقت آشنائی سے دین و دانش دونوں کُلّی طور پر محروم نہیں۔ سائنس لغزش و افتاد کے بعد حق و صداقت کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے اور مذاہب کے رازہائے سربستہ بھی اب کھُلتے

جا رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ پیدائشِ زبان کی اصلیت وہی بھی ہے اور کسبی بھی۔ الہامی بھی اور ارتقائی بھی۔ جیسے خود آدمؑ کا وجود اور اس کی ساری تمدنی ترقیاں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ وہ دمادم[1] صدائے کُن فیکون سنتے ہیں۔ خدائے تعالےٰ 'کُن' کہتا ہے اور اس کی مشیت اور قدرت، تدریجی طور پر 'فیکون' کے تحت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ایک اور صاحب تجربہ بزرگ یوں فرماتے ہیں:۔

"غرض[2] اس آیت کا صرف یہ مطلب ہے کہ جب ہم چاہتے ہیں کہ کوئی امر ہو جائے۔ تو ہم اس قسم کی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں اور جس طرح ہم ارادہ کرتے ہیں، اسی طرح واقع ہو جاتا ہے"

دوسرے[3] مقام پر آپ تحریر کرتے ہیں:۔

"یُدَبِّرُ الْاَمْرَ کہہ کر یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالےٰ کی نسبت جو

۱؎ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید + کہ آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون۔ بالِ جبریل ص۴۴

۲؎ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ سورۃ نحل ع ۵ کی تفسیر از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد۔ تفسیر کبیر جلد ۳ ص۶۶۵

۳؎ تفسیر کبیر ۳ ص۱۹ زیر آیت اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ سورۃ یونس ع ۱

کُن فیکون کے الفاظ آتے ہیں، یعنی وہ کہتا ہے 'ہو جا' پس ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے حکموں کو فوراً پورا کرواتا ہے، وقت کی حد بندی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے احکام بھی تدبیر پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یعنی باریک اور مخفی تدابیر سے کام لے کر وہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور تدبیر کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسباب میں ایسا تغیر کیا جائے کہ طبعی نتائج منشا کے مطابق پیدا ہو جائیں"

مندرجہ بالا گذارشات کے پیشِ نظر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "انسان[1] میں زبان سے کام لینے کی استعداد اس کی خاص فطرت کی طرح یقیناً ایک ودیعتِ الٰہی ہے۔ مگر زبان اس حد تک انسان کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ اس خداداد قابلیت کو اپنی فطرت اور عضوی خصوصیات کی مدد سے ظاہر کرتا ہے۔ زبانوں کی تشکیل اور ارتقا براہ راست انسانی خیالات کی تشکیل اور ارتقا پر منحصر ہے" عجیب بات ہے کہ مادی نظریہ کے علمبردار احتشام حسین بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ زبان کی پیدائش میں "ابتداءً[2] قصد اور ارادے کو بہت زیادہ دخل نہیں تھا"

آغازِ کلام میں یہ بات پیش کی جا چکی ہے کہ دُنیا کی موجودہ زبانوں میں

۱۔ 'ہندستانی لسانیات' از محی الدین زورؔ صـ۲۸

۲۔ 'ہندستانی لسانیات کا خاکہ' مقدمہ صـ۲

کوئی ایسی زبان نہیں جس کی پیدائش کسی ایک نسلِ انسانی کے بطن سے ہوئی ہو، یا وہ کسی ایک قوم کی گود میں پلی ہو۔ گو اس کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ ماضی بعید میں خالص بولیاں گوشہ گیر انسانی ٹولیوں اور دُور اُفتادہ قبیلوں میں رائج رہی ہوں۔ لیکن وہ دَور کب کا بیت چکا اور اب اس کی دُھندلی سی جھلک بھی تاریخ کی قدامت کے پردوں کے پیچھے ملنی مُشکل ہے۔ قدیم ترین انسانی بولیاں آوازوں کے تعیّن کی ابتدائی صورتیں ہوں گی۔ اُن آوازوں میں نہ تو کثرت و وُسعت پیدا ہوئی ہوگی اور نہ ترکیبی کیفیت۔ رَفتہ رَفتہ صدیوں میں زبان کا ارتقا ہوا ہوگا۔ اِبتدائی انسانوں کی زندگی کے تجربات خود اِنے گِنے تھے۔ تجربات میں ترقی ہوتی گئی اِنسان اور فطرت کے درمیان نئے رِشتے قائم ہوتے رہے۔ اِنسان فطرت کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہی انسانوں اور جانوروں کے درمیان نمایاں فرق تھا۔ اِنسان کو تدریجی طور پر اَشیاء کا عِلم حاصل ہوا اور اِس عِلم میں نیز اشیاء کے درمیان روابط و تعلّقات کی واقفیت میں اضافے ہوتے رہے۔ اِنسان نے اشیاء، اعمال خاصیتوں اور کیفیتوں کو نام دے کر اپنے علم کو مُستقل، مفید اور دوسروں تک منتقل ہونے وَالا بنانا چاہا۔ اِس طرح زبان کے فطری نشو ونما کے ساتھ ساتھ اِنسان کی ضرورتوں اور اس کے خیالات نے بیان و زبان کی تہذیبی تشکیل کی۔

کسی زبان کے خالص یا مخصوص طور پر قومی ہونے کا تصوّر ہی تہ دار

فریبوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ زبان کی انفرادیّت تو اُسی وقت گُم ہو جاتی ہے جب ایک انسانی ٹولی دوسری ٹولی سے ملتی ہے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے رسم و راہ قائم کرتا ہے اور ایک نسل کے لوگ دوسری نسل کے لوگوں سے مِلنے جُلنے لگتے ہیں۔ یہ تعلقات نوعِ انسانی کے آغاز سے ہی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ ایک بولی دوسری بولی سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے اثر قبول کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کوئی زبان بھی صرف ایک قوم کے گہوارۂ تمدّن میں پرورش نہیں پاتی بلکہ کئی قومیں مل کر اُس کی پرداخت کرتی ہیں۔ ہر زبان ایک زندہ تنظیم اُسی وقت تک رہتی ہے جب تک اُس کے اندر تبدیلیاں رُونما ہوتی رہتی ہیں۔ زبان کو ایک زندہ وجود کی طرح تازہ غذا کی ضرورت ہوتی رہتی ہے۔ نئے تجربات، نئی چیزیں، جدید خیالات و تصوّرات، خواہ وہ سماجی ہوں یا سیاسی یا اقتصادی و مذہبی، نئے اسلوبِ اظہار اور نئے لفظوں کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔ زبان کے نئے عناصر کا بیشتر حصّہ اُس کے صَوتی سانچے میں ایسا ڈھل جاتا ہے کہ اُن عناصر کی اصل تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ ہر زبان میں ایسے لفظوں کی بکثرت مثالیں مل جاتی ہیں۔

انسان کی سماجی زندگی میں جب کوئی نئی جلوہ گری ہوتی ہے تو ایسی نئی لفظی قماشیں اور ہیئتیں بنتی ہیں جو پہلی نسلوں کے لئے ناقابلِ فہم تھیں کیونکہ اُن پیڑھیوں کی سماجی اور ذہنی بُنیادیں نئے لسانی ڈھانچوں

کے مناسبِ حال ہی نہ تھیں ۔ لہٰذا نئی ضروری تبدیلیوں کی عمارت کو پرانی بنیو پر اُٹھانا غلط اور بے اثر طریقہ ہے۔

مختلف راستوں سے تبدیلیاں آتی ہیں، طرح طرح سے زبان ترقی کرتی رہتی ہے۔ اور ایک عرصہ کے بعد زبانیں اِس طور سے بدل جاتی ہیں کہ قدیم و جدید کے درمیان بہت کم مشابہت رہ جاتی ہے۔ اِن کمزور مشابہتوں کو صرف علمائے انکشاف وتحقیقات ہی پہچان سکتے ہیں، اور بس۔ زبان کا آغاز و ارتقا کبھی بھی قومی اصولوں یا تمنّاؤں کے مطابق نہیں ہوتا۔

ہر تحریری زبان کا آغاز کسی بولی (DIALECT) سے ہوا ہے۔ ابتدائی بولیاں خود ایک دوسرے پر اثر ڈالتی رہتی ہیں اور ان میں سے کوئی بولی جو مقابلتہً کسی ترقی یافتہ علاقہ سے تعلق رکھتی ہے، آگے بڑھ جاتی ہے اور زبان بننے کی طرف قدم بڑھاتی ہے۔ اِس نمُو کے دَور میں وہ دوسری بولیوں سے لفظ اور ترکیبیں حاصل کرکے اپنے حلقۂ اثر کو بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ جَیسے جَیسے وہ تحریری اور ادبی زبان بنتی جاتی ہے اس کا اختلاف بول چال کی زبان سے نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ مگر ابھی تک کوئی اَیسا ماہرِ لسانیّات پیدا نہیں ہوا جو بُولی اور زبان کے درمیان واضح اور مستقل خطِّ فاصِل کھینچ سکے۔

پھر یہ ترقّی کرنے اور پھیلنے وَالی بُولی (DIALECT) زبان (LANGUAGE) بننے کے پہلے اور بعد دوسری زبانوں سے سَرمایۂ اَلفاظ و ترکیب حاصل کرتی ہے۔ اس کی لُغت اور قواعد سے بھی

اثر قبول کرتی اور اپنا دامن بھرتی ہے۔ زبان ہر دور اور ہر ملک میں نئی سے نئی چال چلتی اور پُرپیچ راہیں بدلتی ہے۔ لسانیات کے طالب العلم کے سامنے عجیب عجیب لسانی گتھیاں آتی رہتی ہیں۔ بعض تو اب تک عقدۂ لاینحل بنی ہوئی ہیں۔

نوعِ بشر ایک مخصوص نوع ہے جو کامل طور پر ناطق ہے۔ جدید نسلیات اور عمرانیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نوعِ انسان کی مختلف ٹولیوں نے سماجی اور تہذیبی ترقیاں بڑے مشابہ رنگ میں کی ہیں۔ اُن میں بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ نئے انکشافات پُرانے سے پُرانے انسانی کلچروں کو ہمارے سامنے لائے ہیں۔ نیا کلچر پرانے کلچر سے فیضیاب ہوتا ہے اور عموماً ہر کلچر ایک آمیزہ یا مرکّب ہوتا ہے، جو کئی کلچروں سے مل کر بنتا ہے۔ خالص کلچر کا اِس بھری دُنیا میں کوئی وجود نہیں۔ تمام انسانوں کا جوہر اور ان کی عالمگیر خوصیّات بنیادی طور پر ایک ہیں۔ نوعِ بشر کا رُوحانی اور ذہنی عِطر بھی ایک رنگ میں کشید ہوتا ہے۔ اور اِن عِطروں میں بڑی مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے۔

دُنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں میں ایک ہی فِطرت انسانی کام کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اقوام و مِلل کی انفرادی خصوصیتوں کے باوجود اُن کی انسانی قدرِ مشترک ایک ہے، ایک تھی اور قرینہ غالب ہے کہ ایک رہے گی۔ دراصل نوعِ انسان اجتماعی طور پر ایک حیاتی اِکائی ہے۔ نسل و رنگ کی تقسیم ذیلی یا مصنوعی ہے۔ عِلم الحیات نئے انتہا پسندانہ نسلی نظریوں یا پُرانے نسلی توہّمات کا ابطال کرتا ہے

ہٹلر کا آریائی نسلِ خالص کا خبط، برہمنی نسل کی آسمانی تقدیس کا کبر، اسرائیلی اُمّت کی برتری کا پندار اور عرب و عجم کی جاہلانہ تفریق بالکل باطل ہیں۔

اَب رہی یہ بات کہ نوعِ بشر کا آغاز کس طرح ہوا۔ یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے پاس اتنے شواہد موجود نہیں کہ ہم نوعِ اِنسان کے آغاز، ارتقا و توسیع کی پیچ در پیچ منزلوں کا صاف اور واضح نقشہ پیش کر سکیں۔ صرف چند اصولی باتیں بیان کی جا سکتی ہیں اور ایک دُھندلا سا خاکہ پیش کیا جا سکتا ہے اور بس۔ مگر اِس خاکہ کی پیشکش میں بھی اہلِ نظر و خبر کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

زبان اور نسل کے متوازی ہونے سے زیادہ باطل تصوّرِ قوم (جدید معنوں میں) اور زبان کے ایک ہونے کا خیال ہے۔ کثرت سے اَیسی مثالیں ملتی ہیں کہ زبانوں کی سرحدیں قومی سرحدوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یہ اتنی عام بات ہے کہ عصرِ حاضر کی قومی ریاستوں کے درمیان آئے دن زبان کی بنا پر سرحدی جھگڑے اُٹھتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ہی ریاست کے اندر کئی کئی مختلف الاصل زبانیں یا بہت حد تک علیحدہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ سچّائی اتنی صاف اور روشن ہے کہ زبان قومی خصوصیّات میں داخل نہیں۔ آج کی دُنیا میں اِتحاد کی بُنیادوں کے لئے نئے عملی تصوّرات قائم ہوتے جاتے ہیں۔

مختلف زبانوں کی ابتدا اور تشکیل ماضی کی ناقابلِ عبور تاریکی میں اس

طرح ڈھکی چھپی ہوئی ہے کہ ہمیں بہت ہی سنبھل سنبھل کر راہِ تحقیق پر چلنا چاہیئے
ہم زیادہ سے زیادہ فرضیّوں (HYPOTHESIS) ہی کے سہارے چل سکتے
ہیں اور یہ فرضیئے بھی کتنے غیر یقینی ہوتے ہیں۔ فرضیّہ کا نظریہ (THEORY) بننا
بھی بڑی کدوکاوش کے بعد ہوتا ہے ۔ اور لسانیّات کی دنیا میں نظریوں سے آگے
قانون، آئین اور اٹل اصول کی منزل کی طرف بڑھنا اور سرِمنزل پہنچ پاناجوئے شیر
لانے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ پُرانے فرضیّے اور نظریئے نئی تحقیقات کے بعد
ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں نئے فرضیّوں اور نظریوں پر
بھی اعتماد کامل نہیں ہو سکتا ۔

یہ نظریہ، کہ ہر زبان کسی ایک مخصوص نسل یا خاص قوم کی تخلیقِ اختراعی ہے
یا صرف اُسی کی آغوش کی پروردہ ہے، محض بے بنیاد ہے۔ اور اس کا شمار بھی
اُن اَنگنت خود فریبیوں میں ہے۔ جن میں نسلی نظریہ باز اور تنگ نظر قوم پرست
مُبتلا ہیں اور دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس
عالم نیرنگ میں نہ تو خالص نسلوں اور قوموں کا کوئی وجود ہے، نہ خالص کلچر کا
اور نہ خالص زبان کا ۔ نسل، قوم، کلچر، اور زبان یہ سب ہمیشہ سیّال حالت میں ہیں،
تھے، اور رہیں گے ۔ اِن میں ہر آن میل جول، خلط ملط، لین دین ہوتا رہتا ہے۔ نسلیّات
وانواع کا ماہر فریڈرِیش ہرٹز[1]، اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ نسلی خصوصیّات غیر مبدّل اور مقدّس
ہرگز نہیں۔ فطری اور تہذیبی ماحول کے بدلنے سے نسلی و قومی خصوصیّات بدل جاتی ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو فریڈرِیش ہرٹز کی کتاب "ریس اینڈ کلچر"۔

اور پھر اس تبدیلی کا اثر کلچر کی ہر شاخ پر پڑتا ہے۔ انواعِ انسانی کا محقق آبونوسکی کہتا ہے کہ "انواع انسانی کے ٹائپوں کا غیر مبدّل ہونا بس ایک کہانی ہے"

پرافسر جے۔ اِچ ۔ ملر۔ یونیورسٹی آف ٹکساز (امریکہ) نے رونٹجن شعاعوں سے قانونِ توارث کے متعلق بصیرت افروز سائنسی تجربے کئے ہیں۔ اِن تجربوں نے توارث کے نظریوں میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ لہذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "شدھ بھاشاؤں" ذاتوں اور تہذیبوں کے تصوّر کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ:

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

مقدّس نسلوں، تہذیبوں اور زبانوں کا نہ تو کوئی حقیقی وجود کبھی رہا ہے۔ اور نہ آج کسی زبان، نسل یا قوم کی اَزلی و اَبدی برتری و فوقیّت کی کوئی کمزور سے کمزور سائنسی وجہ موجود ہے۔

دُنیا میں جو زبانیں مروّج ہیں۔ اُن کی گروہ بندی عموماً دو اصول کے ماتحت کی جاتی ہے اور تمام عالمی زبانوں کو پہلے اصل کے مطابق دو بڑے گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ گروہ بندی کا پہلا اصل زبانوں کی لفظی اور صرفی خصوصیّات کا جائزہ لیتا ہے۔ پہلا لسانی گروہ یک لفظی زبانوں کا ہے، جن کے اساسی اَلفاظ میں اشتقاق نہیں ہوتا۔ یعنی مادّے کے اِردگرد شکلی تبدیلیوں سے معنی میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ سب کے سب الفاظ، عام طور سے آزاد ہوتے ہیں۔ اور ان میں سابقے[1] اور لاحقے[2] نہیں ہوتے۔ اس گروہ کی زبانوں میں چینی، برما، ہندچینی، ملایا وغیرہ کی زبانیں شامل ہیں۔

---

[1] و [2] سابقے اور لاحقے کی تفصیلی بحث کے لئے پروفیسر وحیدالدین سلیم کی بیش قیمت کتاب "وضع اصطلاحات"

دوسرے گروہ میں دُنیا کی باقی ماندہ زبانیں شامل ہیں۔ اُن میں اشتقاق ہوتا ہے یعنی الفاظ اپنی شکلیں اور مفہوم بدلتے رہتے ہیں۔ سابقے اور لاحقے بھی لفظوں کے آگے پیچھے جُڑ کر معنی میں طرح طرح کے گوشے اور زاویے پیدا کرتے ہیں۔ ایک لفظ اصل یا مصدر ہوتا ہے۔ اور اِسی جڑ سے بہت سی لفظی شاخیں پھوٹتی ہیں اور لفظوں کا مربوط سلسلہ چلتا ہے۔ مثلاً عربی، عبرانی، سنسکرت، لاطینی، جرمن، انگریزی، اُردو، ہندی، فارسی وغیرہ زبانیں۔

دوسری قسم کی گروہ بندی نسلی اور تاریخی یگانگت کی بنا پر ہوتی ہے اِن تعلقاتِ نسلی و تاریخی کے اعتبار سے کُل زبانوں کو آٹھ[1] بڑے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر خاندان کی زبان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ آٹھ بڑے لسانی خاندان حسب ذیل ہیں :-

(۱) سامی، ۲- ہندیوروپی، ۳- ڈراوری، ۴- ہندچینی، ۵- ملائی، ۶- افریقی (بانتو)، ۷- امریکی (سُرخ ہندی)، ۸- مونڑا (آدی باسی)۔

---

[1] "ہندوستانی لسانیات" از ڈاکٹر زور صہ۴۹

اُردو زبان کے آغاز کا پسِ منظر

اُردو زبان کو پرافسر وحید الدین سلیم نے آریائی زبان قرار دیا ہے اور اسے "ہندُ لمانی" تہذیب یعنی ہندو مسلمانوں کے متحدہ تمدن کی پیداوار بتایا ہے۔ دوسرے ماہرین لسانیات بھی اسے آریائی بھاشا ہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر اردو زبان کے آغاز کا پسِ منظر دیکھا جائے اور اس کی تخلیق کے عناصرِ ترکیبی پر غور کیا جائے تو پھر اسے شدھ آریائی زبان کہنے میں احتیاط[1] کرنی پڑے گی۔ اُردو، "ہندو لمانی" تہذیب کی پیداوار ضرور ہے۔ لیکن ہندو تہذیب خالص آریائی تہذیب کا نام نہیں۔ ہندو قوم بھی نسلی اعتبار سے ملی جلی کول آسٹرک، ڈراور، تبتی چینی آریائی قوم ہے۔ مسلم تہذیب بھی کسی ایک قومی تمدن سے وابستہ نہیں ملّتِ اسلامیہ ایک سہی مگر نسلی لحاظ سے یہ عرب، ایرانی، ترکی، مغل، بربر، حبشی، سلافی، چینی وغیرہ قوموں پر مشتمل ہے۔ لہذا ہندُ لمانی تہذیب کی نمائندہ زبانوں

---

[1] ملاحظہ ہو مقالہ "بولیوں کا سنگم" تحقیق و تنقید ص ۴۹ - ۱۹ - از اختر اورینوی

ہیں مختلف لسانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اور جب تک اُن عناصر ترکیبی کا صحیح نقشہ پیش نہ کیا جائے حقیقت مکمّل طور پر سامنے نہیں آتی۔

ہند آریائی تہذیب اور زبان کے غیر آریائی پسِ منظر کے متعلق سونیتی کمار چیٹرجی یوں رقم طراز ہیں:۔[1]

"ہندستانی تہذیب کی تعمیر کا فخر صرف آریہ قوم کو ہی اکیلے حاصل نہیں، بلکہ ہندوستان کے غیر آریہ بھی اس کے حصّہ دار ہیں اور بنیادیں قائم کرنے میں تو اُن کا زیادہ بڑا حصّہ ہے۔"

باہر[2] سے آنے والے آریائی قبیلے نو خانہ بدوش وحشی تھے۔ اُن میں بربریت تھی۔ اُن کے مقابلہ میں ہندوستان کے ڈراوری لوگ بہت ہی مہذّب، شُستہ و شائستہ اور متمدّن تھے۔ اُن کے بڑے بڑے شہر آباد تھے اور اُن کی سنسکرتی دیس بھر میں پھیلی ہوتی تھی۔

سندھ اور پنجاب کی ڈراوری تہذیب اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جس کے متعلق تاریخی مواد بہت کم ملتا ہے۔ لیکن نئی کھدائیوں سے بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس تہذیب میں پڑھنے لکھنے کا فن عام اور ترقی یافتہ حالت میں تھا۔ ابھی تک تشفی بخش طور پر سندھ پنجاب[3] تمدّن کی رسم تحریر کو پڑھا نہیں جا سکا ہے۔ یہ رسم تحریر

---

[1] 'انڈو ایرین اینڈ ہندی' ص ۳۱

[2] انڈو ایرین اینڈ ہندی ص ۱۳۱ - اور 'وولگا سے گنگا تک' از راہول سنکرتیائن۔

[3] 'موہنجو دارو' از سر جان مارشل ۱۹۲۰ء اور 'ہڑپا' از شری مادھو سروپ واتس +

فینقی رسمِ تحریر کے ماقبل علمی اور جزیرۂ کریٹ وقبرص کی رسومِ تحریر سے مشابہت رکھتی ہے۔

سنہ۸۰۰ ق م تا سنہ۳۰۰ ق م کے موریہ براہمی[1] رسم الخط کے قدیم نمونوں سے بھی

---

[1] 'عرب و ہند کے تعلقات' از علامہ سلیمان ندوی ص ۸

" یہ سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان کی تمام تحریریں، بلکہ تمام آرین تحریریں بائیں طرف سے لکھی جاتی ہیں لیکن اس آریہ ورت کی ابتدائی تحریریں حیرت سے سنا جائے گا کہ سامی طرزِ تحریر کی طرح داہنی طرف سے شروع ہوئی تھیں" ص ۱۰، ۱۱ پر یوں درج ہے۔

"انسائکلوپیڈیا برٹانیکا (طبع ۱۱) کے مضمون سنسکرت کا لکھنے والا یہاں کی ابتدائی تحریر کی تاریخ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

'ہندوستانی حروف کی ابتداء کا مسئلہ ابھی شکوک سے گھرا ہوا ہے۔ ہندوستانی تحریر کے قدیم ترین نمونے وہ کتبات ہیں جو چٹانوں پر کندہ ہیں۔ یہ پالی زبان (وہ پراکرت جو جنوبی بودھ مذہبی تحریروں کے لئے استعمال کی جاتی تھی) کے وہ مذہبی احکام ہیں جن کو سنہ ۱-۳۲۵ ق م میں موریہ خاندان کے شہنشاہ اشوک نے کندہ کرایا تھا۔ اور یہ شمالی ہند، شمالی مغربی سرحد، پشاور کے مضافات، اور گجرات میں گرنار سے لے کر مشرقی ساحل پر، کٹک کے ضلع میں جوگادہ اور دھولی تک پھیلے ہوئے ہیں، انتہائے مغرب کے وہ کتباب جو کپور داگڑھی یا شہباز گڑھی اور منصورہ کے قرب وجوار میں ہیں۔ دوسرے کتبات کے حروف تہجی سے بالکل جداگانہ حروف میں لکھے گئے ہیں۔ وہ داہنی جانب سے بائیں جانب پڑھے جاتے ہیں۔ ان کو عموماً "آرین پالی" کہا جاتا ہے۔ رہے دوسرے حروف جو بائیں جانب سے داہنی جانب پڑھے جاتے ہیں "ہندی پالی" حروف کہلاتے ہیں۔ مقدم الذکر جن کو (باقی ص۱۹ پر)

مہنجو داڑو۔ ہڑپا کی لپی کو کچھ مشابہت حاصل ہے۔ موریہ براہمی لپی موجودہ دیوناگری لپی کی مورثِ اعلیٰ کہی جاتی ہے۔ آریوں نے ڈراوری قوموں سے لکھنا پڑھنا اسی طرح سیکھا جس طرح وحشی مونگول و تاتاری فاتحین نے مفتوح بغدادیوں، عربوں، ایرانیوں، خوارزمیوں سے حملۂ ہلاکو اور زوال بغداد کے بعد سیکھا تھا۔ آریہ قبیلوں نے ڈراوری تہذیب سے بہت گہرا اثر قبول کیا۔ ڈراوری مذہب، ثقافت، روایات و اساطیر اور تاریخ نے انہیں متاثر کیا۔ لیکن یہ آریائی زبان تھی جس نے نئی ملی جلی بھاشا میں غالب عنصر کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ چیٹرجی، بھنڈارکر اور گریرسن کا نظریہ ہے۔ مجھے اس نظریہ سے تسلی نہیں حاصل ہوتی۔ اپنے شبہات اور اس کی وجہیں میں بعد میں پیش کروں گا۔ خود چیٹرجی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ غیر آریائی عناصر نے آریائی زبان میں بھرپور نفوذ حاصل کیا اور اُسے شُدھ نہ رہنے دیا۔

(حاشیہ باقی صفحہ ۱) کھروشٹی (خروشتی) یا گندھارا (لپی) حروف بھی کہا جاتا ہے۔ اور جو بظاہر کسی سامی (اور شاید آرامی) زبان سے ماخوذ ہیں، ہندوستان کی بعد کی تحریروں میں کوئی اثر نہیں چھوڑا ہے۔ دوسری طرف ہندی پالی (یا براہمی) حروف جن سے موجودہ ہندستانی حروف ماخوذ ہیں بہت زیادہ مشکوک الاصل ہیں۔ اور اگرچہ اشوک کے وقت تک اس خط نے بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔ اور اس کو علمی مقاصد میں حیرت انگیز طور پر استعمال کیا جانے لگا تھا۔ تاہم اس کے بعض حروف کا قدیم فنیقی حروف سے (جو شاید خود مصری، ہیرو، غلیفی خط سے ماخوذ تھے) تشابہ یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ شاید یہ بھی سامی الاصل ہوں۔

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل پر غور کرنے سے یہ پتہ[1] چلتا ہے کہ عروج کے بعد کی عشرت سامانیاں ہی زوال کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ اپنے اپنے وقتوں میں بابل و بغداد اور موہنجو دارو و دہلی کے انحطاط و زوال کے اسباب ایک جیسے ہی تھے۔ غرض یہ کہ متمدّن و مہذب ڈراوری قوم وحشی آریوں سے شکست کھا گئی۔ عین ممکن ہے کہ وہ آریہ قبیلے جو عراق و عرب میں بودوباش اختیار کر چکے ہوں وہ مہذّب و متمدّن بن گئے ہوں اور ایران و ہندوستان کی طرف آ نکلنے والے خانہ بدوش قبائل وحشی ہوں۔ رفتہ رفتہ ایران و ہندوستان کی قدیم تر قوموں سے گھل مل کر ان آریائی قبائل نے متعدّد عظیم تہذیبوں کی بنا ڈالی۔ ہند آریائی قبیلوں نے ہندوستان کی کول ڈراور نسلوں کے ساتھ مخلوط ہو کر ایک حیرت انگیز نسلی، مذہبی، تہذیبی اور لسانی مُرکّب بنایا۔ ہندو[2] قوم، ہندو تہذیب اور ہندو دھرم مخلوط و مرکب ہیں۔

ہندوستان میں آنے والی اور اسے اپنا گھر بنا لینے والی نسلوں اور قوموں میں سب سے قدیم نگریٹو نسل ہے، جو افریقہ سے غالباً سمندری راستے جنوب ہندوستان میں آئی اور بس گئی۔ آج اُن کی نشان دہی، کادر، کرمبا، ایرولا، اور پنیان قبیلوں میں ہوتی ہے۔ جنوبی ہند کے مذکورہ قبائل میں کچھ

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمۂ تاریخ ابن خلدون اور "انقلاب الامم" از علامہ رینان فرانسیسی +
علامہ اقبال کہتے ہیں ؎ میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر (بالِ جبریل ص ۷۷)

[2] "انڈو ایرین اینڈ ہندی" ص ۲۸ +

حبشی خصوصیّات پائی جاتی ہیں ۔

ہند آنے والی نسلوں میں آسٹرک یعنی آسٹروایشیاٹک (آسٹروی + ایشیائی) کا دوسرا نمبر ہے ۔ یہ شمال ہند چین سے اس ملک میں وارد ہوئی ۔ ہندوستان کے کھاسی، کول، گرکو، ہوز، سنتال، اور غالباً اڑاؤن اور منڈا بھی اسی نسل سے ہیں ۔ یہ قوم سارے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی ۔ آسام سے پنجاب تک شمال مشرق میں اس نسل کا اختلاط منگول (تبتی چینی) نسل سے بھی ہوتا رہا جو شمال مشرقی پہاڑی دروں سے ہندوستان آنے اور یہاں وقتاً فوقتاً بستے رہے ۔ ملک کے اور علاقوں میں آسٹرک نسل ڈراوری نسل سے مخلوط ہوتی رہی ۔ بنگال اور آسام کے خطوں میں میں آسٹرک، منگول، ڈراوری خصوصیات بہت غالب ہیں ۔ کیونکہ آریائی اثر و نفوذ اس طرف بہت دیر سے پہنچا ۔

تیسری نسلی لہر پھر مغرب سے آئی ۔ یہ ڈراوری قوم کا ورود تھا ۔ یہ لوگ غالباً آسٹرک نسل کی آمد کے زمانہ میں یا اس کے آخری دور میں ایشیائے کوچک اور مشرقی بحرِ متوسط کے جزائر سے عراق، ایران اور بلوچستان ہوتے ہوئے ہندوستان آئے ۔ موجودہ براہوئی قبیلہ بلوچستان میں اور جنوب ہند کے تلنگی، تامل، ملیالم، کنڑ ٹولو، ٹوڈا، کوڈرگو اور گونڈ قومیں ڈراوری نسل سے ہیں ۔ عہد ماضی میں یہ نسل سارے ہندوستان میں چھا گئی تھی ۔ اس متمدن قوم نے مہنجو دارو اور ہڑپا جیسے بڑے شہر بسائے تھے ۔

ہندوستان میں داخل ہونے والوں اور یہاں بس جانے والوں میں چوتھا نمبر

آریائی قبیلوں کا ہے۔ یہ بھی مغرب سے آئے اور ان کا سفر شرق بھی قریبًا
انہیں نشانہائے منزل کے مطابق ہوا جو ڈراوری قوم ماضی میں بنا آئی تھی۔
ایشیائے کوچک سے چل کر یہ آریہ عراق میں رہ پڑے۔ کتنی صدیاں وہاں
گذریں۔ یہ قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ ان کا میتانی، حارّی (آریہ =
حارّی = حارث۔ عربی، کھیت جوتنے والا۔ آج بھی سندھ میں کاشتکار قبیلوں
کو حارّی کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ قدیم آریہ قبیلہ حارّی کے سلسلہ سے
ہوں) ماندا، کسّائی، وغیرہ۔ عراق عرب میں رہ پڑے اور ظاہر ہے وہاں کے
لوگوں میں گھل مل گئے۔ یہ عہد دو ہزار پانچسو سال قبل مسیح تھا۔ یہ حضرت نوحؑ
کے بعد اور حضرت ابراہیمؑ کے تھوڑا پہلے کا عہد ہے۔ آریائی زبان میں سامی
اثرات کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ویدک میں بھی سامی اثر موجود ہے۔ کیا عجب
کہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیمؑ نام اور صفات بگڑ کر "برھما" کے روپ میں ظاہر
ہوئے ہوں۔ اسی دور میں مادہ یا میدی اور بعد از آن پرشو آریائی قبائل
عراق عراب کی روایات لے کر شمال مغربی ایران میں داخل ہوئے۔ اور سارے
ایران میں پھیل گئے۔ لسانی اعتبار سے قیام ایران کے اس بڑے دور کو
ہند ایرانی دور کہتے ہیں۔ اس کی ایک شاخ ہند آریائی کہلائی۔ تیسرا گروہ
ساکا قبیلہ کا گروہ تھا جو طاقتور اور مضبوط تھا۔ یہ قبیلہ شمال کی طرف جا نکلا۔ شمال
مشرقی اور شمالی مغربی ایران، افغانستان (سیتھیا اور توران) اور جنوب روس کے
علاقوں پر چھا گیا۔

ایرآن سے ہند میں آریوں کا ورود نہایت ہی تدریجی طور پر ہوا۔ مشرقی ایرآن میں بسنے والے آریہ قبیلے آہستہ آہستہ بلوچستان اور افغانستان سے ہوتے ہوئے پنجاب میں پھیلتے گئے۔ یہ سلسلہ ۱۵۰۰ قبل مسیح شروع ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس عہد میں مشرقی ایرآن کے آدی باسی قبائل اور پنجاب کے آدی باسی ایک ہی قوم سے تھے اور ایک طرح کی زبان بولتے تھے۔ آریہ قبیلوں نے انہیں داسا داسیو نام دیا۔ پُوربی ایران کے آریوں اور پنجاب میں آ بسنے والے آریوں کی بولیاں بھی ایک ہی تھیں۔ اُردو زبان کی ترکیب کے متعلق غور کرنے میں یہ بات ایک اہم نکتہ کو پیش کرتی ہے کہ مشرقی ایران اور مغربی ہند کی بولیوں میں قدیمی یگانگت پائی جاتی ہے۔ اڑھائی ہزار سال بعد اگر اُس عہد کی ہند آریائی بولی سے ایرانی بولی ملی اور ریختہ کی ترکیب ہوئی تو اس اتّصال کی بُنیادیں صدیوں پہلے قایم ہو چکی تھیں۔ بقول محمد حسین آزاد دو بچھڑی ہوئی بہنیں پھر گلے مِل گئیں۔

قبل اس کے کہ آریہ قبیلے ہندوستان میں وارد ہوئے اُن کا ایرآن میں ہزار سال تک قیام رہا۔ ایسی حالت میں آریائی بولیاں ایرانی آدی باسی بولیوں سے ضرور گھُل مِل گئی ہوں گی۔ جیسے وہ بعد میں ہندوستان آکر یہاں کی ڈراوری سے ملیں۔ بہرکیف ہند آریائی عہد کے شروع ہونے سے پہلے آریائی بولیاں عراقی عربی اور قدیم آدی باسی ایرانی سے مِل کر مخلوط ہو گئی ہوں گی۔ لہذا میں اَوستائی اور ویدی بولیوں کو ملوآن بولی سمجھتا ہوں۔

اِس عہد کی نسلوں اور بولیوں کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اتنا تو ظاہر ہے کہ ہند آریائی زبان کا اوّلین نمونہ ترا سینسا گا تھا بھی خالص آریائی نہیں ہوگا اور جب ہندستان میں آریہ قبیلے آئے تو مخلوط بولیاں بولتے آئے جن میں آریائی عناصر کے ساتھ غیر آریائی عناصر بھی موجود تھے نیز یہ کہ ہند آریائی بولیوں میں ڈراوری (داسا داسیو) عناصر مشرقی ایرانی دَور سے ہی ملتے آئے تھے۔ پنجاب، سندھ، مدھ دیش، جنوبی اور مشرقی ہند میں لسانی اختلاط کی آنچ اور تیز ہوگئی جس کے بکثرت شواہد ملتے ہیں۔ مشرقی ایران، پنجاب اور سندھ میں غیر آریائی داسا داسیو (ڈراوری) قبائل بستے تھے، اور اُس عہد میں بھی خطّۂ سندھ کے اندر اُن کے رستے بستے شہر تھے۔

آریہ قبائل اپنے آغاز (وایروس 'WIROS' = آدمی = وِیرَ، سنسکرت) میں بھی بے میل تھے اور دوسرے قبائل سے ہر طرح کے اثرات قبول کر رہے تھے۔ اِن کا تعلق مختلف نسلوں سے تھا۔ حالات زمانہ نے انہیں مخلوط بنا کر اکٹھا کر دیا تھا۔ عہد وسطیٰ میں عراق عرب اور ایران میں نہ جانے کتنا اختلاط نسلی ہوا ہوگا۔ اور لسانی اعتبار سے کتنی آمیزشیں ابتدائی آریائی بولیوں میں ہوگئی ہوں گی۔ جس وقت آریہ قبائل ہندوستان میں داخل ہو رہے تھے (۱۵۰۰ق م قریبًا) تو اس وقت بھی اُن کی قوم میتانی، عراق میں موجود تھی (بوگہانہ کوئی

عا ' انڈو ایرین اینڈ ہندی' ص ۷۔ چیٹرجی۔ اے۔ ایچ۔ کینے۔ مین پاسٹ اینڈ پریزنٹ ۱۹۲۰ء ص ۵۰۵۔ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد اوّل ص ۶۶

مسوّدات سنہ ۱۴۰۰ لہ ق.م) اور ایران تو اُن کا گھر آنگن تھا۔ وہ ہزار سال وہاں قیام کر چکے تھے۔ عراق عرب اور شمال مغربی ایران میں اُن کے توطّن اور بود و باش پر غالبًا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ چیٹرجی تو ویدوں کے عہد میں بھی پنجاب سے مغربی فارس تک ایک لسانی تسلسل کو تسلیم کرتے ہیں۔ اِس وسیع بولی میں 'ر' اور 'ل' ہر دو حرفوں کی آوازوں کے لئے صرف حرف "ر" کی آواز کا چلن تھا۔

جس طرح آریہ قبائل تدریجی طور پر ہندوستان کے مغرب میں داخل ہوئے اور پنجاب پر چھا گئے۔ اسی طرح تدریجی طور پر یہ ہندُستان کے دوسرے خطّوں میں پھیلے۔ اِس توسیع میں صدیاں لگی ہیں۔ بقول ڈاکٹر اس۔سی سرکار سابق صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج، پٹنہ، آریہ حملہ آور تین بڑی بڑی لہروں میں ہندُستان کے طول و عرض میں پھیلے ہیں۔ پہلے پہل صرف پنجاب 'آریہ ورت' بنا۔ پھر سندھ اُس حلقہ میں آیا۔ بعد از آں مدھ دیش (ملک کا وسطی حصّہ) پھر ہند کے جنوبی اور مشرقی حصّے اِس دائرہ میں آئے۔

ہند میں داخل ہونے والے آریہ قبیلوں کی بولیوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا تھا۔ قبیلہ قبیلہ کی بولی الگ الگ تھی اور بُنیادی مشابہتوں کے باوجود اِن میں اختلاف موجود تھا۔ لیکن، کہتے ہیں کہ، اُن کے درمیان ایک اچھی خاصی معیاری ادبی بولی بھی پائی جاتی تھی۔ اور یہی معیاری بولی بھجن اور دُعائیہ نغمات میں استعمال ہوتی تھی۔ یہی معیاری زبان 'رگ وید' اور 'اتھروا وید' کی ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ چاروں وید ایک ساتھ مرتّب نہیں ہوئے۔ اِن کی ترتیب وتدوین کے درمیان بڑا فصل ہے۔ چٹرجی یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ ویدوں کا قدیم ترین مخطوطہ آج سے ہزار سال زیادہ قدیم نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ ویدک روایات اصلاً تین ہزار سال سے بالکل محفوظ چلی آتی ہیں۔ ممکن ہے قدیم مخطوطات ضائع ہو گئے ہوں۔ مگر جو ہے وہ تو خیالی تدوین وید کے دو ہزار سال بعد کا ہے۔ اس دو ہزار سالہ دَور میں نہ جانے کتنا پانی گنگا، جمنا، سندھ اور برہم پُترا سے بہتا ہوا سمندروں میں جا ملا ہوگا۔

سوال یہ ہے کہ ویدوں کا حقیقی زمانہ کیا ہے؟ اس کے متعلق علماء یا تو سکوت اختیار کرتے ہیں یا ظنّی باتیں پیش کرتے ہیں یا صاف طور پر یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ویدوں کے مختلف حِصّوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا آغاز کہاں اور کب ہوا۔ میکس ولر کی طرح بعض علماء تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ ویدوں کے کچھ حِصّے ہندُستان سے باہر رشیوں نے پیش کیے۔ دوسرا گروہ پنجاب کو گہوارۂ وید مانتا ہے مگر گریرسن کے نزدیک "اندرونی آریہ قبیلوں" میں ویدک سنسکرتی اور براہمنی خیالات نے پرورش پائی۔ اور اس اعتبار سے وید مدھ دیش میں رشیوں پر ظاہر ہوئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ویدوں کا کوئی تاریخی لِسانی معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ لِسانی اعتبار سے ویدوں کی عبارت، الفاظ اور ویاکرن

کا ہند ایرانی حصّہ کتنا ہے، خالص ہند آریائی کتنا اور ڈراوری کتنا۔ پنڈت ویدک منی اپنی کتاب ' ویدسَروَسو ' میں لکھتے ہیں کہ اتھروا وید میں بڑی بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ اَبتری کا یہ عالم ہے کہ سیاناچاریہ کے بعد کے زمانوں میں بھی بہت سے " سُکتے " ملا دیئے گئے ہیں۔ (ص ۹۷)۔ ایک دوسرے فاضل پنڈت شانتی دیوشاستری تحریر فرماتے ہیں کہ اب تک اس امر کی تحقیق نہ ہوسکی کہ وید دراصل تین ہیں یا چار۔ منوسمرتی اور شتاپتھا برہمنا کے مطابق وید صرف تین ہیں۔ رِگ وید، یجروید اور ساماوید۔ لیکن وَجاسنیئی اُپانیشاد، برہمنا اوپانیشاد اور منڈل اوپانیشاد کی شہادت کے مطابق وید چار ہیں (رسالہ گنگا، فروری ۱۹۳۱ء، ص ۲۳۲)۔ پنڈت ہردے نرائن لکھتے ہیں کہ شتّنا کا رشی کا صحیفہ چرَناویوہا، اور اُن کی دوسری تحریروں سے وید کے منتروں، شَبدوں اور اَچھروں کی معیّن تعداد ثابت ہوتی ہے۔ لیکن حالیہ وید پُشتکیں اُن کے مُطابق نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، ویدوں میں آزادانہ کمی بیشی کی گئی ہے (رسالہ گنگا، جنوری ۱۹۳۱ء)

حقیقت یہ ہے کہ گوپتھا برہمنا کی تصنیف کے وقت مختلف فرقے کے لوگوں نے اپنے عقاید ثابت کرنے کے لئے ویدوں میں خوب خوب تحریفیں کیں۔ ویدوں میں اختلافات کی کوئی حَد نہیں رہی۔ ہر فرقہ اپنے نسخے کو صحیح اور دوسرے نسخوں کو بے سروپا، مخلوط اور غلط بتاتا تھا۔ آج بھی ویدوں کے نسخوں میں بہ کثرت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور اِن کی بُنیاد اُسی عہدِ ابتری میں پڑی۔ (ویدسَروَسوا۔ صفحہ ۱۰۶ - ۱۰۵)۔

رگ وید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قدیم ترین وید ہے۔ اس کتاب کا بھی کوئی ایک لسانی معیار نہیں۔ موجودہ نسخوں یا قدیم ترین مسوّدوں کی زبان بھی ناہموار ہے۔ رگوید مختلف آریائی قبائل کی بولیوں کا نمایندہ ہے۔ یہ ایک قسم کی ادبی زبان ہے۔ جو شاید ابتدا میں کسی ایک قبیلہ کی بولی کی بنا پر شروع ہوئی ہو۔ اور رفتہ رفتہ دوسرے آریائی قبائل کی بولیوں کو اپنے اندر شامل کرتی گئی ہو۔ بنیادی بولی ملک کے انتہائی مغربی حصّے یعنی پنجاب کی بولی تھی۔ اس میں "ل" (ल) کی آواز کی جگہ بھی "ر" (र) کی آواز ہی مستعمل تھی۔ رگ وید کے وہ حصّے جو بعد میں داخل ہوئے (ल) "ل" کی آواز بھی نکالتے ہیں۔ جو مشرقی قبائل کی خصوصیّت ہے۔

ویدوں کی کوئی معیاری بولی نہیں۔ اور اُن کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ہند میں آنے والے آریہ قبائل کی اوّلین بولی کے نمایندہ ہیں، صحیح نہیں۔ ہاں وہ اُن لسانی نمونوں میں قدیم ترین ہیں جو اب تک قدیم ہند آریائی کے دستیاب ہو سکے ہیں۔ لیکن پرانے سے پرانے ویدی مخطوطے کی عمر ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ویدوں کے بڑے حصّہ کی زبان ہر پہلو سے مخلوط ہے۔ میرا خیال ہے کہ ویدوں کی زبان پر اس سے بہت زیادہ ڈراوری اثر پڑا ہے۔ جتنا قیاس کیا جاتا ہے۔ پھر یہ تو ادبی، مذہبی زبان کا حال ہے۔ بول چال کی بھاشا کا کیا عالم ہوگا۔

کا ڈول، گُنڈرٹ، کیٹل وغیرہ جیسے ماہرینِ لسانیات اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ایران میں بھی ڈراوری بولی بولنے والے قبیلے موجود تھے اور ہند ایرانی عہد میں ہی ڈراوری الفاظ آریائی بولیوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ہند ایرانی اور ہند آریائی بولیوں میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں، جن کا کوئی لسانی بدل ہند یوروپی بولیوں میں نہیں ملتا۔ غالبًا یہ سب کے سب کول ڈراوری ہیں یا اُس سے بھی قبل کے۔ ویدک بھاشا میں ڈراوری شبدوں کا پایا جانا بہت ہی دلچسپ ہے۔ مثلاً:۔ 'ینہار' = ابر، برف۔ "پشپا" = پھول۔ 'پوجن' = پوجا، پرستش۔ 'پھل' = پھل۔ 'بیل' = سوراخ۔ 'بیج' = بیج، تخم۔ 'راتری' = رات۔ 'روپ' = شکل، صورت۔ 'سایم' = شام، وغیرہ۔ غیر آریائی الفاظ 'برہمنا'، صحیفوں کے عہد میں اور زیادہ ہو گئے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

ہر چند کہ رگ وید کی زبان اپنی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے ہند یوروپی آریائی نہج کی ہے۔ لیکن اس کی صوتیات پر ڈراوری اثر صاف طور پر پڑا ہے۔ ویدک بولی نے بہت سے ایسے لفظ ڈراوری بولی سے قرض لئے جو ناآشنا چیزوں کے نام تھے یا نئے تصوّرات سے متعلق تھے۔ مثلاً۔ 'وکپی' = بندر۔ 'وکلا' = فن، آرٹ۔ 'کال' = وقت، عصر۔ 'کوٹ' = جھوپڑی، کٹیا۔ 'گن' = جماعت۔ 'نانا' = بہت سے۔ 'نیلا' = نیلا، بلو۔

مل 'بنگالی زبان کا آغاز و ارتقاء' چیٹرجی۔

ہند آریائی زبان اور ڈراوری زبان میں اور بھی مشابہتیں پائی جاتی ہیں اغلب یہی ہے کہ یہ مماثلت ڈراوری کے اثر کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں۔ ترکیب و صرفی قواعد کی مشابہت کے سلسلہ میں چند مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جیسے حروف منفصل جار کا ترک، قدیم ہند آریائی بولی کے حال اور عصر زمانہ کا قریباً کُلّی طور پر متروک ہو جانا۔ نحو، لسانیات میں صوتیات اور جملوں کی ترکیب و صرف سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ اور بقول چٹرجی نحو کے اعتبار سے ہند آریائی اور ڈراوری دنیائیں بڑی یگانگت رکھتی ہیں۔

ہند آریائی اور ڈراوری زبانوں میں نحوی اعتبار سے بڑی یگانگت پائی جاتی ہے۔ کسی ڈراوری زبان مثلاً "تامل" یا "تلنگی" کا ایک جملہ اپنی ترتیب الفاظ کے لحاظ سے جیوں کا تیوں صرف لفظوں کے بدلنے سے ہندی، اُردو یا بنگالی میں منتقل ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے انگریزی یا فارسی جملے جیوں کے تیوں کسی جدید ہند آریائی میں مُبدل نہیں ہو سکتے۔ یہ رو عہد وسطیٰ[۱] کی ہند آریائی زبانوں یعنی پراکرتوں کے عہد سے ہی چل پڑی تھی۔ پالی اور اور دوسری پراکرتوں کے قواعد نحو کا موازنہ و مقابلہ اگر جدید ہند آریائی زبانوں سے کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہونے لگتی ہے۔ کلاسیکی[۱] سنسکرت تک میں مذکورہ نحوی تصرفات پائے جاتے ہیں۔

ڈراوری اور ہند آریائی زبانوں کے محاوروں میں بھی بڑی یگانگت ملتی ہے

۱؎ "بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا"۔ چٹرجی ص ۱۷۷

فعل امر کو مہذّب و نرم طریقہ سے ظاہر کرنے کے لئے مصدر کا استعمال جیسے بجائے ' یہ کام کرو ' کے ' یہ کام کرنا ' کنڑی زبان میں یوں کہیں گے ' اِی کِلسا ما دووَ دو '۔ فعل سے اَمر بناتے وقت یا تمنّا و طلب ظاہر کرتے وقت فعل ' دینا ' کا اضافہ ' جیسے ' مجھے بولنے دو ' اور تِلنگی میں یوں کہیں گے کہ ' نَنوُ سیپّن آئی ای ' ہندوستان سے باہر کی آریائی زبانوں میں یہ خصوصیّات نہیں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہند آریائی زبان پر ڈراوری ماحول کا اثر پڑا ہے۔ ڈراوری دماغ نے آریائی زبان قبول کرنے کو تو کر لیا ' لیکن اُس نے اُن کی رُوح اور سَاخت و ترکیب اور نشست و برخواست بدل دی۔

ایک اور مشابہت یہ پائی جاتی ہے کہ ڈراوری اور جدید ہند آریائی دونوں زبانوں میں اشیاء اور حرکات سے پیدا ہونے والی آوازوں کے مُطابق الفاظ کا گڑھنا بہت عام اور بہ کثرت ہے۔ جیسے ' کھٹکھٹانا ' تھپتھپانا ' ہنہنانا ' غُرّانا ' سنسناہٹ ' گھڑگھڑاہٹ ' وغیرہ۔ یہ انداز کول بولیوں میں بھی ہے۔

اِسی طرح ' بازگشتی ' لفظوں (ECHO-WORDS) کا پایا جانا بھی ڈراوری اثر ہے۔ اس عمل میں الفاظ کی نیم تکراری کیفیت ظاہر ہوتی ہے ' جیسے:۔ بھات وات ' گھوڑا ووڑا ' کیچڑ ویچڑ ' نقاب وقاب ' کوٹ ووٹ ' گھڑی وڑی وغیرہ۔ تامل اور کنڑ زبانوں میں بھی یہی حال ہے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں آکر آریائی زبان صوتیات، ساخت وصرف نحو و ترتیب اور لغات کے اعتبار سے ڈراوری زبان کا گہرا اثر قبول کرتی رہی۔ اوراب وہ اثرات جدید ہند آریائی مثلاً ہندی، بنگالی، مرہٹی، اردو، وغیرہ زبانوں کی خصوصیات میں داخل ہیں۔

ہند آریائی زبان کے ارتقاء کی مختلف منزلوں سے گذرنا اُس پسِ منظر کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے جسے ہم اردو زبان کی فضائے بعید بلکہ بنیادوں کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اِس لِسانی ارتقاکے نقوش کے اہم ماخذوں کا تذکرہ بھی لازمی ہے۔ اصلی ماخذ تو حسب ذیل ہیں:-

۱- وِیدک لٹریچر۔ اِن کے قدیم ترین مخطوطات آج سے ہزارسال قبل کے ہیں اور بس۔ مگر اِن کی روایات پرانی ہیں۔

۲- برہمنائیں۔ ویدک عہد کے بعد برہمنوں نے ویدوں کی تفسیریں لکھی ہیں۔ یہ صحیفے بھی زبان کے اِرتقاء کو پیش کرتے ہیں۔

۳- قواعد نویسوں کی کلاسیکی سنسکرت۔ پانینی، اور پاتنجلی۔

۴- قدیم پراکرتیں۔ اِن میں قدیم ترین چٹانوں اور لاٹوں پر اسوکا کی کندہ کرائی ہوئی تحریریں ہیں۔ شمال مغرب میں شہباز گڑھی اورمانسہرہ میں کندہ کرائی ہوئی تحریر کھروشٹی رسم الخط میں ہے۔ اور باقی سب براہمی میں۔ ۳۰۰ سنہ ق۔م۔

۵- پالی پراکرت اور دوسری پراکرتوں میں لکھے ہوئے دھارمک مخطوطات۔
پالی میں بودھ دھرم کی تحریریں ہیں۔اور پراکرت ادب کے دوسرے سرمایہ میں
جین دھرم کی پستکیں ہیں۔

۶- قدیم ڈرامے۔ ان میں سنسکرت اور پراکرت دونوں بولیوں کا
استعمال ہوتا ہے۔ کالی داس، بھوبھوتی، اسوگھوش کے ڈرامے مشہور ہیں۔ جیسے
شکنتلا، وکرم اروسی وغیرہ وغیرہ۔

۷- ہیم چندر گجراتی کا پراکرت گرامر ـــ سنہ ۱۰۸۸ـــ۱۱۷۲ء۔

۸- آخری دور کا پراکرتی ادب، یعنی اپ بھرنش کا ادبی سرمایہ ـــ یہ
بہت قلیل ہے۔ مثلاً ہیم چندر کی "دیسی نام مالا"۔

ہند آریائی زبان کے ارتقا کو تین دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیم،
متوسط، اور جدید۔

(الف) قدیم ہند آریائی کی نمائندگی رگ وید اور دوسرے ویدوں کی زبان
سے ہوتی ہے۔ اس ادبی زبان کے علاوہ اس دور کے روزمرہ کی بولیاں بھی تھیں جن
کی بنیادوں پر چھنداسا، رزمیہ شاعری اور برہمنا، ویدی تفسیروں کی زبانوں نے
پرورش پائی اور بعد ازاں انہیں بولیوں میں سے پانینی اور پاتنجلی کی مرصع و شستہ
و شائستہ سنسکرت بھاشا نے جنم لیا۔ اور بہت بعد اسی نیو پر کالیداس اور دوسرے
ناٹک کاروں کی بھاشا کی عمارت کھڑی ہوئی۔

(ب) عہد وسطیٰ، گوتم بودھ کے زمانہ سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔ اس کی

ادبی نمائندگی پالی اور دوسری پراکرتوں سے ہوتی ہے۔

قدیم ہند آریائی بولیوں کی صوتیات، قواعد وغیرہ میں نمایاں تبدیلی شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ سنہ ۱۱ء تک ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ جدید ہند آریائی عہد تک جاری رہی۔ انہیں بولیوں سے پالی اور پراکرت ادب پیدا ہوا۔

(ج) جدید ہند آریائی دور کے آغاز کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا یہ دور آخری عہد کی پراکرتوں یعنی اپ بھرنشوں کے سمئے سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً ہیم چندر کے پیش کردہ نمونے اور بعد ازاں پرانی ہندی بھاشا شاعری کی زبانیں۔

قدیم ترین پراکرتی دور اسوکا کی کندہ کرائی ہوئی عبارتوں، اوران کے علاوہ دوسری کندہ عبارتوں (سنہ ۳۰۰ ق م تا سنہ ۲۰۰ء) بودھی مذہبی صحیفوں (پالی) جین ستروں، اور قدیم ناٹکوں (اشوگھوش[1]) پر منحصر ہے۔

متوسط پراکرتی عہد کالی داس اور اس کے بعد آنے والے ناٹک کاروں کی برتی ہوئی شورسینی، مہاراشٹری اور ماگدھی پراکرتوں، قواعد[2] نویسوں کی پراکرتوں اور متاخرین جین بزرگوں کی پستکوں پر حاوی ہے۔

متاخرین کی پراکرتوں یعنی اپ بھرنشاؤں میں ادبی نمونے بہت کم ملتے ہیں۔ یہ بول چال کی رواں دواں بولیاں تھیں اس دور میں ہر طرح کی لسانی تبدیلیاں بڑی تیز رفتاری سے عمل میں آرہی تھیں، صوتی، ہیئتی، صرفی ونحوی۔

---

[1] "اشوگھوش" کے ناٹکوں کے ٹکڑے۔ متوسط ایشیا میں دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ کشن عہد کے ہیں +

[2] قواعد نویسوں نے لکھا ہے کہ پیشاچی پراکرت میں "برھت کتھا" منظوم ہوئی تھی +

ہیم چندر نے ایک مغربی اَپ بھرنش کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس کے نمونے درج کیے ہیں۔

اَسوکا کے دربار کی زبان اَردھ ماگدھی تھی۔ کتبہ عبارتوں میں تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ یہی زبان ملتی ہے۔ اَسوکا اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں "مگدھ پن" سارے ہندُستان پر چھا گیا تھا۔ ماگدھی اور اَردھ ماگدھی کے لِسانی اثرات دور دور تک پھیل گئے تھے۔ اور اِن اثرات[1] نے مغربی بولیوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ گِرنار، شہباز گڑھی، مانسہرہ کی کتبہ عبارتوں سے اِس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ بودھ دھرم کے ذریعہ یہ اثرات وسط ایشیا تک پھیل گئے تھے۔ ہندُستان میں زبانیں اور بولیاں ہمیشہ ایک دوسرے سے ملتی اور ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہی ہیں۔

بودھ اور مہاویر کی نصیحتیں اور وعظ اَردھ ماگدھی میں درج کیے گئے تھے۔ یہ پراچین بولی تھی۔ گوتم بودھ کے یہ مواعظ بعد میں کسی مغربی بولی میں بھی منتقل کیے گئے۔ یہ مدھ دیشیا علاقہ کی بولی شورسینی[2] کی کوئی قدیم شکل تھی۔ لیکن یہ ترجمہ ملا جُلا ہوا تھا۔ بنیادی اَردھ ماگدھی بولی بھی اس کے ساتھ وابستہ و پیوستہ تھی۔ غرض یہ کہ شورسینی اور اَردھ ماگدھی کے مجموعے کو پالی کہتے ہیں۔ گویا پراکرت کی پہلی ادبی شکل پالی کہلائی جو خود ملی جُلی زبان تھی۔

---

[1] امریکن جرنل آف فائلو لوجی ۱۹۰۹ء، ص ۲۸۴۔

[2] "تاریخ زبان اُردو" از ڈاکٹر مسعود حسین۔ ص ۲۳-۲۲۔

اس میں بودھی سنسکرت کے الفاظ بھی بعد میں ملے ۔ خصوصاً اُن دوروں میں جب
سنسکرت کے احیاء کی کوششیں ہوتی رہیں ۔ خود پالی میں ارتقائی کیفیت پائی
جاتی ہے ۔ لیکن سنہ ۵ء کے بعد کلاسیکی سنسکرت کی طرح پالی بھی منجمد زبان بن
کر رہ گئی ۔ اور مصنوعی ہوکر عوام سے دور ہوگئی ۔

پالی اور دوسری پراکرتوں کی طرح خود سنسکرت بھی ملی جلی زبان اور
تین تہذیبوں کی نمائندہ تھی ۔ آریائی ، ڈراوری اور آسٹرک ۔ ایک پہلو سے
سنسکرت کو اپنے علاقے اور عہد کی پراکرت کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن قواعد دانوں
کے اثر سے جب وہ مصنوعی زبان بن گئی تو دوسری مخلوط بولیوں نے پے بہ پے
اس کی جگہ لی ۔ پالی ، دوسری پراکرتیں ، اَپ بھرنش ، بعد ازآں نئی بھاشائیں اور
پھر ہندی ، بنگلہ اور اُردو زبانیں جیتی جاگتی زبانوں کی حیثیت سے عوام میں ، اور
زندہ ادب میں مستعمل ہوئیں ۔

اُردُو زبان کا اِرتقا

اُردو جدید ہند آریائی دَور کی ایک اہم زبان ہے۔ جدید ہند آریائی دَور کے آغاز کے متعلق کوئی قطعی بات پیش نہیں کی جا سکتی۔ یہ دَور آخری عہد کی پراکرتوں یعنی اَپ بھرنشوں کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن اَپ بھرنشوں اور جدید آریائی عہد کی زبانوں کے درمیان کوئی صاف، واضح، معیّن اور دوٹوک حدِ فاصل کھینچنا ناممکن ہے۔ زندگی، سماج، تمدّن وتہذیب، زبان، ادب اور فن رواں دواں تغیّر پذیر حقیقتیں ہیں۔ تغیّرات میکانکی طور پر رونما نہیں ہوتے بلکہ تدریجی اور عضویاتی رنگ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک دَور کا دوسرے دَور سے تعلق رہتا ہے۔ دو دَوروں کے درمیان ایک عبوری منزل آتی ہے۔ اور اس عبوری زمانہ میں دورِ ماسبق و مابعد کی ملی جُلی کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

یوں تو جدید ہند آریائی دَور ۱۰۰۰ء سے شروع ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر میرے خیال میں ۱۰۰۰ء تا ۱۳۰۰ء، لسانی اعتبار سے ایک عبوری دَور ہے۔ پُرانے سانچے بدل رہے تھے۔ زبانوں میں صَوتی، ہیئتی اور قواعد کی تبدیلیاں رُونما

ہو رہی تھیں۔ استقلال کا دَور گذر چکا تھا۔ اضطراب کا زمانہ آگیا تھا۔ یہ کیفیت ہندُستان کی سماجی، سیاسی، اور اقتصادی سطحوں پر بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ ملک کی نفسیاتی اور ذہنی حالت بھی دُخانی تھی۔ ہرشؔاوردھن کے بعد بے ثباتی اور ابتری تو پھیلی تھی مگر اس حال میں بھی ایک ثبات اور استحکام پیدا ہو گیا تھا۔ تا آنکہ پرانی سماجی تنظیم کی برف پگھلنے لگی اور رفتہ رفتہ انقلاب کے تیز جھکڑ بھی چلنے لگے۔ ہندُستان کی زندگی، سماج، سیاست، اقتصاد، زبان، ادب، آرٹ، سبھی مُنقلب ہو رہے تھے۔

یہ زمانہ تغیر بڑا اہم ثابت ہوا۔ بودھ مذہب کا اثر ختم ہو رہا تھا۔ اور برہمن اپنے فلسفے کو نیا رنگ دینے میں مشغول تھے۔ نئی قومیں اور نئے تمدّن ملک میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ دو بڑی تہذیبوں، ہندو اور مُسلم، کا تصادم اور پھر اختلاط ہوا۔ اس عہد کی بھاشائیں سیّال حالت میں تھیں اور انقلاباتِ زمانہ کا اثر قبول کر رہی تھیں۔ چیٹرجی کی رائے کے مطابق اگر ہندوستان پر مُسلم قبضہ نہ بھی ہوتا تو بھی لِسانی تبدیلیاں رونما ہوتیں اور ایک نیا لِسانی دَور شروع ہو کر رہتا۔ لیکن نئی ہند آریائی زبانوں کی پیدائش اور ان کے اندر ادب کی تخلیق اتنی جلد نہ ہوتی اگر مسلمانوں کے زیر اثر ایک نئے تہذیبی دَور کا آغاز نہ ہو جاتا۔[1]

" اَپ بھرنشوں نے نکھر کر جدید ہند آریائی پراکرتوں کی شکل اختیار کی "
(احتشام حسین)۔ لیکن اس جدید دَور میں داخل ہوتے ہوتے صدیاں لگیں۔ دوسری

---

[1] ' انڈو ایرین اینڈ ہندی ' ص ۹۸

اہم بات یہ ہے کہ عہدِ وسطیٰ کی ہر پراکرت سے اَپ بھرنش پیدا ہوئی ۔ اور اُن اَپ بھرنشوں کی مزید تبدیلی کے بعد تدریجی طور پر جدید ہند آریائی زبانیں وجود میں آئیں ۔ جن میں اُردو بھی شامل ہے ۔ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ شورسینی پراکرت سے شورسینی اَپ بھرنش نکلی اور ایک مخلوط شورسینی اَپ بھرنش اُردو سے پہلے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی بولی بھی بنی ۔

جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کے سلسلے میں چند نکتے اہمیّت رکھتے ہیں ۔

(الف) ہر بولی جانے والی پراکرت سے کئی جدید بولیاں پیدا ہوئیں ۔ اِن کے اصل کے لحاظ سے ان کی گروپ بندی کی جاسکتی ہے ۔ اور ان کی مشترک خصوصیات رہنما بنتی ہیں ۔ اسی طرح قدیم ہند آریائی بولیوں کی جڑ سے کئی شاخیں پھوٹی تھیں اور پراکرتوں کا وجود ہوا تھا ۔

(ب) ہندوستان کی لسانی تاریخ میں یہ دلچسپ بات ہوتی رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی بولی ہر دَور میں دوسری بولیوں پر فوقیّت حاصل کر لیتی ہے ۔ اَسوکا سے پہلے مغربی بولی فائق رہی اور اَسوکا کے زمانہ میں مشرقی اُردھ ماگدھی نے سبقت وسیادت حاصل کی ۔ پھر کوشن عہد میں مغربی اور وسطیٰ بولیوں کی اہمیّت اور ہندوستان گیری عود کر آئی ۔ بعد کے دوروں میں مغربی اَپ بھرنش کا عروج ہوا ۔ پھر برج بھاشا سب بھاشاؤں پر چھائی اور آخر الامر ہندوستانی اُردو کی نوبت آئی ۔ گویا عام طور پر مغربی اور وسطیٰ بولیوں کو ملک بھر میں اہمیّت اور وُسعت

حاصل ہوتی رہی ہے۔

(ج) کوئی بھی جدید ہند آریائی زبان ایسی نہیں جسے ہم صرف کسی ایک وسطی ہند آریائی بولی کی خالصتاً اور براہ راست ترقی یافتہ شکل کہہ سکیں۔ ہندوستان اپنی وُسعت کے باوجود ایک اکائی ہے۔ اس کے مختلف حصّوں کے درمیان رُسل رسائل، ربط و تعلقات، آمدورفت کے سلسلے ہمیشہ قائم رہے ہیں۔ یہاں کی لسانی زندگی میں باہمی اثر و تاثر سدا ہوتا رہا ہے۔ لسانی لہریں باہم دگر پیچیدہ قاش بناتی رہی ہیں۔ اسی[1] سبب سے اکثر نئی ہند آریائی بولیوں کی ارتقائی منزلیں اُلجھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو اس اُلجھن کو دور کرنا اور لسانی فارموں کی گتھی کو سُلجھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ نئی بولیوں کے 'تدبھاو' الفاظ کے ہیئتی ارتقا میں اتنا تنوع اور اُلٹ پھیر ہے کہ اُن کے آغاز و اصل کا قطعی تصوّر قائم کرنا محال ہو جاتا ہے۔ یہ اندرونی تنوع اور اختلاف ہمسایہ اور ایک تنے سے نکلی ہوئی بولیوں کے اثرات کی وجہ سے زیادہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کے مرکزی خطوط عموماً واضح ہیں۔

(د) جدید ہند آریائی زبانوں کا ترکیبی وصَرفی ارتقا مجموعی طور پر یکساں ہوا ہے۔ اِن جدید ہند آریائی زبانوں کی باہمی مشابہت اتنی قریبی ہے کہ اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وسطی ہند آریائی بولیوں کے درمیان بھی خاصی یگانگت پائی جاتی تھی۔ اور یہ مشابہتیں[2] جدید ہند آریائی عہد کے آغاز تک باوجود بولیوں کے

---

[1] 'بنگالی زبان کا آغاز وارتقا' ضمیمہ 'D' ص ۱۸۹ [2] البیرونی (۱۰۲۵ء) کا بھی یہی

کے فرق کے موجود تھیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں کی ترکیب و قماش (MORPHOLOGY) میں ان کی صوتی کیفیات کی بہ نسبت زیادہ قدیم مواد کا توڑ جوڑ اور الٹ پھیر نظر آتا ہے۔ اس بارے میں قدیم ہند آریائی بولیوں (ویدک اور سنسکرت) کا براہ راست اصلی ورثہ بہت ہی کم ہے۔

(۵) جدید ہند آریائی زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ چار عناصر پر مشتمل ہے۔ (۱) تَتسَم، (۲) تدبھاؤ۔ (۳) دِیسی۔ (۴) ودیسی۔

(۱) تَتسَم — وہ الفاظ جو سنسکرت اصل کے ہیں، اُن کی ہیئت بھی سنسکرت جیسی ہے۔ اور اُن میں کوئی صوتی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی۔ جیسے سُندر، دیو، دیش۔ بعض تَتسَم لفظوں میں تھوڑی صوتی تبدیلی یا تلفّظ میں ترمیم ہوئی ہے۔

(۲) تدبھاؤ — تدبھاؤ کا عنصر عوامی اور مقامی عنصر ہے۔ یہ وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی بولیوں کا فطری سرمایہ ہے۔ یہ سرمایہ قدیم ہند آریائی سنسکرت یا براہ راست ویدک سے ہی حاصل ہوا ہے۔ مگر اس پر زمانہ کی کھراد اور شکست و ریخت کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ جدید ہند آریائی زبانوں کے الفاظ کی نمایاں اکثریت تدبھاؤ عنصر کی ہی ہے۔ یہی عنصر نئی بولیوں کا وسطی دھارا ہے۔ اور پراکرتوں میں بھی یہی گویا سب کچھ تھا۔ تتسم الفاظ صدیوں کی نت نئی تبدیلیوں کے بعد بھانت بھانت کے تدبھاؤ الفاظ میں فطری طور پر بدل گئے ہیں۔

مشاہدہ تھا (کتاب الہند) نیز پرافسر جیولس بلاک (JULES BLOCH) کی رائے اس کی تائید کرتی ہے۔ (انڈوایرین اینڈ ہندی، چٹرجی ص ۱۲۳۔

یہ الفاظ زندہ، رواں دواں، خودگر، خودشکن، اور تازہ کار ہیں۔ یہ زبان کا جیتا جاگتا، چونچال، بہتا، بل کھاتا، سکڑتا، پھیلتا اور نئی لہروں میں بٹ جانے والا دھارا اپنے منبع سے نکل کر صدیوں کا سفر کرتا ہوا، خزانے لٹاتا اور زندگی کو شاداب و پُرمعنیٰ بناتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔ نئی بولیوں کے دوسرے عناصر خواہ تتسم الفاظ ہی کیوں نہ ہوں محض اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تتسم لفظ حرفی کمی بیشی، ردّو بدل اور صوتی تبدیلیوں کے بعد تدبھاو بنے ہیں۔ یہ تدبھاو لفظ ہمیشہ چولا بدلتے رہے ہیں اور ان کا چولا بدلنا لسانی دور اور علاقائی بولیاں پیدا کرتا ہے۔ ان کی لچک داری سے جدّت، نیرنگی اور کثرت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ان لفظوں کی اصل ایک ہے۔ لہٰذا اس کثرت میں وحدت کی جلوہ گری ہے۔ تدبھاو کی مثالیں لاکھوں ہے۔ مثلاً ماں، باپ، بھائی، بہن، روٹی، پانی، کھانا، پینا، آنا، جانا، سونا، پیڑ، پودے، کھیت، ندی، ناؤ، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک، جینا، مرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ مثالیں تو اُردو ہندی (ہندستانی) کی مثالیں ہیں۔ انہیں لفظوں کے متوازی اور مماثل الفاظ ہر نئی ہند آریائی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ جو اُن زبانوں کی تدبھاو پونجی ہے اب ذرا تتسم کی شکست و ریخت کا نقشہ دیکھیے۔ ہیئتی تبدیلی کی منزلوں کا مشاہدہ آنکھیں کھولنے والا ہوتا ہے۔ پُتر (تتسم سنسکرت) ← پُتّر ← پُت ← پوت پُت ← پُتا یا بُتا ← ← بیٹا +

دوہِتر (سنسکرت) ← دوہیت ← دیہیتا ← دھیتا ← دھیدا

← دھی آ (دھیا) ← دھی (ہندی) ← جھیا ← جھی (بنگالی)

دھیتا ← دھیدیا ← بھٹیا ← بیٹیا ← بیٹی۔

اسی طرح بھراترَ سے بھائی، ماترَ سے ماں، پترَ سے باپ، دیوش سے دن، دَدَرشَ سے دیکھنا وغیرہ وغیرہ

(۳) دِیسی — جدید ہندوستانی زبانوں میں الفاظ کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جسے آریائی ماخذ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے الفاظ کول اور ڈراوری عہد سے منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں یہ اُن عوامی بولیوں کی یادگار ہیں جو آریائی بولی کے اثر و نفوذ سے پہلے ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے باب میں ذکر ہو چکا ہے کہ کول ڈراوری الفاظ ویدک دَور سے ہی آریائی بولی میں داخل ہونے لگے تھے۔ یہ عمل وسطی ہند آریائی دَور میں بھی جاری رہا۔ اور جدید ہند آریائی زبانوں میں کول ڈراوری الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ فطری طور پر شامل ہے۔ مثلاً پھَل، بیج، روپ، نیلا، کُٹیا وغیرہ۔

دیسی الفاظ کی دوسری قسم آہنگ دار (ONO MATO POETIC) لفظوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً کھٹکھٹانا، تھپتھپانا، جھلانا۔ لہانا وغیرہ۔

(۴) ودیشی — جدید ہند آریائی زبانوں میں بہت سے لفظ غیر مُلکی ہیں۔ یوں تو آریائی لفظوں کو بھی غیر مُلکی کہا جا سکتا ہے۔ بہرکیف دیسی اور ودیشی کی اصطلاحیں اضافی ہیں اور بس۔ ورنہ ڈراوری، آریائی،

فارسی، عربی، وغیرہ سبھی الفاظ ودیشی کہے جا سکتے ہیں۔ جدید ہند آریائی زبانوں میں اُن لفظوں کو نسبتی طور پر ودیشی کہا جاتا ہے جو نہ تو آریائی ہیں (تتسم اور تدبھاو) اور نہ دیسی کول ڈراوری۔ اُردو کے علاوہ کم وبیش سبھی ہند آریائی زبانوں میں ایسے بہتیرے بدیشی الفاظ ہیں۔ اس گروہ کے سب لفظوں کے متعلق یہ کہنا بہت مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہے کہ یہ کب اور کس طرح زبان میں داخل ہوئے۔

اُردو زبان اُس دور کی پیداوار ہے جب دوسری جدید ہند آریائی زبانیں اپ بھرنشوں سے پیدا ہو رہی تھیں۔ اُردو بھی اُسی جدید ہند آریائی دور کی پیداوار ہے۔ لیکن دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کے مقابلہ میں اس کی تخلیق زیادہ مرکب، پیچیدہ، بابیدہ اور ارتقا یافتہ انداز میں ہوئی ہے۔ اُردو، بلاشبہ ایک جدید ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن صفت "آریائی" پر غیر متوازن زور حقیقت وحق اور ہندی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کے خلاف ہے۔ یہ تاکید ساری جدید ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کو پیش نظر رکھتے ہوئے صحیح نہیں۔ نہ تو ملک ہند خالصتاً یا بہ اعتبار اکثریت "آریہ ورت" ہے۔ اور نہ یہاں کی کوئی جدید ہند آریائی زبان خالصتاً آریائی کہلانے کی مستحق ہے۔ خاص کر اُردو کو اپنے ڈراوری ورثہ پر وہی فخر ہے جو اُسے اپنے ہند آریائی یا سامی یا ہند ایرانی ورثہ پر ہے۔

دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ "قدیم اُردو" یعنی ابتدائی

" ریختائیں " ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ یوں تو ہر جدید ہند آریائی اور ہر جدید ڈراوری زبان پر عربی اور فارسی زبانوں کا اثر پڑا ہے۔ لیکن اُردو زبان کے ارتقا میں عربی و فارسی زبانوں کا خاص اثر پڑا ہے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ اُردو زبان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک علاقائی اور دوسری ہندوستان گیر۔ اِس عملِ ارتقا کا اظہار بہت ہی مرکّب اور پیچیدہ حرکت کے ساتھ ہوا ہے۔ اس راہ میں " قدیم اُردو " کے مختلف سانچوں کی منزلیں آئی ہیں۔ اور اِن منزلوں میں ایک اہم ترین منزل " کھڑی بولی " کے سانچے سے بننے والے ریختہ کی منزل تھی۔ بعد از آں اِس معیاری سانچہ کے مستحکم ہو جانے کے بعد عہدِ وُسطیٰ میں " معیاری اُردو " کے ہندوستان گیر بننے کی مختلف منزلیں آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی تخلیق کے سلسلہ میں " کھڑی بولی ریختہ " کا مرکّب سانچہ نگاہِ فطرت میں منزلِ مقصود کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہرکیف جدید ہند آریائی زبانوں میں زبانِ اُردو کو نمایاں انفرادیّت حاصل ہے۔ اور یہ انفرادیّتِ لسانی اُردو ادب کے مزاج کو بھی منفرد و مشخّص بنانے میں مُمد و مُعاون ہوئی ہے۔

اُردو زبان و ادب کے سلسلہ میں کسی مقامی نظریہ کی تائید سائنسی حقیقت اور صداقتِ محض کے خلاف ہے۔ اُردو زبان کی پیدائش کے متعلق کسی جُزوی یا سادہ تصوّر کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس کے بجائے اب اہلِ خبر و نظر کُلّی حقیقت اور بالیدہ و مرکّب قماش کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ حیات کی جس رَو نے، تہذیب کی جس

تحریک نے، اور تاریخ کے جس دور نے اُردو زبان کو پیدا کیا وہ بہت ہی وسیع، تہدار و مرکّب کیفیتِ زندگی تھی۔

ویدک اور سنسکرت یا قدیم ہند آریائی زبان کا دور پندرہ سو سال قبل مسیح سے پانچ سو سال قبل مسیح تک ہے۔ وسطی ہند آریائی زبان کا عہد قریباً چھ سو سال قبل مسیح سے ہزار سال بعد مسیح تک اور جدید ہند آریائی کا زمانہ ہزار سال بعد مسیح سے آج تک۔ وسطی ہند آریائی زبان کے عہد میں پراکرتوں کا دور دورہ تھا۔ پراکرتوں کے تین دَور ہوئے ہیں۔ آخری عبوری دَور کا نام 'اَپ بھرنش' ہے۔ جتنی پراکرتیں تھیں اتنی ہی اَپ بھرنشائیں۔ دراصل یہ پراکرتوں کی بدلی ہوئی صورتیں تھیں۔ یہی اَپ بھرنشائیں بعد میں بھاشاؤں کے الگ ناموں سے یاد کی جانے لگیں۔

تین بڑی پراکرتیں ارض ہند میں پھلی پھولی ہیں۔ شورسینی، مہاراشٹری اور ماگدھی۔ شورسینی، وسطی مغربی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ مہاراشٹری جنوبی علاقہ میں اور ماگدھی مشرقی علاقہ میں۔ یہ تینوں پراکرتیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہی ہیں۔ اور ان کے اثرات ہند کی دوسری پراکرتوں پر بھی پڑتے رہے ہیں۔ مگر عام طور پر لسانی لہریں مغرب سے مشرق کی طرف جاتی رہی ہیں۔ مغربی اور وسطی زبانوں کی حیثیت اکثر و بیشتر معیاری رہی ہے۔ لیکن موریا خاندان کے عروج کے زمانہ میں تہذیب اور زبان کی لہریں مشرق سے مغرب کی طرف بڑھنے لگیں۔ لہٰذا ماگدھی پراکرت کے اثرات شورسینی اور مہاراشٹری پر

زمانہ تک پڑتے رہے۔ تاہم خود پالی[1] ایک ایسی اردھ ماگدھی زبان تھی جس پر مغربی پراکرتوں کا نمایاں اثر پڑا۔ یہ بھی نہایت اہم حقیقت ہے کہ مہاراشٹری[2] پراکرت صرف شورسینی سے فیضیاب نہیں، بلکہ اسی کی ایک شاخ تھی۔

مذکورہ بالا حالات میں یہ کہنا کہ بعد کی اَپ بھرنشائیں۔ یا بھاشائیں خالص رہی ہوں گی۔ صحیح نہیں۔ ساخت وترکیب میں یہ بھاشائیں، خصوصاً ان کی ادبی شکلیں قریبی اور دوسری ترقی یافتہ بھاشاؤں سے بہت متاثر ہوتی رہی ہیں۔ راجستھانی پنگل (اَدبِ شعری کی زبان) کھڑی بولی سے متاثر رہی۔ برج بھاشا کا اثر دوسری بھاشاؤں پر پڑتا رہا۔ اور وہ خود بھی دوسروں سے اثر قبول کرتی رہی۔ بہار کی میتھل بھاشا نے بنگالی بھاشا کو متاثر کیا۔ اور خود اس کے اثر میں آئی۔ اسی طرح اودھی اور بھوجپوری نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ راجستھانی پنگل نے بہت سی بھاشاؤں کی ادبی زبان پر اپنا سکّہ جمایا۔ یہاں تک کہ دور دراز کی بنگالی پر بھی (چٹرجی)۔

اُردو کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بحث کہ اس کا بنیادی لسانی سانچہ کون سا ہے، اہم ضرور ہے۔ اور اس امر کا تعیّن لازمی ہے۔ لیکن ابتدائی یا بنیادی سانچے کو حد سے زیادہ قطعیت دے دینا صحیح نہیں ہوگا۔ تھوڑی خلط ملط کی گنجائش رکھنی ہوگی۔ کیونکہ قدیم ہند آریائی عہد سے لے کر جدید ہند آریائی زمانہ تک

---

[1] ملاحظہ ہوں وولنر، لاؤ اور چٹرجی کی کتابیں۔ [2] انڈو ایرین اینڈ ہندی۔ چٹرجی ص ۸۵-۸۶ دکھنی ریختہ بھی کھڑی بولی ہندوستانی پنجابی ریختہ کی شاخ ہی تھی۔

لسانی سانچے خلط ملط ہوتے آئے ہیں اور آج تک ہو رہے ہیں۔

اُردو زبان بھاشا اور فارسی و عربی کے میل سے بنی ہے۔ اس ریختۂ اُردو پر ارتقا کے کئی دَور گذرے ہیں۔ میں ان اَدوار کا مختصراً جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے کئی مقالوں[1] میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ میں ریختہ یعنی "قدیم اُردو" کی صرف ایک شکل تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ میرا یہ نظریہ ہے کہ جتنی "بھاشائیں" ہند میں تھیں، اُتنی ہی ریختائیں بنیں۔ اِن مختلف "ریختاؤں" کے عہد کو "اُردوئے قدیم" کا عہد کہنا چاہیئے۔ جبکہ اُردو زبان کا لسانی سانچہ متعیّن نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد اُردوئے وُسطیٰ کا عہد آتا ہے۔ پھر اس دَور کی تکمیل کے بعد معیاری اُردو کی منزل آتی ہے۔ اور اُردوئے مُعلّیٰ کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ جو آج تک منتہی ہے۔

ابتدائی اُردو، یا اُردوئے قدیم کا تصوّر میرے ذہن میں یوں ہے کہ کم و بیش مُلک کے ہر خطّے میں وہاں کی مقامی بھاشا کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ ملتے رہے۔ اور اس آمیزش سے ریختہ کی ابتدائی قماشیں پیدا ہوئیں۔ "دورِ آمیزش" بھی ایک وسیع دور تھا۔ قطعیّت کے ساتھ تو کہا نہیں جا سکتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس عمل میں بھی چند صدیاں لگیں۔ اس کے بعد "دورِ ترکیب" شروع ہوا۔ یعنی

---

[1] (الف) 'بولیوں کا سنگم'۔ ص۴۸-۱۹ تحقیق و تنقید از اختر اورینوی۔

(ب) 'سورداس اور تلسی داس پر اُردو کا حق'، ص۱۹۸-۱۸۷ تحقیق و تنقید۔ ایضاً

(ج) 'اردو زبان کا ارتقا' سالنامہ ادب لطیف، لاہور سنہ ۱۹۵۳ء ص۹۱-۷۷ ایضاً۔

ریختائیں اب آمیزہ نہیں مرکّب تھیں۔ اس عہد میں بھاشاؤں اور عربی و فارسی کے امتزاج میں اب گول مرچ نمک کے میل کی صورت نہیں تھی بلکہ شیر و شکر کے بالکل گھل مل جانے کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ مُلکی اور غیر ملکی الفاظ ازدواج کی کامیاب منزل طے کر کے ایک خاندان کے اراکین بن گئے تھے اور اب ایک متحدہ کنبہ کی تخلیق ہونے لگی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ سندھی، ملتانی، پنجابی، ہندوستانی (کھڑی بولی)، برج، راجستھانی، گجراتی، مراٹھی، ہریانی، بندیلی، اودھی، بھوجپوری، مگہی، میتھیلی، بنگالی ریختائیں وجود میں آچکی تھیں۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ نئے ہند آریائی لسانی دَور میں بھی ریختہ کی لسانی لہر مغرب سے مشرق کی طرف بڑھی ہے۔ سندھ، پنجاب اور گجرات میں ریختہ کا سیّال مرکّب پہلے تیّار ہونا شروع ہوگیا۔ اودھ، بہار، اور بنگال میں کچھ عرصہ کے بعد۔ ہاں مختلف وجوں سے بعض علاقوں میں یہ عملِ امتزاج ادھورا رہ گیا اور بعض میں "ریختہ" کی حالت تو پیدا ہوگئی مگر معیاری اُردو کا رَواج دیر میں ہوا یا خال خال ہوا۔ ریختاؤں کا مرکّب بننے کا عمل اُردوئے قدیم کے مختلف طبقوں میں ہوا اور ایک حد تک اس کے اثرات "اُردوئے وسطیٰ" اور معیاری اُردو تک قائم رہے۔ اسی دَور میں لسانی عمل و رَدِّ عمل کا ایک اور پہلو شروع ہوگیا تھا۔ یعنی علاقائی ریختاؤں کو کھڑی بولی کی ریختہ متاثر کر رہی تھی۔ اس سطح پر بھی سارے ملک میں کم و بیش لسانی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ شہروں اور قصبات میں پہلے اور

دیہاتوں میں بہت آہستہ آہستہ ۔ اُردوئے وسطیٰ کے دَور میں یہ رَو اور تیز ہوگئی اور کھڑی بولی ہندُستانی ریختہ کا معیاری زبان اور اَدبی حیثیت سے غلبہ ہونے لگا۔

میں اُردوئے وُسطیٰ کا دَور اُسے کہتا ہوں۔ جب ہر لسانی علاقہ[1] میں علاقائی ریختہ کے ساتھ کھڑی بولی ریختہ مل رہی تھی۔ اور ایک ملے جُلے سانچوں کی زبان استعمال ہونے لگی تھی، خصوصًا ادب کی تخلیق اور تہذیبی بول چال میں۔ یہ دور بھی نا بہ دیر سیال حالت میں رہا۔

---

[1] دکن میں ایک حد تک حضرت خواجہ بندہ نوازؔ کے زمانہ میں اُردو کا وسطیٰ دَور شروع ہوگیا تھا۔ خود حضرت کے رسالے "معراج العاشقین" کی زبان ملی جلی ہے۔ اُردو شہہ پارے، جلد اول ص ۲۰-۱۹- میں ڈاکٹر محی الدین زورؔ لکھتے ہیں:

"لسانیاتی تحقیق کے لحاظ سے یہ (معراج العاشقین) ایک اہم چیز ہے...... اس کی زبان کئی لحاظ سے قدیم دکنی سے مختلف ہے۔ اس کی صورت کھڑی بولی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کے برخلاف دکھنی نثر کی صورت کم و بیش پنجابی سے مشابہہ ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز نے کوئی سا ٹھ برس دہلی میں بسر فرمائے (اور ۸۰۱ھ تک) لازمی طور پر آپ کی تحریر اُس زبان میں ہونی چاہیئے، جو وہاں بولی جاتی تھی .... حضرت خواجہ بندہ نواز کی زبان کھڑی سے متاثر اُردو ہے۔ اور اس کے برخلاف دکھنی قدیم اُردو کی قدرتی طور پر ترقی یافتہ صورت، جس میں بہت سی اصلی صفات و خصوصیات موجود ہیں"

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز نے گلبرگہ (دکن) میں توطن اختیار کرلیا تھا (بقیہ ص ۵۱ پر)

رَفتہ رَفتہ ہر لسانی علاقہ میں کھڑی بولی ریختہ ادبی اور متمدن سماجی فضا پر چھا گئی اور علاقائی ریختہ محض عوامی زبان کی حیثیت سے مروّج رہی۔ علاقائی اور مقامی ریختائیں ادب العالیہ کی محفل سے اُٹھ گئیں، تہذیبی مجلسوں سے بھی چلی گئیں۔ اور صرف لوک ساہتیہ اور دہقانی عوامی بولیوں میں اپنی پھبن دکھانے پر اکتفا کرنے لگیں۔ میں اس دَور کو معیاری اُردو کا عہد کہتا ہوں۔ یہ فارم بڑی پیچیدہ منزلوں سے گذر کر مستحکم ہوا ہے۔ اُردو زبان کے ابتدائی سانچے تو کئی ہیں۔ لیکن اس کا معیاری سانچہ کھڑی بولی یعنی بقول گریرسن "ورنکلر ہندستانی" کی بنیادوں پر قائم ہے۔

زبان کا معیاری سانچہ کیوں پیدا ہوا؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے لیکن اس کا جواب ہندستان کی لسانی تاریخ سے مل جاتا ہے۔ جب بھی ہندستان میں کوئی ہندگیر تہذیب قائم ہوئی اور جب بھی ملک کے نظام میں کسی نوع کی مرکزّیت پیدا ہوئی تو علاقائی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان مختلف اسباب وعلل سے آگے بڑھی اور ملک کے بڑے حصّہ میں تہذیبی اور معیاری طور پر پھیل گئی۔ ایک زمانہ میں سنسکرت نے یہ فرض انجام دیا۔ پھر شورسینی اور پالی پراکرت نے، پھر مغربی اَپ بھرنشوں نے۔ نئے ہندآریائی عہد میں داخل ہونے کے بعد علاقائی بھاشاؤں

(بقیہ حاشیہ ص۵۰) "نثر اُردو کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے" (سکسینہ)۔ یہ نمونے چھوٹے چھوٹے مذہبی صوفیانہ رسالوں کی صورت میں ہیں۔ مثلاً شیخ عین الدین گنج العلم (متوفی ۷۹۵ھ) کے رسالے اور معراج العاشقین مصنفہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز گلبرگوی (متوفی ۸۲۵ھ)۔

یں ہندُستان کی صدارتِ لسانی کے لئے خاموشی سے مقابلہ شروع ہوگیا۔ لیکن یہ مقابلہ بیشتر مغربی بھاشاؤں کے درمیان ہی ہوا۔ اس عبوری دور میں زبانوں کے ہیولے دُخانی حالت میں تھے۔ پھر وہ مِلی جلی سیّال حالت میں آئے اور رَفتہ رَفتہ سانچوں کا انجماد شروع ہوا۔ کبیرداس کی زبان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت معیاری ہندُستانی زبان کی تخلیق کا خمیر اُٹھنے لگا تھا۔ مگر کبیرؔ کی مقبول زبان ابھی سیّال اور رنگ میل تھی۔ اس زبان پر اودھی، کھڑی ہندُستانی اور برج بھاشاؤں کا اثر تھا۔ کبیرؔ کی زبان کے بعد برج بھاشا کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گئی۔ اور آگرہ[۱] کی مرکزیّت کا سہارا پاکر سارے ہندُستان میں تہذیبی، ادبی، اور معیاری طور پر پھیلی۔ سورداس اور عبدالرحیم خانخانان جیسے عظیم فن کار اسے مِل گئے اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ہندُستان کی نئی متحدہ عظیم تہذیب کی معیاری زبان کا فیصلہ برج بھاشا کی ریختہ کے حق میں ہوگیا۔ لیکن ابھی تاریخ کو حرفِ آخر لکھنا باقی تھا۔ آگرہ کی مرکزی زبان کے ساتھ "زبانِ دھلوی" بھی دکن میں ترقی کررہی تھی اور آخرش دھلی کو آگرہ پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ آگرہ، اکبر اور جہاں گیر کی راجدھانی تھا اور شاہجہاں نے دِلّی کو نئے سرے سے دارالسلطنت بنایا، اور اس واقعہ نے ہندُستان کی لسانی تاریخ کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ اس سبب کے علاوہ اور بھی اسباب تھے جن کے نتیجہ میں "زبانِ دھلوی" معیاری ہندُستانی زبان بنی۔

---

[۱] تاریخ زبان اُردو، ص ۱۸۴ و ۱۷۹ ڈاکٹر مسعود حسین۔

"زبان دہلوی" کیا تھی ؟ زبان دہلوی کی دو حیثیتیں تھیں ۔ ایک مقامی، اور دوسری ہندستان گیر۔ جیسا پہلے ذکر آچکا ہے اس عبوری عہد کی کھڑی بولی ہندستانی روحِ عصر کی ترجمان بن کر نکھرنے لگی تھی ۔ اور وہ بھی پنجابی، برج اور اودھی کے ساتھ ریختہ کا روپ اختیار کر رہی تھی ۔ یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "زبان دہلوی" کوئی منجمد اور ساکن چیز نہیں تھی بلکہ سیّال اور متحرک ۔ صدیوں میں اس کا معیاری سانچہ متعیّن ہوا ہے ۔

امیر خسرو[1] (متوفی ۷۲۵ھ / ۱۳۲۴ء)، شیخ باجن (متوفی ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء) اور ابوالفضل[2] نے "زبان دہلوی" کی منفرد حیثیت تسلیم کی ہے ۔

دھلی کا شہر کھڑی بولی، ہریانی (بانگڑو)، برج اور میواتی (راجستھانی) بولیوں کے علاقوں کے مقام اتّصال پر واقع ہے ۔ راجپوتی عہد میں دلّی کی زبان پر میواتی راجستھانی اثر زیادہ تھا۔ ترکوں کے زمانہ سے لے کر شاہجہاں کے ابتدائی دور تک دہلی کی زبان پر لاہوری پنجابی اور ہریانی کا اثر زیادہ رہا۔ لیکن ساتھ ساتھ برج اور کھڑی بولی کے اثرات بھی ملے جلے ہوئے تھے۔ تاآنکہ رفتہ رفتہ کھڑی بولی ہندستانی ریختہ کا رواج سب پر چھا گیا۔ ترک فاتحین کے ساتھ جو زبان دکن گئی تھی وہ پنجابی اور ہریانی سے زیادہ متاثر تھی ۔ لیکن اُس کی بنیادیں بھی کھڑی بولی سے فیضیاب تھیں ۔ یعنی اُس عہد کی "زبان دہلوی"

---

[1] تاریخ زبان اُردو۔ مسعود حسین ص ۱۳۷ بحوالہ تاریخ ہند۔ ایلیٹ اور ڈوسن ص ۵۶۲ جلد سوم

[2] ایضاً بحوالہ نقوش سلیمانی ۔

ہی دکن گئی تھی نہ کہ پنجابی ۔ ہاں "زبان دہلوی" اُس وقت تک سیّال حالت میں تھی اور اُس دور میں دہلی کی ہندوستانی زبان پر پنجابی اثر نمایاں تھا۔ "زبان دہلوی" کا آخری مہذّب سانچہ کھڑی بولی ہندوستانی کا فارم تھا، جو کچھ ترمیم و اصلاح کے بعد اُردو کا معیاری سانچہ بنا، اور مرکز کے علاوہ سارے ملک میں اس کے سکّے چلنے لگے اور علاقے کے علاقے اس کی قلم رو میں داخل ہونے گئے۔

اس امر سے تو کسی کو انکار نہیں کہ اُردو اور ہندی کا معیاری بنیادی سانچہ کھڑی بولی ہندوستانی کی ہی اصلاح یافتہ شکل ہے۔ جولز بلاک، گریرسن، گارساں دتاسی، بیمز، سونیتی کمار چیٹرجی، محی الدین زور، محمود شیرانی، احتشام حسین، مسعود حسین اور شوکت سبزواری یہ سب مذکورہ بالا صداقت کو مانتے ہیں۔ لیکن قدیم اُردو کے اولین فارموں کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے میں اس پر بعد میں مختصر محاکمہ کروں گا۔ پہلے کھڑی بولی کے متعلق تھوڑی وضاحت لازمی ہے۔

شورسینی پراکرت سے شورسینی اَپ بھرنش نکلی۔ اس شورسینی اَپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب مستقل لسانی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ مگر یہ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ مختلف بولیوں میں بنٹ جاتی ہے۔ شورسینی اَپ بھرنش، مغربی ہندی (گریرسن)، اور مدھ دیشیا (چیٹرجی) گویا ہم معنی ہیں۔ چیٹرجی نے مدھ دیشیا بھاشا کی مندرجہ ذیل تقسیم کی ہے۔

شورسینی

قنوجی	بندیلی	برج بھاشا	ہندُستانی کھڑی بولی	بانگڑو یا ہریانی
بالائی دوآبہ برج سے پورب	بندیل کھنڈ اور وسطی ہند کا کچھ حصّہ	بریلی آگرہ متھرا علی گڑھ	انبالہ ضلع سے رام پور تک برج کے علاقہ سے شمال	جنوب مشرقی پنجاب

{ رامپور، بجنور، مرادآباد، مغربی رہلکھنڈ، میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور، دہرہ دون اور مشرقی انبالہ }

گریرسن نے اس کھڑی بولی کو "ورنکلر ہندُستانی" کا نام دیا ہے۔ چیٹرجی کے نزدیک شورسینی کی شاخ کھڑی بولی (ہندُستانی) اُردو اور ہندی کا معیاری سانچہ ہے۔ (انڈو ایرین اور ہندی ص ۱۹۰)

اب میں اُردو کے قدیم ترین فارم کے بارے میں اپنا محاکمہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اُردو کے قدیم بنیادی فارموں کے سلسلہ میں ڈاکٹر محی الدین زور کی ہندُستانی لسانیات، پرافسر محمود شیرانی کی پنجاب میں اُردو، ڈاکٹر مسعود حسین کی تاریخ زبان اُردو، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی اُردو زبان کا ارتقا، بڑی اہمیت رکھنے والی کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ علّامہ سلیمان ندوی کا مجموعۂ مضامین "نقوش سلیمانی" اور پرافسر احتشام حسین کا ترجمہ "ہندُستانی لِسانیات کا خاکہ" (بیمز) مسئلہ زیربحث پر روشنی ڈالنے والی کتابیں ہیں۔ زبان انگریزی

ہیں متعلقہ لسانی مسائل پر معیاری کتابیں گریرسن کی لنگوئسٹک سروے آف انڈیا" اور سونیتی کمار چیٹرجی کی "انڈو ایرین اینڈ ہندی" ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے پچھلے دنوں زبان اُردو کے مسئلہ پر ایک مقالہ بعنوان "اُردو اور پنجابی" لکھا ہے (رسالہ نقوش، لاہور، جولائی ۱۹۵۲ء)۔ میرے خیال میں چند لسانی نظریے اہم ہیں۔ ڈاکٹر زور اور پروفیسر شیرانی پنجابی کو اُردو کا بنیادی فارم بتاتے ہیں۔ دوسرا نظریہ ڈاکٹر مسعود حسین کا ہے جو ہریانی (بانگرو یا جاٹو) کو اُردو کا بنیادی فارم قرار دیتے ہیں۔ تیسرا نظریہ برج بھاشا کو اُردو کا بنیادی سانچہ بتاتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' کے مقدمہ میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ چوتھا نظریہ کھڑی بولی ہندستانی میں اُردو کا بنیادی سانچہ پاتا ہے اور معیاری سانچے میں بھی اسی کی ساخت کو کار فرما بتاتا ہے۔ گریرسن، بیمز اور چیٹرجی اسی امر کے قایل ہیں۔ علامہ سلیمان ندوی، سندھی بھاشا میں اُردو کا قدیم ترین فارم ڈھونڈتے اور پاتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری شورسینی کی بجائے پالی کو اُردو زبان کی اصل قرار دیتے ہیں۔

میں اُردو کے قدیم فارم کے بارے میں اپنا خیال پہلے پیش کر چکا ہوں اور اسی سلسلہ میں لسانی نظریوں کا محاکمہ در پیش ہے۔ میری نظر میں اُردو کے قدیم فارم بہت سے ہیں۔ ہر بھاشا سے ریختہ بنی تھی۔ یہ تو تدریجی انکشافات پر منحصر ہے کہ اُردوئے قدیم کے فارم کہاں کہاں ملتے جاتے ہیں۔

ہاں ارتقائے زبان کے وسطی مرحلوں میں دِلّی کے اِردگرد کی بولیوں، ہندُستانی کھڑی بولی، برج بھاشا اور ہریانی کو بڑی اہمیّت حاصل ہے۔ نیز مختلف لب ولہجے اور سانچے کی پنجابی بولی کی بھی اہمیّت ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھنے کے قابل ہے کہ پنجابی کے سوا تینوں مذکورہ بولیاں شورسینی اَپ بھرنش کی شاخیں تھیں اور خود پنجابی (مشرقی اور وسطیٰ) پر شورسینی کا اثر مختلف دَوروں میں پڑتا رہا تھا۔ عہدِ وسطیٰ کے بعد رفتہ رفتہ ریختہ کا معیاری سانچہ کھڑی بولی کے فارم کے مطابق ڈھلتا گیا اور کچھ پنجابی اور برج کے سانچوں کے درمیان مفاہمت قبول کرتا گیا۔ اُردو زبان کا معیاری سانچہ سو فی صد کھڑی بولی (ورنکلر ہندُستانی) کے مطابق نہیں۔ ہاں اُردو کے معیاری سانچے کی ساخت بہت زیادہ کھڑی بولی سے مطابقت رکھتی ہے۔ کچھ اثرات پنجابی اور برج کے ہیں۔ کچھ متمدّن مراکزِ اُردو کی تراش وخراش، ترمیم واضافہ، کھراد اور پالش ہے۔

برج بھاشا کی بنیادی اہمیّت کا نظریہ اب پیش منظر میں نہیں رہا۔ زورؔ و شیرانی کا نظریہ اور مسعود حسین کا نظریہ زیادہ توجہ کے قابل ہے۔

زورؔ صاحب کا جدید ترین خیال حسب ذیل ہے:

"زبان اُردو کا پنجابی سے جتنا قدیم اور جتنا گہرا تعلق ہے۔ اتنا کسی اور زبان سے نہیں ... ... بعض لوگ غلط فہمی یا مقامی تعصب کی وجہ سے اُردو کو ہندی یا سِندھی یا بُرج بھاشا

یا کھڑی بولی کی بیٹی سمجھ لیتے ہیں "

(نقوش، لاہور ۔ جولائی ۵۲ء)

ڈاکٹر زورؔ نے پرافسر محمود شیرانیؔ کی کتاب " پنجاب میں اُردو " اور اپنی تحقیقات کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُردو سرزمین پنجاب میں پیدا ہوئی اور اس نے وہیں لسانیاتی نشو و نما حاصل کیا ۔ یہاں تک کہ وہ اسے مستحکم اور مسلم الثبوت نظریہ بتاتے ہیں ۔ میرا مطالعہ یہ ہے کہ پرافسر شیرانیؔ نے کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ اُردو کا معیاری سانچہ پنجابی بھاشا کے سانچہ سے لیا گیا ہے ۔ لیکن اُردوئے قدیم کے سلسلہ میں وہ پنجابی بھاشا کو بنیادی ضرور قرار دیتے ہیں ۔ شیرانی کے نزدیک نہ صرف مشرقی پنجاب کے اثرات اُردوئے قدیم پر ہیں بلکہ مُلتانی (مغربی پنجابی) کے بھی ۔ لیکن وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وسطیٰ اور معیاری اُردو میں پنجابی اثر کم ہوتا گیا ۔ لکھتے ہیں :

" ظاہر ہے کہ اُردو اور پنجابی زبانوں کا وہ عنصر جو قدیم سے ان میں مشترک تھا، رفتہ رفتہ اُردو زبان سے خارج ہوتا رہا ہے "

(پنجاب میں اُردو)

نیز یہ کہ :

" دھلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے

اور رفتہ رفتہ اُردو کی شکل میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے ۔"

قدیم اُردو میں پنجابی اثرات سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ سندھ کے بعد پنجاب ہی وہ علاقہ ہے جہاں مقامی بھاشاؤں میں 'ریختہ پن' پیدا ہوا ہوگا ۔ بلکہ قاسمیوں سے زیادہ غزنویوں کے عہد میں ملی جُلی زبان کی ترکیب، تشکیل اور ترویج ہوئی ہوگی ۔ پھر سندھ، گجرات یا مالابار کے اثرات وہیں تک رہے ۔ وہ براہ راست اتنی وسعت اور شدت کے ساتھ دِلّی، دکن اور ہند کے دوسرے علاقوں میں نہیں پہنچے جتنے پنجاب کے اثرات پہنچے ۔ غوریوں، تغلقوں اور خلجیوں کے دَور میں پنجابی ریختہ کا دباؤ دِلّی، دکن اور بہار نے محسوس کرنا شروع کیا ۔ مگر یہ یاد رہے کہ پنجابی ریختہ منجملہ اور ریختاؤں کے ایک ریختہ ہے ۔ پنجابی بھاشا سے کم سہی لیکن دوسری بھاشاؤں میں بھی ریختہ پن پیدا ہونا شروع ہو چکا تھا ۔ مسلمانوں کا تہذیبی اثر اُن کے سیاسی اثر سے زیادہ وسیع تھا ۔ پرتھی راج راسو میں عربی و فارسی الفاظ ملتے ہیں ۔ غرض یہ کہ ہر بھاشا کی ایک ریختہ بنی اور ہر ریختہ کا اپنا علیحدہ وجود ہے ۔ پھر یہ ریختائیں خلط ملط ہوئیں اور اس اختلاط و امتزاج کے لئے دِلّی کا شہر سب سے بڑا معمل تھا ۔ پرافسر محمود شیرانی کو خود ان باتوں کا احساس ہے ۔ مگر ارتقائے اُردو کا صاف نقشہ اُن کے تصوّر میں نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

"ساتویں صدی ہجری میں اس میں وہ خصوصیات نظر آتی ہیں

جو ایک طرف اس کو پنجابی سے اور دوسری طرف برج سے
ممیز کرتی ہیں ۔" (پنجاب میں اُردو)

"پنجاب میں اُردو" کے اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیرانی بھی آخر یہ ماننے پر مجبور ہوئے ہیں کہ پنجابی ریختہ اور "اُردو کی شکل" میں فرق نمایاں ہے۔ نیز یہ کہ زبان اُردو کا آخری معیاری سانچہ کئی منزلوں اور مرحلوں کے بعد جا کر معیّن و مشخص ہوا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین زورؔ کے ہاں تھوڑا تضاد اور ابہام ہے۔ نقوش، لاہور والے مقالہ "اُردو اور پنجابی" میں وہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں :

"اُردو، ہندی اور پنجابی تینوں زبانوں کے ارباب کو معلوم ہوگا کہ یہ تینوں زبانیں باہم دگر کتنی پیوست ہیں۔ اور یہ کہ سرزمینِ پنجاب نے ہندی اور اُردو کی شکل میں ہندستان اور پاکستان کو کیسی عظیم الشان نعمتیں عطا کی ہیں ۔"

زورؔ، صاحب "ہندستانی لسانیات" میں فرماتے ہیں :

"اُردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پائے تخت نہ بنا لیا۔ اُردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اُس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا

شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے۔ اور دوسری طرف الہ آباد ......"

(ہندوستانی لسانیات ص ۸۹ - ۸۸)

اس بیان میں کتنا ابہام ہے۔ اودیچیہ، مدھ دیشیا اور پراچیہ بھاشاؤں میں ہمیشہ فرق رہا ہے۔ یہ فرق نئے ہند آریائی دَور میں مٹا نہیں۔ صوبہ سرحد اور مشرقی اُترپردیش میں بڑا فرق ہے۔ مگر آگے چل کر زورؔ صاحب اکثر محققین کے خیال سے متفق ہوجاتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

"شمالی ہندوستانی پر کھڑی کا ایسا گہرا اثر مرتسم ہوا کہ اس کی بہت سی ابتدائی یا اصلی خصوصیتیں مفقود ہوگئیں اور جو کچھ باقی رہیں، وہ مسخ شدہ حالت میں ہیں" (ہندوستانی لسانیات)

زورؔ صاحب پنجابی اور کھڑی کے ابتدائی فرق کے بارے میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "ابتدا میں وہ صرف ایک تدریجی تغیر ہوگا" (لسانیات ص۸۹) پھر لکھتے ہیں کہ :

"اُردو، نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ اُس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے۔ لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دلّی اور آگرہ رہے ہیں۔ اس لئے اُردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی" (لسانیات ص۹۰-۸۹)

نیز لکھا ہے کہ :

"اُردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے" (ص۹۰)

مذکورہ بالا اقتباسات پر غور کرنے سے زورؔ صاحب کے بیانات میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت حال تک پہنچ جانے کے باوجود وہ اُردو کو پنجابی مصدر سے نکلتا ہوا بتاتے اور دوسرے قدیمی منبعوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اب میں مسعود حسین کے نظریہ سے بحث کرنی چاہتا ہوں۔ میں مسعود حسین کے نظریہ کو زورؔ اور شیرانیؔ کے نظریہ کا مُصلح قرار دیتا ہوں۔ لیکن اُنہوں نے بھی ترازو کے دوسرے پلڑے پر زیادہ زور ڈال دیا ہے۔ "مقدمۂ تاریخ زبانِ اُردو" میں مسعود حسین لکھتے ہیں :

"مسلمان پنجاب سے فارسی آمیز یا جدید پنجابی بولتے دہلی میں داخل ہوتے ہیں۔ دہلی میں اور اس کے پاس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی ہریانی اور دوسری طرف پرانی کھڑی بولی، بولی جاتی تھی۔ چونکہ کسی قدیم زمانہ میں مشرقی پنجابی خود انہیں دونوں بولیوں کے زیر اثر پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی بہ نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انہوں نے اس کی صوتیات اور صرف ونحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا۔ اس لئے ان کی نظر انتخاب (غیر شعوری طور پر) برج کی بجائے انہیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے۔ اور جس کی ابتدائی تشکیل کو انہوں نے اپنے پنجابی لب ولہجہ اور محاورے سے متاثر بھی کیا۔ اُردو کی تہہ میں جو

بنیادی بولی ہے اس کا تعلق تو نواحِ دہلی ہی سے ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس پر اہلِ پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دو تین صدیوں تک اس کا اپنا کینڈا متعیّن نہ ہو سکا۔ اسی خام اور غیر متعیّن زبان کو مسلمان دکن[1] لے گئے تھے۔ جہاں کچھ عرصے بعد اجنبی زبانوں کے ماحول میں اس کا اپنا معیار قائم ہو جاتا ہے۔" (ص ۱۳۹-۳۸)

پھر لکھتے ہیں :

"سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں چونکہ فوج میں پنجابیوں کی کثیر تعداد تھی، اس لئے سرزمین پنجاب کے لسانی اثرات حاوی تھے۔ لیکن بہت جلد بازار کی زبان فوج پر حاوی آگئی۔ جہاں تک بازار کی زبان کا تعلق ہے تحقیق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس پر دہلی کے جمنا پار والے مضافات کا اثر غالب رہا ہے۔"

(مقدمہ تاریخ زبان اُردو ص ۱۴۲، بحوالہ پرافسر جولیس بلاک : بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز جلد ۵ - ۱۹۲۸ء)

نیز یہ کہ :

"موجودہ پنجابی ایک "ملوان[2]" زبان ہے جو دوآبہ کی بولیوں کے زیرِ اثر بہت بعد کو ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اور جس کے مقابلہ میں

---

[1] "جب شمال کے مسلمانوں نے دکن پر حملہ کیا تو وہاں ان کے ساتھ وہی زبان گئی جو ابھی خام تھی۔ اور جس پر نواحِ دہلی کی زبان کا پورا اثر پڑنے نہیں پایا تھا۔ یہ غیر پختہ زبان دکن میں پھیل گئی اور بالکل نئے اصول پر نشو و نما پانے لگی وہ ان اثرات سے محروم رہی جو شمال میں اُردو کی تشکیل کر رہے تھے۔ اور جن کی وجہ سے وہاں اُردو رفتہ رفتہ کھڑی بولی سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔" (ہندوستانی لسانیات ص ۶۲)

[2] گریرسن نے بھی مشرقی پنجابی کو ملوان زبان قرار دیا ہے۔ لسانیاتی تبصرۂ ہند : جلد نہم حصہ اول ص ۱۶۴

متھرا، دہلی اور ہریانہ علاقوں کی بولیاں زیادہ قدیم ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ قدیم اُردو کی جن خصوصیات کو پنجابی سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل اُس قدیم زبان کی خصوصیات ہیں جسے ہم اَپ بھرنش کی جدید شکل کہہ سکتے ہیں اور جو کسی زمانہ میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے تحت شمالی ہند کی مسلّمہ ادبی زبان بن گئی تھی۔" (ص ۱۴۵)

میرے خیال میں اس تحقیقات پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا کہ بازارِ دہلی پر ہریانہ کا اثر زیادہ تھا۔ مسعود حسین پہلے تو فوج پر پنجابیوں کا اثر زیادہ مانتے ہیں اور بعد میں پروفیسر جولیس بلاک کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ سلاطین دہلی کے لشکر میں پنجابیوں سے زیادہ ہریانہ[1] علاقہ کے جنگی اور اکھڑ لوگوں کی تعداد تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے پاس ایسے کون سے "تاریخی دلائل ہیں جن سے تشفی بخش طور پر یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سلاطین دہلی کے عہدوں میں کب کون سے علاقے کے لوگ فوج شاہی میں زیادہ تھے۔ خود ہریانہ کا علاقہ جنوب مشرقی پنجاب میں واقع ہے۔ لسانیاتی اثرات کے اعتبار سے ہریانہ پر مشرقی پنجاب کی دوسری بولیوں کا اثر ضرور پڑتا رہا ہوگا۔ خود مسعود حسین لکھتے ہیں :

" جمنا پار کر کے پنجاب میں داخل ہوئے تو جنوب سے شمال کی طرف جو اضلاع ملتے ہیں، حسب ذیل ہیں۔ دہلی، کرنال، انبالہ ..... دہلی

---

[1] بلٹن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز (لندن): ۱۹۲۸ - ص ۲۹

(قطع نظر شہر دہلی) اور کرنال کے اضلاع کی زبان ہندوستانی نہیں ہے۔
یہاں مغربی ہندی کی ایک دوسری بولی جس کا نام بانگڑو یا جاٹو ہے
بولی جاتی ہے۔ اس پر راجستھانی اور پنجابی کی گہری چھاپ نظر
آتی ہے۔ ضلع انبالہ تک پہنچتے پہنچتے راجستھانی کے اثرات زائل ہو
جاتے ہیں۔" (ص ۹۳)

مسعود حسین مشرقی انبالہ اور پٹیالہ کی بعض تحصیلوں کی زبان کو ہندوستانی بتاتے ہیں۔ جو پنجابی سے بہت زیادہ متاثر ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود وہ اس خیال کی تکرار کرتے ہیں کہ "قدیم اُردو جمنا پار کی ہریانہ بولی سے قریب تر تھی۔" مشرقی پنجابی اور ہریانی میں بہت سی متحد باتیں تھیں۔ اُردوئے قدیم کی بعض شکلوں پر پنجاب کا براہ راست اثر ہے یا ہریانہ کے واسطہ سے یہ کہنا مشکل ہے۔ بہرحال اُردو کے معیاری فارم پر کھڑی بولی کے ٹھپّہ کو مسعود حسین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دراصل اٹل اور ناقابلِ ترمیم بات اس سلسلہ میں اس لئے نہیں کہی جاسکتی کہ عصر قدیم میں بولیاں آپس میں خلط ملط تھیں اور "دہلی کے نواح کی بولیوں (ہریانی اور ہندوستانی) کے قدیم نمونے ناپید ہیں۔" مسعود حسین بھی اور دوسری بھاشاؤں سے بنے ہوئے اُردو کے قدیم نمونوں کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اپنی طرف بہرحال کھینچتی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

"دراصل اُردو زبان کے ارتقا کے سلسلہ میں دارالسلطنت آگرہ
اور برج بھاشا نے جو حصہ لیا ہے اس پر بہت ہی کم زور دیا گیا ہے

اُردو زبان اور اس کے محاورے اور تلفظ کی وہ نئی شکل جس کی تکمیل
بعد کو لکھنؤ جاکر ہوئی ہے۔ اُس کا بیج آگرہ ہی میں اکبر کے عہد میں
ڈال دیا گیا تھا۔" (ص ۱۷۱)

محمد حسین آزاد اور نصیر حسین خیال نے تو برج ہی کو بنیاد اُردو کہا۔ بات
یہ ہے کہ ماہرین افراط و تفریط کے شکار ہو گئے ہیں۔ بعد کے اہل نظر ایک معیاری
حقیقت تک پہنچے بھی ہیں تو اُن میں سے اکثر ارتقائے اُردو کے مختلف مرحلوں،
منزلوں اور مقاموں میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ ریجھ گئے ہیں۔

قدیم اُردو کے ارتقا کی مرکب درمرکب قماش کو سمجھنے کے لئے "دکنی" کا
مطالعہ بھی ضروری ہے۔ دکنی زبان کے متعلق اس امر میں کسی کو اختلاف نہیں
کہ وہ شمال ہندوستان سے ہی اُس دیار میں گئی تھی۔ مگر بعض باتیں تشریح طلب
ہیں۔ اُردوئے قدیم کو اہل دکن "زبان دہلوی" بھی کہتے ہیں۔ "ریختہ" بھی "دکنی"
بھی، اور "زبان ہندوستان" بھی۔ ملاحظہ ہو:

"آغاز داستان، زبان ہندوستان۔ نقل۔ ایک شہر تھا۔ اس کا
ناؤں سیستان۔ اس سیستان کے بادشاہ کا ناؤں عقل۔ دین و دنیا
کا تمام کام اس سے چلتا۔ اس کے حکم باج ذرّا کیں نہیں ہلتا ....."

(سب رس: وجہی)
ص ۱۶

شیرانی کہتے ہیں کہ:

"ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ جب اہالی دکن نے اُردو کا نام دکنی

رکھا ، اہالی گجرات نے اس کا نام "گجراتی" یا "گوجری" رکھ دیا۔"
میرے خیال میں اس امر کی بُنیادی وجہ موجود تھی۔ یعنی یہ کہ ہندوستانی ریختہ
کا اثر دکنی یا گجراتی ریختہ کی زمین پر ہی پڑا تھا اور عہد وسطیٰ تک مقامی اثرات
صاف نظر آتے تھے۔ کہیں تیسری منزل پر پہنچ کر کھڑی بولی ہندوستانی کا غلبہ
ہوا ہے۔ یہ تیسری منزل ہر علاقے میں الگ الگ وقتوں میں آئی ہے۔

سب رس کے مقدمہ میں مولانا عبدالحق یوں رقم طراز ہیں :

"اگرچہ وجہی گولکنڈہ کا ہے۔ اور گولکنڈا اور حیدرآباد تلنگانے
میں ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وہ مرہٹی مثل تو ایک جگہ لکھتا
ہے۔ اور ایک آدھ گجراتی لفظ اور شعر بھی استعمال کرتا ہے۔ مگر
کہیں تلنگی مثل یا فقرہ یا لفظ (سوائے درا یا درائی کے جس
کے متعلق ابھی مجھے شبہ ہے) اس کتاب میں نہیں آیا۔ اہل ہند
سے مُراد مصنّف کی ہمیشہ شمال ہند والے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا
ہے : 'بقول اہل ہند، پیاسا کیا منگتا پانی'۔ اسی طرح جب اہل دکن
کی مثل یا قول کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے تو لکھتا ہے : 'جو ن
دکھن میں چلیا ہے' (ص ۱۳۶) یعنی جیسا دکن میں مشہور ہے یا 'مثلاً
ہے دکن میں' (ص ۱۵۶) یا دکنی دُھرا (ص ۲۲۶) اس سے صاف معلوم
ہوتا ہے کہ مصنّف شمالی ہند اور دکن کی زبان میں فرق کرتا ہے"

(مقدمہ سب رس ص ۴۵)

اس فرق کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دکن کی زبان پر مرہٹی[1] اور گجراتی بھاشاؤں کا اثر تھا اور دوسرے یہ کہ غالباً اس وقت تک شمال ہندوستان کی اُردو پر سے پنجابی اثر کم ہو گیا تھا۔ اور دکن میں ابھی تک پنجابی اثر کافی موجود تھا۔ تیسرے یہ کہ ہر علاقہ میں مقامی کہاوتیں مروّج ہوتی ہیں۔ عبدالحق صاحب کو تلنگی اثر نہ ہونے پر تعجب ہے۔ لیکن یہ بات کوئی ایسے تعجب کی بھی نہیں۔ دکن میں مرہٹواری علاقہ ہی شمال کا اثر زیادہ قبول کر سکتا تھا۔ خصوصاً شورسینی زبان کی شاخوں کا اثر، کیونکہ مرہٹی تو کسی قدیم شورسینی[2] کی شاخ تھی اور تلنگی ڈرواری زبان ہونے کی وجہ سے شمال ہند کی زبان سے میل نہیں کھا سکتی تھی۔ یوں تلنگی کا ہلکا پھلکا اثر ہو سکتا تھا۔ میرے خیال میں دراصل مرہٹی بھاشا سے بنی ہوئی ریختہ جس پر پنجابی اور کھڑی بولی ہندوستانی ریختاؤں کے اثرات پڑے "دکنی" کہلائی اور گجراتی بھاشا سے پیدا شدہ ریختہ جس پر کچھ پنجابی، ہریانی کھڑی بولی ہندوستانی اور راجستھانی اثرات پڑے "گجراتی" یا "گوجری" کہلائی۔ یہ سب قدیم اُردو کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شمال ہندوستان خصوصاً دہلی سے جو زبان دکن گئی وہ کئی رشتہ دار بولیوں کا آمیزہ تھی۔ صرف پنجابی آمیز

---

[1] (i) دکنی پر مرہٹی و گجراتی اثر۔ نوائے وقت، بمبئی۔ (ii) مرہٹی "کے بعض اسما، حروف اور افعال دکنی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً کیتک = کئی ایک؛ بسلا = بیٹھا؛ بسلانا = بیٹھانا؛ نکو = نہیں: یا زور اور تاکید کے لیے 'چ' کا استعمال ......" ("تاریخ زبان اُردو۔ مسعود حسین ص۲۸")

[2] ڈاکٹر من موہن گھوش کے حوالہ سے چٹرجی نے اپنی کتاب "انڈو ایرین اینڈ ہندی" ص ۸۶-۸۵ میں مذکورہ خیال...

دہلوی یا ہندُستانی یا ہریانی نہ تھی۔خود مسعود حسین آخرش یہ لکھتے ہیں :

"ممکن ہے کہ دکن میں بھی شمالی ہند کی ایک بولی نہ گئی۔ بلکہ کئی بولیاں پہونچی ہوں۔جن کی آمیزش سے بعد کو وجہی اور قلی قطب شاہ کی معیاری دکنی متشکل ہوتی ہے" (تاریخ زبان اُردو ص۲۵۶)

وجہی اور قطب شاہ کے بہت پہلے سے دکنی کا ارتقا ہورہا تھا۔اُس قدیم دَور میں مرہٹی کی بنیو پر مرہٹی ریختہ بنی اور بعد ازآں شمال ہند کی بولیوں کی آمیزش سے عہد وسطیٰ کی دکنی بنی جسے پھر معیاری اُردو نے اپنے مقام سے ہٹایا۔مشکل یہ ہے کہ جو لسانی نمونے ملتے ہیں وہ ادبی ہیں۔قدیم ترین دکنی بول چال کی زبان کا سراغ نہیں ملتا۔ لیکن موجودہ مرہٹی بولیوں کے مطالعہ سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے' جن میں ریختہ پن موجود ہے ۔لیکن دکنی دیر تک کھڑی بولی کے اثرات سے نہ بچ سکی ۔ ولی کے عہد تک کھڑی کا غلبہ دکن میں بھی ہوگیا ۔

ڈاکٹر زور نے علامہ سلیمان ندوی کے بعض مقالوں پر تبصرہ کیا ہے ۔جس میں پیدائش وارتقائے اُردو سے بحث ہوئی ہے ۔میں یہاں پر اس تبصرہ پر بھی تنقید کرنی چاہتا ہوں ۔

علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ :

"قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں ' اس کا ہیولیٰ اس وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا " (نقوش سلیمانی ص۳۱)

نیز یہ کہ :

"یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔"
(نقوش سلیمانی ص۲۵)

ان بیانات کے متعلق ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :

"واضح ہو کہ مولانا سلیمان ندوی کے یہ عجیب و غریب و متضاد بیانات 'پنجاب میں اُردو' اور 'ہندوستانی لسانیات' کی اشاعت کے بعد شائع ہو رہے ہیں، جن میں اس مسئلہ کو پوری طرح واضح کر دیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان تحقیقی اور لسانیاتی کتابوں کے مطالعہ کی زحمت ہی گوارا نہ فرمائی۔" (نقوش، لاہور جولائی ۱۹۵۲ء)

میرے خیال میں مولانا سلیمان ندوی کے بیان میں کوئی تضاد نہیں۔ وضاحت وتشریح کی کمی ضرور ہے۔ پنجابی ریختہ کی اہمیت مسلّم، مگر اس میں کیا شک ہے کہ سندھی ریختہ کو پنجابی ریختہ پر تقدّم حاصل ہے، خصوصاً نئے ہند آریائی عہد میں۔ کیونکہ عربی و فارسی بولنے والے پہلے پہل باضابطہ طور پر سندھ میں آئے اور دو سو سال تک جم کر رہے۔ سندھی بھاشا پر عربی و فارسی اثرات پڑے۔ لہٰذا یہ کہنا دور از قیاس نہیں کہ نئے ہند آریائی دور کے لگ بھگ اُردو کا ہیولیٰ سندھ میں بنا۔ عین ممکن ہے کہ یہ "ریختہ" کا اولین ہیولیٰ ہو۔ مولانا سلیمان ندوی نے کافی تاریخی دلایل پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ :

"اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی
وفارسی سب سے پہلے ہندستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی وہ
سندھی اور ملتانی ہے۔ پھر پنجابی اور بعد از ایں دہلوی۔ سندھی پر
اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے ... ...
... ... سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل
ملتی جلتی ہیں ... ... واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اُردو
ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے۔ یعنی جس
کو ہم اُردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی وفارسی
کے میل سے ہوا، اور آگے چل کر دارالسلطنت دہلی کی بولی سے،
جس کو دہلوی کہتے ہیں، مل کر معیاری زبان بن گئی اور پھر دارالسلطنت
کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی"

(نقوش سلیمانی ص۳۴)

یہ واضح ہے کہ مولینا سلیمان ندوی نے اُردو کے "ریختہ پن" والے پہلو پر
زور دیا ہے اور اس کے معیاری سلیچے کے بارے میں یہاں کچھ نہیں لکھا۔ اُنہوں
نے ارتقائے زبان کی منزلیں غلط طور پر نہیں پیش کیں۔ لیکن زبان کی مختلف منزلوں
خصوصاً منزلِ دہلی کی قماش وساخت سے بحث نہیں کی۔ میں نے پچھلے صفحات
میں حتی الوسع اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے مولینا سلیمان ندوی کے
بیانات کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ آخرالذکر نے ارتقائے اُردو کی کئی سچائیاں پیش

کی ہیں۔ مگر مجھے علامہ موصوف سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ اوّل تو میرا یہ خیال ہے کہ عربی و فارسی الفاظ مسلمانوں کے منظرِ عام پر آنے سے بہت پہلے ہی بھاشاؤں سے ملنے لگے تھے بلکہ یہ عمل پراکرتوں کے دَور سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ہندستان کے سرحدی اور ساحلی علاقوں میں عمل امتزاج تیز تر رہا تھا۔ علاّمہ ندوی نے خود عرب و ہند کے تعلقات قبل از اسلام پر ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ یہ عمل دو طرفہ تھا۔ قرآن حکیم میں ہندی الاصل[۱] الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا اختلاف مجھے یہ ہے کہ اسلام کے بعد جب عربی و فارسی بولنے والوں کے اثرات بھاشاؤں پر پڑنے لگے تو وہ کسی ایک علاقہ میں محدود نہیں رہے۔ وقتاً فوقتاً ایک علاقہ مرکز کی حیثیت ضرور اختیار کر گیا۔ لیکن خالص سیاسی وجوہات کی بنا پر نہ صحیح، سماجی و تہذیبی اثرات کے تحت ہی سارے ملک میں کم و بیش مخلوط زبان پیدا ہونے لگی۔ لہٰذا میں اس باب میں قطعی قسم کی اوّلیت کا قایل نہیں۔ بعض خطّوں کی اہمیّت کا اقرار ضرور کرتا ہوں۔ تیسرا اختلاف مجھے یہ ہے کہ معیاری اُردو کا سانچہ اس معنی میں ہرگز دہلوی نہیں کہ وہ اُس علاقہ کا تھا جس میں شہر دھلی آباد ہے۔ دھلی کا شہر، جیسا ذکر ہو چکا ہے، کئی علاقوں کے سنگم پر آباد تھا اور پھر مختلف دَوروں میں اس کا جائے وقوع بدلتا رہا

---

[۱] عرب و ہند کے تعلقات قبل از اسلام، علامہ ندوی ص۱۰۔

بحوالہ حافظ ابن حجر و حافظ سیوطی۔ مثلاً "مسک" ('موشکا' ہندی سے بمعنی 'مشک')۔ "کافور" (کپور ہندی سے بمعنی کافور) اور 'زنجبیل' (زنجابیرا' ہندی سے بمعنی ادرک) +

ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اُردو کے معیاری سانچے کو دہلوی کہنے لگے اور اس شہرِ تمدّن وعلم میں یہی کھڑی بولی کا سانچہ صدر مملکت ہوا۔ ان اہم امور کی وضاحت کرنی تھی، سو علاّمہ موصوف نے نہیں کی ۔ یہ صحیح ہے کہ آخرالامر کھڑی بولی پر ڈھلی ہوئی زبان کو صدارت، قیادت اور عمومیّت نصیب ہوئی

بہرکیف مذکورہ گذارشات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے صحیح فیصلہ نہیں فرمایا۔ اُردوئے قدیم کے سلسلہ میں سندھ کی اہمیّت بھی مُسلّم ہے۔ مگر دوسرے خطّوں کی اہمیّت بھی قابلِ لحاظ ہے۔ "اُردوئے قدیم" ہندُستان گیر طور پر پیدا ہوئی اور "معیاری اُردو" کا بنیادی سانچہ بیشتر ہندُستانی کھڑی بولی ہے ۔ جو مختلف تہذیبی مراکز میں نکھر، سنور، سج کر محبوبِ عالم ہوئی ۔ سونیتی کمار چیٹرجی جیسا مُسلم الثبوت ماہرِ لسانیات بھی کھڑی بولی (ہندُستانی) کو اُردو ہندی کا بنیادی اور معیاری سانچہ قرار دیتا ہے ۔ ملاحظہ ہوں چیٹرجی کی دو معرکہ آرا کتابیں "بنگالی زبان کا آغاز وارتقا" (۱۹۲۶ء) اور "ہند آریائی اور ہندی" (۱۹۴۲-۴۳ء)۔ اپنے مذکورہ مقالہ میں زورؔ صاحب نے چیٹرجی کے جو حوالے دیئے ہیں اُن سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی اور کھڑی بولی ہندُستانی ایک ہی مَنبع ومَصدر سے نکلی ہوئی بھاشائیں ہیں اور ان میں قریبی رشتہ ہے ۔ اور یہ کہ بعد میں اُردوئے قدیم کے مختلف نمونوں پر پنجابی کا اثر پڑتا رہا ہے ۔ اِن سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ "چیٹرجی بھی اُردو کا اصلی وطن پنجاب ہی کو قرار دینے کی طرف مائل ہوتے ہیں" (زورؔ) اس کے برخلاف وہ نہایت واضح طور پر شورسینی

کی ہندُستانی کھڑی بولی شاخ کو اُردو اور ہندی کا بُنیادی سانچہ اور ہیئت قرار دیتے ہیں۔

"پس ہمیں ایک عام پسند و عام فہم زبان مل گئی، جو مغربی ہندی کی 'آ' بولی سے ترقی پا کر تیرھویں صدی میں اور اس کے بعد بنی تھی اس پر ابتدائی پنجابی کا اثر بھی تھا۔ اس کی ایک شکل کا سنجیدہ ادبی استعمال سولھویں صدی میں دکن میں ہوا۔ اور اس نے برج بھاکھا سے مل کر شمالی ہند کے مستقبل کی ادبی زبان کو اس کی مختلف مرکزی ہیئتوں میں سے ایک ہیئت عطا کی" (انڈو ایرن اور ہندی ص ۱۹۰)

اُردو زبان کی اصل کے بارے میں تازہ ترین کتاب ڈاکٹر شوکت سبزواری کی 'اُردو زبان کا ارتقا'[1] ہے۔ سبزواری کی تحقیقات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) "تمام اَپ بھرنشوں کا ماخذ ادبی پراکرتوں کو بنانا قیاس اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے" (ص ۷۳)

(۲) "اُردو جس اَپ بھرنش سے نکلی ہے اس کا ذکر 'ہیم چندر' نے اپنی گرامر میں کیا ہے۔ اس اَپ بھرنش میں اسماء و صفات اُردو کی طرح 'ے' ا پر منتہی ہوتے تھے" (ص ۸۲)

(۳) "'شورسینی برج بھاشا کی ایک قدیم تر صورت ہے' یہ درست ہے لیکن 'برج ہندُستانی کی بہن ہے' یہ غلط ہے، اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ برج اور ا

---

[1] جولائی ۱۹۵۶ء، گہوارۂ ادب، ڈھاکہ، مشرقی پاکستان

ہندوستانی دونوں نے 'شورسینی' سے جنم لیا۔" (ص۸۴)

(۴) اُردو کی صرفی و نحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُردو کا ماخذ 'شورسینی' پراکرت یا اَپ بھرنش نہیں۔" (ص۸۵) "اُردو شورسینی پراکرت، شورسینی اَپ بھرنش اور اس سلسلہ کی موجودہ بولیوں یعنی 'برج'، ہریانی، بندیلی، وغیرہ سے ماخوذ نہیں۔" (ص۸۶)

(۵) "اُردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیئے کہ ادلتے بدلتے، پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ اُن سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اُس کی ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔ 'اُردو' اور 'پالی' دونوں کا منبع ایک ہے۔" (ص۸۷)

(۶) "اُردو، جس بولی سے متفرع ہوئی اس کا قدیم فارسی اور 'پہلوی' سے بہت قریب کا تعلق رہا ہے۔" (۹۰-۸۹)

(۷) "اُردو، کا یہ اختتامیہ (ے ا) 'پراکرت'، اور اَپ بھرنش کے جس رُوپ سے لیا گیا ہے اس کا ایرانی گروہ کی زبانوں سے تعلق ہے۔ اس لئے شیام سندر داس کا یہ قیاس صحیح ہو سکتا ہے کہ (ے ا) پر ختم ہونے والے اسماء جس 'اَپ بھرنش' میں پائے جاتے ہیں اور جس کا ذکر ہیم چندر کے حوالے سے اُوپر کیا گیا وہ 'پے شاچی' سلسلہ کی زبان ہے۔" (ص۹۰)

شوکت سبزواری کے خیالات کے کئی پہلوؤں سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔

مگر وہ 'شورسینی'، پراکرت اور 'اَپ بھرنش'، سے کلّی طور پر رشتہ توڑ لینے پر مُصر ہیں ۔ یہ انتہا پسندی ہے ۔ دوسری بات یہ کہ " پالی " خود ایک معجون مرکّب ہے ۔ اُس سے رشتہ جوڑنا نسلی مسئلہ کو صاف نہیں کرتا ۔ بہرحال سبزواری نے اُردو کی گہری اور قدیم بنیادوں کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ اور ایک لطیف لسانی نکتہ کی وضاحت کے لئے بصیرت افروز دلائل اکٹھے کئے ہیں ۔

سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس قدیم ہند آریائی دَور کی عوامی بولیوں کے نمونے نہیں ۔ ہاں اُس دَور کی ادبی زبان 'ویدی' اور پھر 'سنسکرت' کے نمونے ملتے ہیں ۔ اسی طرح وَسطی ہند آریائی بول چال کے نمونے نایاب ہیں ۔ چٹانوں یا لاٹوں کے کتبے یا سنسکرت ڈراموں کی پراکرتیں ایک حد تک ادبی حیثیت ہی رکھتی ہیں ۔ لہٰذا پالی پراکرت بھی ادبی زبان ہی کہلائے گی ۔ سبزواری کو یہ تسلیم ہے کہ " پالی ادَب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال لین دین اور کاروبار کی " (صـــــ ۸۷) ۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ " بول چال کی زبان کے تغیّرات کا پتہ چلانا آسان نہیں " اگر " تمام اَپ بھرنشوں کا ماخذ ادبی پراکرتوں کو بتانا قیاس اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے " تو پھر پالی پراکرت کو بھی یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی ۔

میرے خیال میں اگر کھڑی بولی ہندوستانی کا منبع پالی کے مصدر سے ملتا ہے، تو کئی جہتوں سے شورسینی کے مخرج سے بھی جا ملتا ہے ۔ سبزواری ہرگز یہ ثابت نہیں کر سکے کہ 'کھڑی بولی' کی گرامر کو پالی گرامر سے نسبتاً زیا

قربت ہے۔ ہاں یہ واضح ہوا ہے کہ بعض باتوں میں کھڑی بولی' شورسینی گرامر سے مختلف ہے اور پالی یا 'سنسکرت' سے ملتی ہے۔ غالباً کھڑی ہندوستانی' شورسینی اور پالی کی جڑ ایک تھی اور یہ تنے اور شاخیں ہیں۔ سونیتی کمار چیٹرجی بھی یہ نہیں مانتے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا براہ راست ہوا ہے۔ شورسینی پراکرت 'مدھ دیش' کی اُس قدیم ہند آریائی بولی سے نکلی تھی۔ جس کی بنیاد پر کلاسکی سنسکرت کی عمارت اس سے پہلے اٹھائی گئی تھی۔ دوسری پراکرتیں مختلف قدیم ہند آریائی بولیوں سے براہ راست نکلیں۔ یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ پراکرتیں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ سنسکرت پراکرتوں کی ماں نہیں' بڑی بہن ہے اور نسبتاً زیادہ مہذّب۔ اسی طرح جدید ہند آریائی بولیوں کو بھی ہم کسی ایک اپ بھرنش یا پراکرت کی بیٹی نہیں کہہ سکتے۔ لسانی شاخیں بہت ہی پیچیدہ طور پر' کچھ قبل' کچھ بعد تنوں سے نکل نکل کر پھیلی بھی ہیں اور ایک دوسرے میں گتھم گتھا بھی ہوئی ہیں۔

شوکت سبزواری اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پالی اور شورسینی بہت قریب کی زبانیں ہیں۔ اوّل تو پالی ملوان ادبی زبان ہے اور اس کا فائق حصّہ شورسینی ہی کی کوئی قدیم[1] شکل تھی۔ 'شورسینی' اور 'اردھ ماگدھی' کے مجموعے کو پالی کہتے ہیں۔ اس پر بودھی سنسکرت کی بھی پُٹ پڑی ہے۔ نیز خود پالی میں ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یعنی پالی میں رد و بدل بھی ہوا ہے۔ غرض یہ کہ پالی کے لسانی فارم کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ جن صرفی و نحوی قاعدوں میں کھڑی

---

[1] ڈبلو گیگر: پالی گرامر اور ڈاکٹر لاؤ کی پالی دو جلدیں

بولی بعد کی شورسینی سے مختلف نظر آتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ قاعدے قدیم شورسینی میں ہوں۔ یہی پالی کا منبع ہے۔ شورسینی پر پشاچی کا اثر بھی تو پڑا ہے۔ مثلاً (ے ا) کی آواز قبول کرنے میں۔ عہدِ آشوک میں اَردھ ماگدھی کے اثرات بھی پڑتے رہے ہیں۔

بہرکیف شوکت سبزواری اُردو کے سانچے کو کھڑی بولی کا سانچہ ہی قرار دیتے ہیں۔ اور یہی ماہرینِ لسانیات کی رائے ہے۔ شوکت صاحب کی تحقیق سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ خود کھڑی بولی کی اصل کے بارے میں لطیف لسانی زاویوں کی طرف توجہ منعطف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ 'کھڑی بولی ہندوستانی' پر 'شورسینی' پراکرت کے علاوہ پشاچی اور اَردھ ماگدھی پراکرت کے قدیم اثرات بھی ہیں۔ اَردھ ماگدھی 'مدھ دیشیا' اور 'ماگدھی پراکرت' کے درمیان مفاہمتی شکل ہے۔ اس طرح بہار کی قدیم بولی کا کسی نہ کسی حد تک کھڑی بولی ہندوستانی یعنی اُردو کی بُنیادوں کے قیام میں بھی دخل ثابت ہوتا ہے۔ سبزواری کی تحقیقات سے اس حقیقت کو تقویت پہنچتی ہے۔ سبزواری کی تحقیق نے اُردو، فارسی ریختہ کا ایک قدیم جواز بھی پیش کر دیا ہے۔

میں اپنے محاکمہ کو مکمّل کرنے کے لئے چند آخری معروضات پیش کرتا ہوں :-

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ماہرین و مبصّرین نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ اور دوسروں کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ارتقائے اُم

کے سلسلہ میں مسئلہ کے دو منفرد پہلوؤں کو خلط ملط کیا گیا ہے۔ قدیم اُردو کے مختلف سانچوں کا ریختہ پن ایک الگ پہلو ہے اور معیاری اُردو کے سانچہ کا تعین ایک دوسری جہت ہے۔ گریرسن، زور، شیروانی، ندوی، چیٹرجی، مسعود حسین اور سبزواری نے اِن دو[۲] پہلوؤں کو شرح و بسط کے ساتھ نہیں پیش کیا۔ نیز اس امر کا لحاظ اچھی طرح نہیں رکھا گیا کہ خالص یک رنگی بھاشا کا وجود بولیوں کے عبوری دَور میں ناممکن تھا۔ اس لئے لسانی سانچوں کے متعلق ذمّہ دار حضرات نے بھی کٹّر پن کے ساتھ باتیں کی ہیں۔ قدیم اَپ بھرنش اور قدیم اُردو کے قدیم ترین نمونے جو اب تک ملے ہیں۔ اُن کی بنیاد پر حرفِ آخر پیش کرنے کی عُجلت غلط ہے۔ تحقیقات کا میدان وسیع ہے۔ نئے انکشافات سے فیصلے بدلتے رہیں۔ اس لئے علوم میں کٹّر پن کی گُنجائش نہیں۔ اُردو کا ارتقا نہایت ہی پیچیدہ، مرکّب، نازک و نیرنگ سامان لسانی تماشیں پیش کرتا ہے۔ مبصّر و محقّق کو ان تہہ دار نازک پردوں کے اٹھانے میں چابکدستی، لطافت و نفاست سے کام لینا چاہیئے۔

مختصراً، مسئلہ کے اہم پہلو یوں ہیں:

اوّل یہ سوال کہ جدید اُردو زبان کی اصل نمائش اور اس کا انفرادی سانچہ نئے ہند آریائی دَور کی کس بھاشا سے زیادہ قریب ہے؟ میری رائے میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی کھڑی بولی معیاری اُردو کا خاص تنا ہے۔ مگر کھڑی بولی کی اصل کا دو ٹوک تعین بہت مشکل اور مشتبہ ہے۔ دوئم یہ کہ قدیم ترین "ریختہ" بھاشا سے بنی؟ اب تک کی تحقیقات کے لحاظ سے اس سوال کا تشفّی بخش جواب

نہیں ملتا اور غالباً جواب ملنا ممکن بھی نہیں۔ ہند کی ہر آریائی اور غیر آریائی بھاشاؤں میں قدیم "ریختہ" کے نمونے ملتے ہیں۔ ہاں اس بارے میں پنجابی ریختہ، سندھی ریختہ، گجراتی ریختہ، ہریانی ریختہ اور دکنی ریختہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر سرحدی ریختہ، کھڑی بولی ہندوستانی ریختہ، برج ریختہ، اودھی ریختہ، مگھی اور بنگالی ریختہ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ نیز یہ کہ معیاری اُردو کے فارم پر کھڑی بولی کے لسانی سانچے کے علاوہ چند اور بولیوں کے سانچوں کا بھی اثر ہے۔ مثلاً پنجابی، برج اور اودھی — بعض اہم ریختاؤں کے وسطی دور میں ہریانی یا پنجابی اثر نمایاں ہے، مگر علاقائی خصوصیات کے ساتھ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قدیم اُردو کے قدیم ترین نمونے جواب تک ملے ہیں۔ اُن کے بیشتر حصہ کو "پنجابی ہریانی ہندوستانی" آمیختہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ہندوستانی (کھڑی) ریختہ سب پر غالب آیا۔

باب اوّل

بہار میں اردو زبان

تمہید

عہد قدیم میں بہار، اوپنیشد کے برہم ودّیا کا گہوارہ تھا۔ جین دھرم اور بودھ مت نے یہیں پرورش پائی۔ اور عہد وسطیٰ میں صوفیائے کرام نے یہاں اسلام کا نور پھیلایا۔

چھٹی صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی بعد مسیح تک ایک ہزار سالہ دور ایسا گذرا ہے کہ سارے ملک ہند کی تاریخ پاٹلی پُتر کے مرکز کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس عظیم شہر کے سیاسی زوال کے بعد بھی اس کا تہذیبی اقتدار مدت دراز تک قائم رہا۔ نہ صرف ملک کے اندر بلکہ ملک سے باہر بھی۔

جنوب مشرقی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ تک بودھ دھرم اور بہاری تہذیب کا اثر تھا۔ نالندہ اور وکرم شیلا کی یونیورسٹیاں ایشیا میں علم و ثقافت کا مینار تھیں۔ علامہ سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" (صہ ۱۲۲-۱۰۲) میں یہ اہم تحقیق پیش کی ہے کہ عباسی عہد کا مشہور برمکی خاندان بودھ تھا اور معبدِ نوبہار دراصل "نو ویہارا" تھا۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ "اسلام سے پہلے خراسان کا مذہب بودھ تھا"۔ بلخ خراسان کا ایک شہر ہے۔ معبدِ نوبہار اسی شہر میں واقع تھا۔ وہ مجوسیوں کا آتشکدہ نہیں بلکہ بودھوں کا "ویہار" تھا۔ برامکہ اسی معبد کے پجاری تھے جو ہارون الرشید کے عہد میں اسلام لاکر وزارت کے عہدہ تک پہنچے۔ بلخ حضرت عثمان کے عہد میں فتح ہوا تھا اور نوبہار کا متولی اسی عہدِ سعادت میں مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ برمک دراصل سنسکرت ہے یعنی "پرمکھ"۔ ڈاکٹر زخاؤ جو سنسکرت کے ماہر ہیں اس کے معنی "بڑے مرتبہ والا" کے کرتے ہیں۔ "پرمکھ" سے "پرمک" اور پھر "برمک" ہوگیا۔

اوپر کی گذارشات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایران و عرب سے بہار کا تہذیبی تعلق بہت پرانا ہے۔ ایسی حالت میں بہار کی بھاشاؤں پر عربی و فارسی زبانوں کا اثر بودھ عہد خصوصاً دورِ موریا سے ضرور پڑنے لگا ہوگا۔ اور یہی ریختہ کی بنیاد ہے۔ جسے ڈاکٹر اس۔ سی۔ سرکار "پروٹو اردو" کہتے ہیں۔ یاد رہے بارھویں صدی عیسوی تک نالندہ اور وکرم شیلا کی یونیورسیٹیز (صہ ۱۰۲)

ایشیا کے طلبا جمع ہوتے تھے۔ ترک و تاتار و کشمیر کے علاقے اُس عہد تک بودھ دھرم کے پیرو تھے۔ یہی زمانۂ تاریخ نئی ہند آریائی زبانوں کی تاسیس کا دور ہے۔ یعنی بہار میں اسلامی اثر پہنچنے کے پہلے ہی یہاں کی پراکرت اور پھر اپ بھرنش پر عربی و فارسی زبان کے اثرات ضرور پڑنے لگے تھے۔ صوبہ بہار کا نام بودھ معبد" ویہارا" سے ہی حاصل ہوا ہے۔ اور اسی صوبہ کے نام کے ماخذ نے مشرق وسطیٰ میں" نو ویہارا" یا " نوبہار" کی بنا ڈالی۔

صوبۂ بہار کا ترہت ڈویزن کم وبیش میتھیلا دیش کی چوحدی کے مطابق ہے۔ میتھیلا کے زوال کے بعد ویشالی کی طاقتور عوامی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ پٹنہ ڈویزن قدیم سلطنت مگدھ سے تطابق رکھتا ہے اور بھاگلپور ڈویزن کو کم وبیش ریاست انگ سے مطابقت حاصل ہے۔ آریائی اقتدار سے پہلے علاقۂ بہار میں کول ڈراوڑی حکومتیں تھیں۔ چھوٹا ناگپور کا علاقہ تو عہدِ وسطیٰ کے استحکام تک آدی باسی، کول ڈراوڑی قبائل کے ہاتھوں میں رہا۔ بہار پر آریائی قبائل کا قبضہ پہلے شمالی حصے میں ہوا ہے۔ لہٰذا آریائی ویدک اور سنسکرت زبانوں کی نشر و اشاعت پہلے شمالی بہار میں ہوئی۔ جنوبی بہار اس کے بعد بھی زمانہ تک غیر آریائی (کول ڈراوڑی) تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا۔ مگر عصرِ اوپانشد کے اختتام کے قریب مگدھ دیش میں برہمنوں کی نوآبادیاں قائم ہونے لگیں۔ مگدھ کی پہلی راجدھانی " راج گریہہ" یعنی راجگیر تھی۔ رامائن میں اس کا تذکرہ آتا ہے۔ واسوچیدیا اوپاریچارا نے اس کی

۱۰۔ بہار جدید و قدیم: ۱۹۵۲ء۔ ڈاکٹر بی۔ بی مجمدار، پی۔ آر۔ ایس۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

بنا ڈالی تھی۔ مہابھارت میں اس کے بیٹے برہدرتھا کا ذکر ہے۔ برہدرتھا کا
کا بیٹا جراسندھا شری کرشن مہاراج اور پانڈوؤں کا ہمعصر تھا۔ یہ بڑا طاقتور راجہ
گذرا ہے۔ بعض علمائے تاریخ کا خیال ہے کہ جراسندھا ڈراوری راجہ تھا۔
اس نے متھرا کے راجہ کنس سے اپنی بیٹی کی شادی کر کے شمالی ہند پر قبضہ کرنا
چاہا۔ بھیم (پانڈو) نے اسے قتل کیا۔

مگدھ دیش کا شاندار دور چھٹی صدی قبل مسیحؑ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ
بمبسارا اور اجات شترو کا عہد زریں تھا۔ شمال ہند میں مگدھ کی طاقت سب
سے بڑی اور سب پر فائق تھی۔ اس کی تہذیبی اور مذہبی اہمیت اس کی سیاسی
حیثیت سے بہت زیادہ تھی۔ مہاویر اور گوتم بدھا نے اپنی زندگیوں کا بڑا
حصہ یہاں بسر کیا۔ مہاویر کا انتقال بہار شریف کے پاس پاواپوری میں ہوا۔
اور گوتم بودھ راجگیر اور بودھ گیا میں تلاشِ حق و جستجوئے معرفت کرتے رہے۔
بودھ گیا میں ہی آپ کو نورِ ہدایت حاصل ہوا۔ بودھ دھرم کی چار بڑی مجالس
مشاورت میں سے دو بہار میں منعقد ہوئیں۔ ایک راجگیر میں اور دوسری
پاٹلی پترا میں۔

پاٹلی پترا (پٹنہ) ہندوستان کا پہلا شہنشاہی دارالسلطنت تھا۔ اجات شترو
نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کیا تھا۔ اودیین نے پاٹلی پترا کا شہر بسایا اور راجگیر سے
راجدھانی وہاں منتقل کر دی۔

پاٹلی پترا نے نند راجوں کے زمانہ میں بڑی ترقی کی۔ یہ مہاراجہ

ہندوستان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ عہد موریہ میں تو پاٹلی پتر ایک ایسی سلطنت عظمیٰ کا مرکز تھا جس کی سرحدیں کوہ ہندوکش اور میسور کے کہستانوں تک وسیع تھیں۔ شہنشاہ اشوکا کے شاندار دور میں پاٹلی پتر سارے ایشیا کا سیاسی، تجارتی، تہذیبی اور ذہنی صدر مقام تھا۔

سلطنت موریہ کے زوال کے بعد باختر کے یونانیوں اور ساکا قوم (تورانیوں) نے مگدھ کو تاخت و تاراج کیا۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں بھی یونانیوں کے ذریعہ ایرانی اثرات اور ساکا قوم کے ذریعہ تورانی اثرات مگدھ کی پراکرت پر ضرور پڑتے رہے ہوں گے۔ یونانی ایران میں رہ کر یہاں آئے تھے۔

پاٹلی پترا نے گپتا عہد میں نئے سرے سے ترقی حاصل کی۔ پانچویں صدی عیسوی میں گپتا سلطنت کی راجدھانی پاٹلی پترا سے اوجین منتقل ہوگئی۔ ہیون سانگ (چینی سفیر) نے اس شہر کو ویران پایا (۶۳۰-۶۴۵ء)۔ غالباً ہُن قوم کے حملوں نے اس شہر کو لوٹ کر ویران کر دیا۔ اور یہاں کے مالدار تجارت پیشہ شہری جاوا، سماترا اور بالی جزائر شرق الہند میں جا بسے۔

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں بہار پر مختلف مغربی ہندوستانی سلطنتوں کے حملے ہوئے، اور وقتاً فوقتاً اُن کا اقتدار قائم ہوا۔ لسانی اعتبار سے یہ پراکرتوں کا تیسرا دور تھا۔ یعنی اَپ بھرنشوں کا عہد۔ اس دور میں مگدھی اَپ بھرنش پر مغربی اَپ بھرنشوں کا اثر ضرور پے بہ پے پڑتا رہا۔ یہ مرحلہ بھی بہار میں مغربی بولی کے اثر و نفوذ کی ایک اہم منزل ہے۔

طوائف الملوکی کے اس دور کے بعد گوپال، دھرم پال اور دیو پال کے زمانہ میں بہار، خصوصاً مگدھ کو پھر استقلال و استحکام حاصل ہوا۔ پال (بودھ) عہد میں نالندہ، وکرم شیلا اور اودنت پوری کی یونیورسیٹیوں کے ذریعہ اس دیار کو پھر ایک بار ایشیا کی ذہنی رہبری کا مقام حاصل ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب نئی ہند آریائی زبانوں کی تاسیس ہونے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ بہار کی اپ بھرنشوں پر نہ صرف مغربی اپ بھرنشوں کا اثر پڑ رہا تھا۔ بلکہ شمال مغربی ایشیا کی زبانیں بھی مگدھ کی بھاشا پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔

اسلامی عہد شروع ہونے سے پہلے بہار پھر ایک بار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پریشان و تباہ حال ہو رہا تھا۔ قطب الدین ایبک کے سپہ سالار اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے جنوبی بہار فتح کر لیا (۱۲۰۴ء)۔ بہار کا ایک بڑا علاقہ دہلی کے سلطانوں کے ماتحت ہو گیا۔ شاہ آباد، پٹنہ، بہار شریف، مونگیر اور بھاگلپور کے اضلاع اُن کے زیر نگیں پہلے ہوئے۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں میتھیلا[۱] (شمالی بہار) مفتوح ہوا (۱۳۲۴ء)۔ سولہویں صدی عیسوی میں بہار، افغانوں اور مغلوں کے رقیبانہ مجادلہ کی آماجگاہ بنا۔ ترکوں اور افغانوں کے عہد میں بہار شریف دار السلطنت تھا۔

۱؎ اب پروفیسر حسن عسکری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ شمالی بہار عہد غلامان میں ہی سلطنت دہلی کے ماتحت ہو گیا تھا۔ ممالک محروسہ میں درбھنگہ کا نام تاریخ میں ملتا ہے۔ اس عہد میں دہلی سے بنگال جانے والی فوجیں شمالی بہار سے آزادانہ گذرتی تھیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جنوبی بہار پر دہلی کا اثر واقتدار زیادہ تھا۔

شیر شاہ سوری افغان نے ۱۵۴۱ء میں پٹنہ کو اپنی سلطنت کا صدر مقام بنایا۔ اکبرِ اعظم نے ۱۵۷۴ء میں افغانوں سے بہار چھینا، پٹنہ فتح کیا اور باڑھ تک بڑھتا چلا گیا۔ وہ خود اس مہم کی قیادت کر رہا تھا۔ راجہ ٹوڈر مل اور صوبہ دار بہار منعم خاں نے صوبہ کے مختلف علاقوں کو مفتوح کیا۔ مغل حکومت چھوٹا ناگپور (جھارکھنڈ) تک وسیع ہوئی۔ یہ عہدِ جہانگیر کا واقعہ ہے۔ مگر ۱۶۳۹-۶۰ء تک کے سال قبائلِ جھارکھنڈ کو زیر کرنے میں لگے۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے پوتے عظیم الشان کو اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں صوبہ دارِ بہار مقرر کیا۔ شہر پٹنہ کا نام عظیم آباد رکھا گیا۔ ۱۷۳۳ء میں بہار اور بنگال کو ملا دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء تک یہی عالم رہا۔ تا آنکہ برطانوی عہد میں بہار، بنگال سے علیٰحدہ ہوا۔ ۱۷۴۲-۵۰ء تک بہار پر مرہٹہ گردی بھی رہی ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی جیت کے بعد انگریز بنگال اور بہار پر قابض ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس صوبہ کے سپوتوں نے حصّہ لیا۔ مگر میجر آئر نے دوبارہ اسے فتح کر لیا۔

مسلم عہد میں بہار کے دارالخلافہ پٹنہ کی بہت بڑی سیاسی اور تہذیبی اہمیّت پیدا ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے شاہزادے یہاں صوبہ دار مقرر ہو کر آتے رہے ہیں اکبرِ اعظم خود پٹنہ آیا۔ جہانگیر کا بیٹا شہزادہ پرویز یہاں کا صوبہ دار مقرر ہوا (۱۶۲۶ء)۔ شہزادہ عظیم الشان کا تذکرہ اُوپر ہو چکا ہے۔ نواب علی وردی خاں کا بھتیجا اور داماد نواب ہیبت جنگ ۱۷۴۰-۴۸ء تک صوبہ دار بہار رہا۔ جنگ پلاسی کا مجاہد سراج الدولہ، نواب ہیبت جنگ کا بیٹا تھا۔ راجہ رام نرائن لعل ۱۷۵۲-۶۱ء تک

نائب صوبہ دار بہار رہا ۔ سلطنت دہلی کے نہایت ہی جلیل القدر اُمراء صوبہ بہار کے گورنر مقرر ہوا کرتے تھے ۔ مثلاً راجہ مان سنگھ اور سیف خاں (۳۲-۱۶۲۸ء)۔ سیف خاں نے دریائے گنگا کے کنارے بہت بڑی مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا ۔ یہ مدرسہ عربی تعلیم و تعلّم کا ایک عظیم الشان مرکز بن گیا تھا ۔ چمنی گھاٹ، محلہ خواجہ کلاں میں آج بھی مدرسہ اور مسجد کی عمارتیں موجود ہیں ۔ مدرسہ سیف خاں کے نزدیک عہد شاہجہاں کی ایک یادگار چہل ستون کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ چالیس ستونوں کا ایک محل تھا ۔ فرخ سیر اور شاہ عالم ثانی کی تاجپوشی اسی محل میں ہوئی تھی ۔ پٹنہ سیٹی کا چوک تھانہ اسی عمارت کی جگہ واقع ہے ۔ شیر شاہ کا بنایا ہوا قلعہ پٹنہ میں صوبہ داروں کی قیام گاہ ہوا کرتا تھا ۔ آج یہ "قلعہ ہاؤس" رادھا کرشن جلان کے تصرف میں ہے ۔

عظیم الشان اُمراء کے علاوہ جلیل القدر صوفیا بھی صوبہ بہار میں تشریف لائے اور یہ "ہندوستان کے روحانی فاتح" یہیں کے ہو رہے ۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی ۔ ان بزرگ اصفیاء میں سب سے اہم اور قدیم نام حضرت مخدوم یحیٰی منیری اور اُن کے صاحبزادے حضرت مخدوم شرف الدین منیری ثم بہاری کے ہیں ۔ منیر، پٹنہ سے بارہ میل مغرب میں ایک قصبہ ہے ۔ ترکوں نے اس پر ۱۱۲۶ء میں اختیار الدین بن بختیار کے حملہ سے پہلے قبضہ حاصل کر لیا تھا ۔ حضرت یحیٰی منیری کا انتقال ۱۲۹۲ء میں ہوا ۔ آپ کی قبر بڑی درگاہ منیر میں ہے ۔

مذکورہ تاریخی حقایق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ صوبہ بہار کی زبان پر عربی و فارسی اثرات اور کھڑی بولی کے اثرات باضابطہ طور پر دہلی کے غلام خاندان کے سلطانوں

کے دَورِ حکومت ہی میں پڑنے لگے تھے۔

علاقۂ بہار کی قدیم ترین زبان نو کول اور ڈراوری یا اُن کا آمیزہ ہی تھی۔ آج تک چھوٹا ناگپور کے خطّے میں آدی باسی قبیلے کول ڈراوری زبانیں بولتے ہیں۔ اور اُن کی اکثریت ہے۔ مگر چھوٹا ناگپور میں بھی آریائی زبان کا نفوذ بعد میں نمایاں طور پر ہوا۔ شمال بہار کے لوگ وہاں جا کر بسے ہیں۔ آریائی عہد میں بھی جنوبی بہار اور جھاڑکھنڈ (چھوٹا ناگپور) پر کول ڈراوری حکومتیں رہی ہیں۔ شمالی بہار پر بھی آریائی اقتدار ہندوستان کے وسطی اور شمال مغربی علاقوں پر غلبہ کے صدیوں بعد آیا۔ بہار کی قدیم ترین زبانیں آج بھی تبدیل شدہ شکل میں باقی ہیں۔ مثلاً اُراؤں، مُنڈاری، ہو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کول ڈراوری زبانیں زندہ اور قبائلِ چھوٹا ناگپور کے زیرِ استعمال ہیں۔

جب یہ کول ڈراوِر دیس آریائی قبضہ میں آیا تو ملک کے مشرقی علاقوں میں قدیم ہند آریائی بولی کی ایک خاص شکل مروّج ہوئی۔ اسے "پراچیہ" کہتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس پراچیہ بولی کی دو نمایاں شاخیں ہو گئیں۔ ماگدھی اور اَردھ ماگدھی پراکرتیں۔ اِن سے ماگدھی اور اَردھ ماگدھی اَپ بھرنشیں بنیں۔ اَردھ ماگدھی اَپ بھرنش سے اَودھی، بھگیلی، اور چھتیس گڑھی بولیاں پیدا ہوئیں۔ اور ماگدھی اَپ بھرنش کی مغربی شاخ سے بھوجپوری، وسطی شاخ سے مگہی اور میتھیلی اور مشرقی شاخ سے بنگالی، آسامی، اور اُڑیہ بولیوں نے جنم لیا۔ ملاحظہ ہو ذیل کا لسانی نقشہ۔ اس سے بہار کی آریائی بولیوں کا سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔

ماگدھی پراکرت

↓

ماگدھی اَپ بھرنش
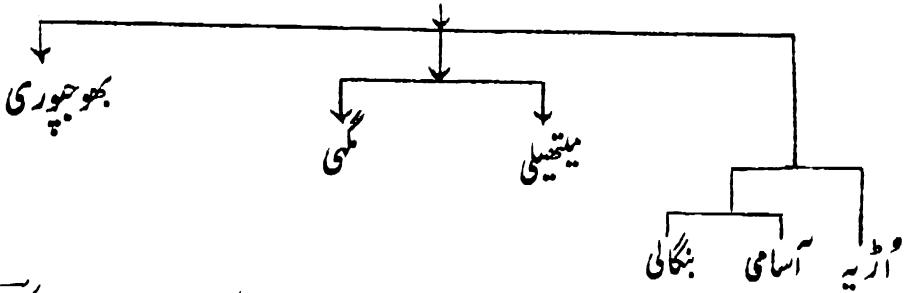
مہاتما گوتم بودھ اور مہاویر کے وعظ و پند اصل میں پراچیہ بولی میں تھے۔ اَسوکا کے بعد اوّل الذکر کے مواعظ کو مغربی بولیوں میں منتقل کیا گیا۔ یعنی شورسینی کے روپ میں ڈھالا گیا۔ مگر مشرقی ماگدھی اور اَردھ ماگدھی کا بنیادی اثر نچلی سطح پر قائم رہا۔ یہی پالی[1] زبان ہے۔ لہذا پالی زبان کے جتنے نمونے ملتے ہیں۔ اُن میں ہمیں بہار کی ماگدھی بولی کا سراغ ملتا ہے۔

خاص ماگدھی زبان کا قدیم ترین نمونہ رام گڑھ کی پہاڑی کے ایک غار میں ملتا ہے۔ اس غار کو جوگی مارا کہتے ہیں۔ یہ چھوٹا ناگپور کی سرگوجا ریاست میں واقع ہے۔ غار میں ایک عبارت بہ زبانِ مگھی کندہ ہے۔ کتبہ کو "سوتنو کا" کتبہ کہا جاتا ہے۔ اس کا رسم الخط براہمی ہے۔ پتھر پر کندہ عبارت رقاصہ سوتنو کا اور ایک بُت تراش دیودین کی غیر فانی محبت کی یادگار ہے۔ عبارت یوں ہے:

---

[1] ڈبلو گیگر: پالی گرامیٹک۔

"[1]سوتنو کا نامَ دیوُ داسِک ای تمَ کمَ ای تھ
بَلَ نسے ای دیوُ دینے نامَ لوپَ دَکھے"

یعنی — سوتنو کا نام کی دیو داسی سے محبّت کرتا تھا بنارس کا دیودین نامی روپ بنانے والا۔

جوگی مارا غار کی عبارت تین سو سال قبل مسیح کی ہے۔ یہ دو ہزار سال سے پہلے کی بہاری (مگدھی) زبان کا ایک نمونہ ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ براہمی مُہر ہے جو پٹنہ میں دستیاب ہوئی ہے۔ یہ موریہ عہد سے قبل کی چیز ہے۔ اس پر "اگپلس" کندہ ہے۔ اسی طرح بودھ گیا میں مُہریں ملی ہیں۔ یہ دوسری صدی قبل مسیح کی ہیں۔ اسوکا کے کتبے بھی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ خصوصًا مشرقی اور وسطی ہند کے کتبے۔ مگر اسوکا کے بعد ماگدھی بولی کی اہمیت گھٹتی گئی اور جیسے جیسے برہمنیت کی نشأۃ الثانیہ ہوتی گئی ماگدھی بولی نظروں سے گرتی گئی۔ کیونکہ اس میں غیر آریائی ڈراوری اثر دوسری ہند آریائی بولیوں سے بہت زیادہ تھا۔ یہاں تک کہ خود ماگدھی اور اَردھ ماگدھی علاقوں میں بھی شورسینی[2] زبان ادبی حیثیت میں جڑ پکڑنے لگی۔ خلقت تو ماگدھی اور اردھ ماگدھی بولتی تھی۔ مگر شورسینی ہی مہذّب زبان سمجھی

۱؎ آثار قدیمہ ہند کے سروے کی سالانہ رپورٹ ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء۔ صـ ۱۲۸۔ بحوالہ "بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا: سونیتی کمار چٹرجی۔ چٹرجی نے عبارت کا سنسکرت فارم یوں دیا ہے:-

"سوتنو کا نامَ دیوُ داسیکا تمَ اُکامَ ایشٹ وارانَسیہ دیوُدَتّو نامَ روپَ۔ وکشہہ"

۲؎ "بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا: چٹرجی۔ اور تاریخ زبان اُردو: مسعود حسین خاں، صـ ۴۴

جاتی تھی اور پوربی شاعر بھی بجائے ماگدھی کے شورسینی اَپ بھرنش ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دسویں تا تیرہویں صدی عیسوی کی قدیم ترین بنگالی نظمیں شورسینی اَپ بھرنش میں لکھی گئی ہیں۔ ہاں بہار کے میتھیلی علاقہ کے ایک شاعر ودّیاپتی[۲] نے اَپ بھرنش کے بعد کے فارم یعنی اَپ بھرسٹ میں شاعری کی ہے۔

۶۴۵ء تک ماگدھی بولیاں مُمیّز طور پر اپنی مختلف شاخوں میں نہیں بٹی تھیں۔ ہیون چیانگ، چینی سیفر (۶۴۵ء) نے ماگدھی کی شاخوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ یہ لسانی تفریق[۲] بعد میں عمل میں آئی۔ چیٹرجی کا خیال ہے کہ مغربی ماگدھی اَپ بھرنش ۸۰۰ء اور ۱۱۰۰ء کے درمیان منفرد و مشخّص ہوئی ہے۔ اور اسی سیّال دَور کے معاً بعد مگدھی ریختہ کا امتزاجی دَور شروع ہوا۔ اُوپر کے بیانات سے یہ بھی ظاہر ہو چکا ہے کہ شورسینی کا اثر بہت پہلے سے بہار پر پڑ رہا تھا۔ غرض یہ کہ کھڑی بولی کا اثر و نفوذ ادبی لحاظ سے یقینی طور پر بہت قبل بہار میں ہو چکا تھا اور "پرو ٹو اُردو" کی تاسیس کے لئے عربی و فارسی کا اثر بھی دَورِ قدیم سے پڑنے لگا تھا۔ لیکن اُردوئے قدیم کی عمارت بارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے اُٹھنی شروع ہوئی۔

چیٹرجی اس فیصلہ پر پہنچا ہے کہ مگہی بولی باضابطہ طور پر کبھی ادبی تخلیقات کے لئے استعمال نہیں کی گئی۔ لوک گیتوں اور عوامی کہانیوں سے قطع نظر ۱۱۰۰ء

۱۔ بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا: چیٹرجی ص ۹۱

۲۔ گریرسن: لنگوئسٹک سروے آف انڈیا، جلد پنجم، حصّہ دوم۔

سے پہلے بہار میں بھی مغربی اَپ بھرنشوں کے ادب پاروں کا ہی چلن تھا۔ گریرسن اور بعد میں آرچر نے بہار کے لوک گیتوں کو جمع کیا تھا۔ آرچر کے مجموعہ کے پہلے حصّہ میں چھوٹا ناگپور کے لوک گیت ہیں۔ دوسرا حصّہ اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ شکیلہ اختر نے رسالہ معاصر، پٹنہ میں بہار کے مروّجہ لوک گیتوں کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ آج کل کے لوک گیتوں کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اُن کا کتنا حصّہ قدیم ہے، کتنا وسطی اور کتنا جدید۔ اِن گیتوں کے چند مشہور فارم یہ ہیں۔ بدیسیا، رسیا، چیت، ساون، جھومر، مَلہار وغیرہ۔ اِن کے علاوہ شادی بیاہ کے گیت ہیں۔

بہار کی مقامی بولیوں میں میتھلی نے اَدبی لحاظ سے اپنی حیثیت قائم کی۔ میتھلا دیش کے مشہور شاعر ودّیاپتی (تیرہویں صدی عیسوی) نے میتھلی کے ساتھ ساتھ مغربی اَپ بھرنش (اوہٹ) میں بھی شاعری کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی دو کتابیں اہم ہیں۔ کِرتی لتا اور کِرتی پتاکا۔ ودیاپتی کی اَپ بھرنش میں مروّجہ مقامی زبان کی پُٹ بھی ملتی ہے۔ وہ خود کہتا ہے، ”دیسی بھاشا سب کو میٹھی لگتی ہے۔ اِس لئے اس سے ملی ہوئی اَپ بھرنش میں شاعری کرتا ہوں[1]“ ودّیاپتی کی پدآولی بھی بہار کے لسانی اِرتقا کو سمجھنے کے لئے ایک ضروری کتاب ہے۔

کِرتی لتا میں ریختہ پن موجود ہے۔ اَپ بھرنش کے بین بین فارسی اور

---

[1] ہندی ساہتہ کا اتہاس ص ۱۷ — از مہابیر پرشاد دوویدی۔

عربی الفاظ ملتے ہیں۔ مثلاً: خدابند (خداوند)، وجیر (وزیر)، صدر دارگہہ (صدر درگاہ)، نماج گہہ (نماز گہہ)، بارگہہ، پھرمان (فرمان)، پاپوش، پادشا (پادشاہ)، رعیّت، مجا (مزا)، محل، کباب، سراب (شراب)، پیدا (پیادہ) وغیرہ۔

کِرتی لتا کرت سنگھ کا قصّہ ہے۔ جسے ایک مسلمان امیر اَسلان (غالباً ارسلان) نے شکست دی اور اُس کے حقوق تلف کیے۔ وہ فریادی بن کر میتھیلا سے جون پور گیا اور ابراہیم شاہ (غالباً شرقی) کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی مظلومی کی داستان کہہ سُنائی۔ بادشاہ نے مظلوم کی مدد کی۔ اور اَرسلان پر لشکر کشی کی۔ کِرتی لتا ابراہیم شاہ اور کِرت سنگھ کی بہادری کی داستان ہے نمونۂ کلام درج ذیل ہے:۔

کھَن اِک مَن دَے سنو بکھّن
کچھو بولوں تُرکانوں لکھّن
تَتوَ بے کمارو پَیٹّھے بجَاری
جہیں لکھ گھوڑا مُو نگا ہجاری
کھَریدے کھَریدے بہوتا گلُامو
تُرکیں تُرکین اَنیکو سَلامو

ترجمہ :۔ ذرا جی لگا کے ایک اچھا بیان سنو۔ کچھ ترکوں کے لچھن میں بتاتا ہوں۔ وہاں دو کمار بازار میں داخل ہوئے، جہاں لاکھوں گھوڑے اور ہزاروں ہاتھی تھے۔ بہت سے غلام

خریدے گئے۔ تُرک تُرک کو خوب سلام کرتے ہیں۔

اَب ذرا اُس عہد کے فاتح ترک کی خصوصیتیں سُنئے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بیان میں تعصّب کی کارفرمائی بھی ہو:۔

اَبے بے بھڑنتا سَرابا پیونتا
کلما کہنتا کلا مے جیُنتا
کَسیدہ کٹنتا مَسیدا بھرنتا
کَتیبا پھڑنتا تُرُ کا اَننتا

ترجمہ:۔ (تُرک) اَبے اَبے بولتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں۔ کلمہ پڑھتے ہیں۔ کلام (شریف) سے جیتے ہیں۔ کشیدہ کاری کرتے ہیں، مسجدیں بھرتے ہیں۔ کتابیں پڑھتے ہیں بہتیرے تُرک۔

مندرجہ ذیل دوہے میں ابراہیم شاہ کی تعریف ہے:۔

ابراہیم ساہ پُوان اَو پوہمی نَرپہ کون سَہہ
گِر سار پار اُبار نہیں رعیّت بھیلن جیب رَہ

ترجمہ:۔ ابراہیم شاہ جب چلتا ہے تو اس پرتھوی کے راجہ (کے حملہ) کو کون سہہ سکتا ہے؟ پہاڑ اور ساگر پار کرکے بھی بچنا مشکل ہے۔ اُس کی رعیّت بن جانے سے ہی جان (سلامت) رہتی ہے۔

مندرجہ بالا دوہوں میں مغربی اَپ بھرنش اور فارسی و عربی الفاظ کا ریختہ بَن چکا ہے۔ بازار، ہزار، خریدنا، غلام، سلام، شراب، کلمہ، کلام، کشیدہ، مسجد، کتاب اور رعیّت کا استعمال ملاحظہ ہو۔ بہار میں پچھمی بولی کے اثرات بھی واضح ہیں۔

قدیم دَور کے بھوجپوری اَدب کے نمونے بھی کچھ مِل جاتے ہیں۔ مثلاً کبیرؔ داس (پندرہویں صدی عیسوی) نے بھوجپوری بولی میں چند نظمیں لکھیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:[1]

کَنوا پھڑائے جوگی، جٹوا بڑھولے
داڑھی بڑھایے جوگی ہوئی گَیلے بَکرا
کَہہ ہیَ کبیرا سُنو بھائی سادھو
جَمَ دَرَجوا باندَھل جَیبے پکڑا

ترجمہ:۔ کان پھڑوا کے جوگی نے جٹا بڑھایا ہے۔ داڑھی بڑھا کے جوگی بکرا ہو گیا ہے۔ کہتا ہے کبیرؔ سنو بھائی سادھو، جَم کے دروازے پر تم پکڑ باندھ کر لے جائے جاؤ گے۔

آخری مصرع میں "دَرَجوا" یعنی 'دروازہ' کی آمیزش ریختہ پَن کا پتہ دیتی ہے۔ کبیرؔ بھوجپور علاقے کا رہنے والا تھا۔ بنارسؔ بھوجپور میں ہے۔ مگر اُس نے زیادہ تر اَودھی، برجؔ اور مِلی جُلی اَپ بھرنش میں شاعری کی ہے۔

---

[1] بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا از سونیتی کمار چٹرجی ص۹۹۔

مندرجہ بالا نمونہ کو چٹرجی نے بھوجپوری قرار دیا ہے۔ لیکن میں صاف طور پر اس میں مگہی بولی کے اثرات بھی پاتا ہوں۔ مثلاً "کہہ ہئی" اور "باندھل جیئبے" "سنو بھائی سادھو" تو واضح طور پر پچھمی بولی ہے۔ اُس عبوری دَور میں بولیاں خلط ملط ہو رہی تھیں۔ مغربی اثرات مشرق کی طرف آ رہے تھے اور مشرقی اثرات مغرب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ عہد قدیم میں بودھ بھکشوؤں، اشوک اعظم اور جَین جوگیوں کے ذریعہ مشرقی لسانی اثرات ہند کے وسطی اور مغربی علاقوں پر پڑتے رہے اور دکن تک اِن کی آوازِ بازگشت پہنچی۔ عہدِ وسطیٰ میں بودھ سدھوں اور بعد از آں کبیر داس کے واسطہ سے مشرق اور مغرب کا اِتّصال ہوا۔

میتھلا اور بھوجپور کے اَدبی اور لسانی میلانات کا جائزہ لیا جاچکا۔ لیکن مگہہ یا مگدھ خاص میں ایسی تباہی آئی تھی کہ تہذیب وتمدّن اور اَدب وفن کو پُرانی بُنیادوں پر نئے سرے سے اٹھانا بہت ہی مشکل تھا۔ ہرش وردھن اور تُرکوں کے درمیانی عہد میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی دَور میں وحشی ہُن قبائل کا حملہ پاٹلی پترا پر ہوا۔ اس وحشیانہ یورش میں قلب مگدھ یعنی شہر پاٹلی پترا اور سارا علاقہ تباہ وبرباد ہوگیا۔ اس آفت کے علاوہ اور بلائیں بھی نازل ہوتی رہیں۔ سیلاب اور آتشزدگی نے بھی بڑی تباہی مچائی۔ اہلِ شہر اپنا وطن چھوڑکر دُور دیسوں کو چلے گئے۔ بعض تاجر پیشہ لوگ تو جاوا وسماترا کی طرف جا نکلے۔ غرض یہ کہ تمدّن اور فنون کی بُنیادیں ہل گئیں اور ساری عمارت ڈھ گئی جس غارتگری کو متعصب یا نافہم اور کم سواد تاریخ نویسوں نے تُرکوں کے سر منڈھا ہے وہ حقیقتاً

ہُن حملہ آوروں کی لائی ہوئی تھی۔ دوسری وجہ مگدھ کی بربادی اور مگھی زبان کی کس مپرسی کی یہ بھی ہوئی ہے کہ موریہ بودھوں کے زوال کے بعد برہمنی احیاء شروع ہوا۔ برہمنی دھرم اور بودھ دھرم کے ماننے والوں کے درمیان سخت طور پر ملک بھر میں تصادم ہوتا رہا۔ یہ تصادم اتنا شدید تھا کہ ہند کی نو آبادیوں یعنی جاوا وسماترا میں بھی ہندوؤں اور بودھوں کے درمیان آویزش وپیکار جاری رہا۔ چیٹرجی لکھتا ہے کہ پاٹلی پترا اور مگدھ کی مکمل تباہی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ میرے نزدیک ہُن بربریت اور خانہ جنگی مگدھ کی بربادی کے دو موٹری اسباب ہیں۔ پاٹلی پترا ایشیا میں تہذیب کا مینار تھا اور بودھ دھرم کا مرکز۔ بربریت اور عصبیت کے طوفان اس کے خلاف اُٹھے اور ماگدھی تہذیب مٹ گئی۔ اس کی روشنیٔ طبع اس کے لئے بلا بنی۔ بغداد کی تباہی کے اسباب بھی اسی قسم کے ہوئے جیسے پاٹلی پترا کے تھے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ماگدھی اور اُردھ ماگدھی پراکرتیں اسوکا کے عہد میں ہندوستان گیراہمیت کی مالک تھیں۔ اس کے نمونے اسوکا کے کتبوں میں ملتے ہیں۔ سنسکرت ناٹکوں[1] میں بھی ماگدھی پراکرت کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ نیچ ذات کے کرداروں سے یہی زبان بلوائی گئی ہے۔ یہ عوامی بولیوں کے زوال وانحطاط کا دور تھا۔ اور برہمنی سنسکرت کے نشأۃ الثانیہ کا۔ چونکہ ماگدھی پراکرت میں دراوری اور دیسی عنصر زیادہ تھا۔ لہٰذا اسے نیچ کہا گیا اور یہ زبان سب سے زیادہ تباہی کا شکار

۱۔ ملاحظہ ہوں چیٹرجی، ووکنر اور مسعود حسن کے مصنفات۔

ہوئی۔اس کے بعد مختلف اَپ بھرنشوں کا دَور آیا۔ ماگدھی اَپ بھرنش یا مگی بھاشا کا رواج ہوا۔ مگر اِسے اَدبی اہمیتِ خاص حاصل نہیں ہوئی۔ راجپوتوں کے عہد سے ابتدائی سلاطینِ دہلی کے زمانہ تک (۸۰۰ء تا ۱۲۰۰ء) ایک خاص لسانیاتی دَور گذرا ہے۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہند کی جدید زبانوں کی ابتدا کب سے ہوئی اور اَپ بھرنشیں کب ختم ہوئیں۔ اِس زمانہ کے قریب بودھ دھرم کی بگڑی ہوئی شکل ہند کے پوربی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ بودھ راہبوں کی خانقاہوں میں نالندہ اور وکرم شِلا دو بڑی درسگاہیں مشہور تھیں۔ صوبہ بہار خصوصاً اِن بودھ سِدّھوں یا بِھکشوؤں کا مرکز تھا۔ اِن راہبوں نے مغربی اَپ بھرنش ملی ہوئی دِیسی بولی میں بھی دوہے لکھے ہیں۔ اِن میں چوراسی سِدّھوں کی بڑی شہرت ہے۔ لِسانی حیثیت سے بودھ سِدّھوں کے دوہے ابتدائی بہاری مسلم صوفیوں کے دوہوں کے پیش رَو ہیں۔

سب[1] سے پرانے سِدھ "سرہ" ہیں جو ۶۳۳ء کے آس پاس گذرے ہیں۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

جی مَن پون نہ سنچرئی، روی سسی ناہیں پولیس
تہی بٹ چت بسام کرو، سرہے کرہی آ اُویس
گھور اندھارے چند منی جمی، اُجوّا کرئی
پرم مہاسو دا یکھو کنے دُری اَ اَشیش ہرئی

۱۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو: ڈاکٹر مسعود حسین: ص ۹۴-۹۳۔ ان دوہوں کا تذکرہ ہری اَودھ کی تاریخ ادب ہندی اور رام چندر شکل کی تاریخ ادب ہندی میں بھی ہے۔

لوہی پا نامی ایک سِدّھ ۷۷۳ء کے لگ بھگ گزرے ہیں۔ دوہے کا نمونہ حسب ذیل ہے:

ڈِٹ کری اَ ہا سوہ پرّی مان
لوئی بھنئی گرو پوچھیا جان

برو پا سدّھ (۸۴۳ء) اور تانتی پا سدّھ کے دوہوں میں بھی زبان کا یہی رنگ ہے "چونکہ یہ سدّھ زیادہ تر ملک کے پوربی علاقوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ اِس لئے وہاں کی مقامی بولیوں سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔"[1]

ان دوہوں سے اس دور کی بہاری بولیوں کا اندازہ ملتا ہے۔ اختیارالدین بن بختیار خلجی کی فتوحات سے جب بودھ سدّھوں کے مراکز زیر ہوئے تو یہ راہب ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور اِن کے ذریعہ اِن کا لِسانی اثر بھی پھیلا۔ جہی، تہی، کرہی آ، کنئے، دُری اَ، کری اَ کا مگہی پن ملاحظہ ہو آج بھی مگہی بولی اسی طرح بولی جاتی ہے۔

تُرک بہار پر باضابطہ رنگ میں بارہویں صدی عیسوی کے اَواخر اور تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں قابض ہوئے۔ علّامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:[2] "سلطان قطب الدین ایبک پہلا بادشاہ ہے جس کے بہادر سپہ سالار بختیار خلجی نے بنارس سے آگے بڑھ کر مگدھ دیس میں قدم جمائے اور بہار سے لے کر بنگال تک کی زمین اُس

۱۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو؛ ڈاکٹر مسعود حسین، ص ۹۴

۲۔ 'بہار میں اُردو' از علّامہ سلیمان ندوی؛ ندیم، بہار نمبر ۱۹۳۳ء

کے فتوحات کے پاؤں کے نیچے آگئی۔ بختیار خلجی المتوفی ۶۰۲ھ نے چھٹی صدی ہجری کے آخر میں منیر اور بہار پر قبضہ کیا۔

"چوں[1] مرد شجاع و دلیر بود بطرف زمین منیر و بہار می دوانید۔۔۔۔

تمامت آں حصار در شہر مدرسہ بود و بہار بلغت ہندوی اسم مدرسہ باشد۔"

بہار میں اُردو کے ارتقا کا یہ ایک اہم سنگ میل ہے۔ گرچہ اس سے پہلے بھی کھڑی بولی اور ریختہ کے لئے ساز گار فضا پیدا ہو چکی تھی۔ بہار، خصوصاً مگدھ کے اعلیٰ طبقات مثلاً برہمن، چھتری وغیرہ اکثر و بیشتر مغربی علاقوں سے آکر یہاں بسے تھے اور اپنے ساتھ پچھمی بھاشائیں لائے تھے[2]۔ شرفا برج بھاشا اور اودھی بولتے تھے۔ عوام، جو آدی باسی تھے، کول ڈراوری بولیاں بولتے تھے۔ اور دوسرے مگہی، بھوجپوری یا میتھیلی بولتے تھے۔ ترکوں کی آمد کے بعد ملک کے مغربی علاقوں کے لوگ اور تیزی سے بہار آنے لگے۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔

پروفیسر گورکھ ناتھ[3] سنہا نے فرامین، دستاویزات اور مختلف خاندانی روایات کی بنا پر یہ تحقیق کی ہے کہ بہار کے اکثر راجپوت گھرانے ترکوں اور مغلوں کی افواج کے ساتھ اس دیار میں آئے، یہاں کے پرانے رجواڑوں اور قبیلوں سے لڑے، انعام میں دِلّی کے بادشاہوں سے جاگیریں پائیں، یہیں بس گئے اور یہیں کے ہو رہے۔

---

[1] بحوالہ طبقات ناصری منہاج سراج ص ۱۴۸ : تالیف ۶۵۸ھ

[2] 'بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا' از سونیتی کمار چیٹرجی ص ۱۴۸۔

[3] سابق صدر شعبۂ معاشیات' پٹنہ کالج۔ آپ بعد میں پرنسپل' پٹنہ کالج اور پھر ڈائرکٹر تعلیمات بہار مقرر ہوئے۔

بہار میں بہتیرے گاؤں اور قصبات ایسے ہیں جہاں مسلم اور راجپوت خاندان جاگیر اور جائداد کے شریک داروں کی حیثیت سے اب تک ساتھ ساتھ بھائیوں کی طرح رسے بسے ہوئے ہیں۔

اردو زبان کی ترویج و ترقی میں سیاسی اثرات سے زیادہ اہم سماجی اثرات ہیں۔ بہار میں نہ صرف سپہ سالار اور ان کی فاتح فوجیں مغربی علاقوں سے آئیں بلکہ بہ کثرت خاندان شمال مغربی ہند اور ایران و عرب سے آکر یہاں آباد ہوئے اور انھوں نے تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کو گہرے طور پر متاثر کیا۔ آج بھی سارے صوبۂ بہار میں سادات، شیوخ عربی (صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی، جعفری، دردائی وغیرہ) پٹھان، ترک، ملک، مغل اور مرزا آباد ہیں۔ مختلف بہاری خاندانوں کے نسب نامے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ نیز شہروں کے پرانے محلوں قصبوں اور گاؤں کے نام اس بات کے شاہد ناطق ہیں، مثلاً شہر پٹنہ کے محلے لودی کٹرہ، مغل پورہ، لوہانی پور، لودی پور وغیرہ۔ سارے اثرات میں اہم ترین اثر صوفیائے کرام کے ذریعہ پڑا۔ ان کی تبلیغ و تلقین سے بہ کثرت اہل بہار مشرف بہ اسلام ہوئے۔ نومسلم خاندان سارے صوبہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی اولاد اب بھی حلقہ بگوش اسلام ہے۔ نومسلموں کے حلقے ریختہ اور کھڑی بولی کی ترویج کے دائرے بن گئے۔ عہد وسطیٰ میں صوفیائے عرب و عجم دہلی ہوتے ہوئے بہار آئے۔ اور بڑی تعداد میں آئے۔ اُن کے فیض سے وہ روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور ادبی خلا پُر ہوا، جو صدیوں سے پاٹلی پترا کی تباہی کے بعد چلا آرہا تھا۔ بہار شریف اور پھر

پٹنہ اس عہد کی نئی ترقی پسند ایشیائی تہذیب کا مرکز بنا اور سارے بہار میں اُجالا ہو گیا۔

ودیاپتی اور کبیر سے پہلے صوفیائے بہار نے اس دیار کی بولیوں میں کلام کیا ہے۔ ہرچند کہ اس عہد کے بہت کم نمونے ملتے ہیں۔ مگر ان اصفیاء کے کلام منظوم و منثور دونوں موجود ہیں۔ پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے ایک گرانقدر مقالہ[1] میں مغلیہ عہد کے قبل کے ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو اسلامی تصوّف نے صوبہ بہار پر ڈالے اور اپنے پائندہ نقوش چھوڑے۔ اسلامی تصوّف کے چشمۂ روحانی نے بہار کی سرزمین کو سیراب کیا اور اس وسیع المشرب اور رواداری نہ تحریک نے ہندو سنسکرتی اور مسلم تہذیب کو متحد کرنے میں بڑی مدد دی۔ اس کا ایک اور اہم نتیجہ یہ نکلا کہ بہار میں "بہاری ریختہ" اور پھر زبان اُردو کی ترویج و ترقی بڑی محبت اور ہم آہنگی کے ساتھ ہوئی اور یہاں کے ہندو و مسلم عوام و خواص نے مل کر متحدہ تہذیب اور متحدہ زبان کی آبیاری کی۔ بہار کے ایک بڑے صوفی حضرت قاضی شُطّاری کا مقبرہ ویشالی شمالی بہار میں بساڑھ اسٹوپ کے نزدیک ہے۔ یہاں ہر سال ایک بڑا میلہ ابتک لگتا ہے۔ خواجہ اجمیری کے جانشینوں میں سید حسین خنگسوار تھے۔ ان کے تین اعزّہ بہار آئے۔ سید حسن خنگسوار جن کا مقبرہ پٹنہ ضلع میں ہے۔ دوسرے سید احمد اور اُن کے بھانجے سید محمد۔ آخرالذکر دونوں صوفی ماموں بھانجے کے نام سے یاد کئے جاتے

---

[1] 'قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوّف کی تاریخی اہمیت' از پروفیسر سید حسن عسکری، پٹنہ کالج پٹنہ: سالنامہ ساتھی، پٹنہ، ستمبر ۱۹۵۲ء۔

ہیں۔ یہ دونوں حاجی پور (ترہت) کے موضع جروحہ[1] میں شہید کئے گئے۔ جروحہ کا مقبرہ اب شکستہ حالت میں ہے۔ اسی طرح شیخ فتو اور شیخ برہان فیروز شاہ تغلق کے دور میں سلیم آباد آئے اور شمالی بہار میں شہید ہوئے۔ کاکو ضلع گیا کے شیخ آز اور احمد بہاری[2] بھی بڑے صوفی گزرے ہیں۔ دہلی کے علماء ظاہر کی ترغیب پر فیروز تغلق نے ان کے لئے سزائے موت تجویز کی۔ حضرت شرف الدین احمد منیری کے قریبی رشتہ دار "مناقب الاصفیا" کے صوفی مصنف سے روایت ہے کہ جب حضرت شرف الدین احمد منیری بہاری نے یہ خبر سنی، تو انہیں نہایت صدمہ ہوا۔ اور آپ نے فرمایا کہ ایسے "پاکان" کا خون رنگ لا کر ہی رہے گا۔

غزنویوں نے بنارس تک لشکر کشی کی تھی۔ ممکن ہے کہ غزنویوں اور غوریوں نے مشرق کی جانب اور دور تک حملے کئے ہوں۔ ان کے حملے ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ لیکن صوفیائے کرام نے اُس قدیم عہد میں بھی بہار پر ضرور حملے کئے ہوں گے۔ یہ بلند مقام درویش مسلمان فاتحین کے لشکروں کے پیچھے پیچھے نہیں چلتے تھے۔ بلکہ وہ محبت و دردمندی کے جذبات سے سرشار ہندوستانی دلوں میں گھر کرنے اور اُن کے پریم کو جیتنے سلطانوں کی فوجوں سے بالکل مستغنی ہوکر آگے آگے چلتے تھے۔ بہار نے ان صوفی دُرویشوں کو

---

[1] "بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ" میں مقبرہ جروحہ کے متعلق حسن عسکری کا مقالہ ملاحظہ ہو۔

[2] ایلیٹ حصہ سوم: ص ۳۷۸

[۱]

[۲]

[۳]

[۴]
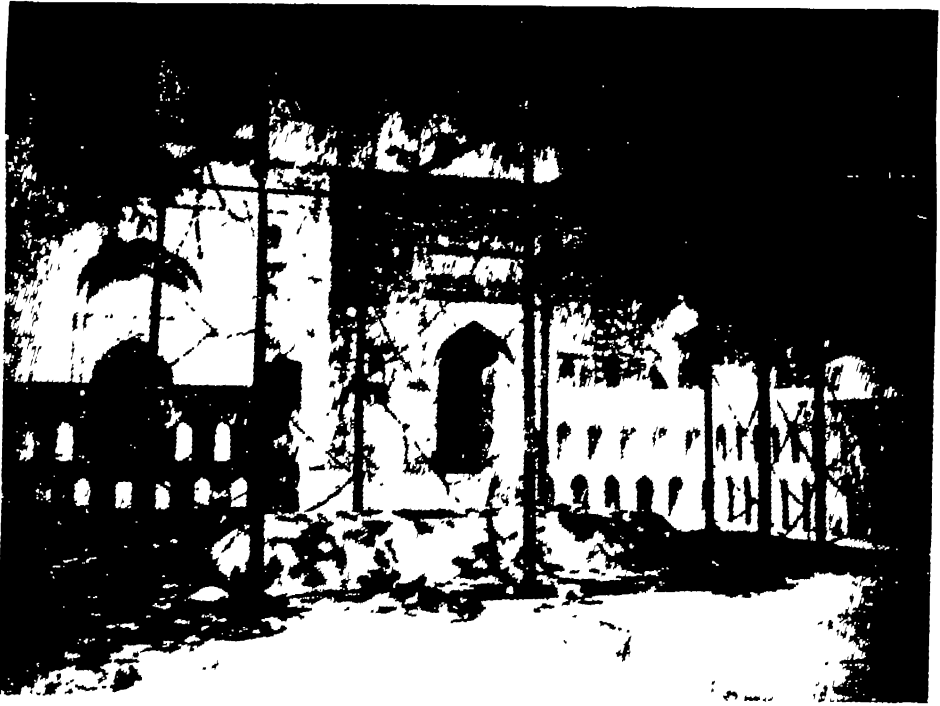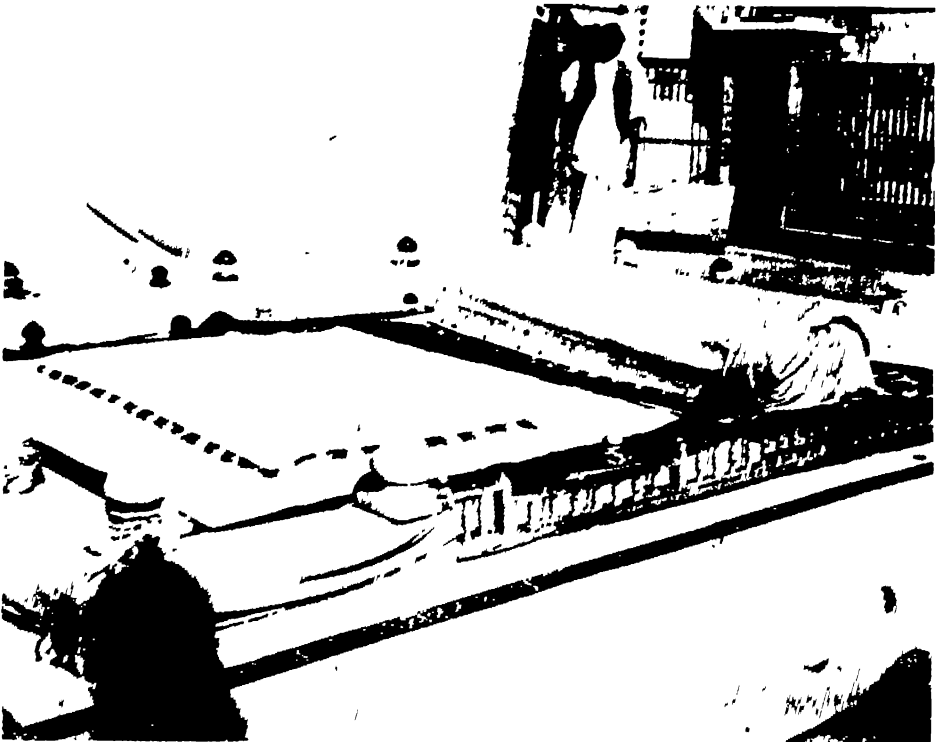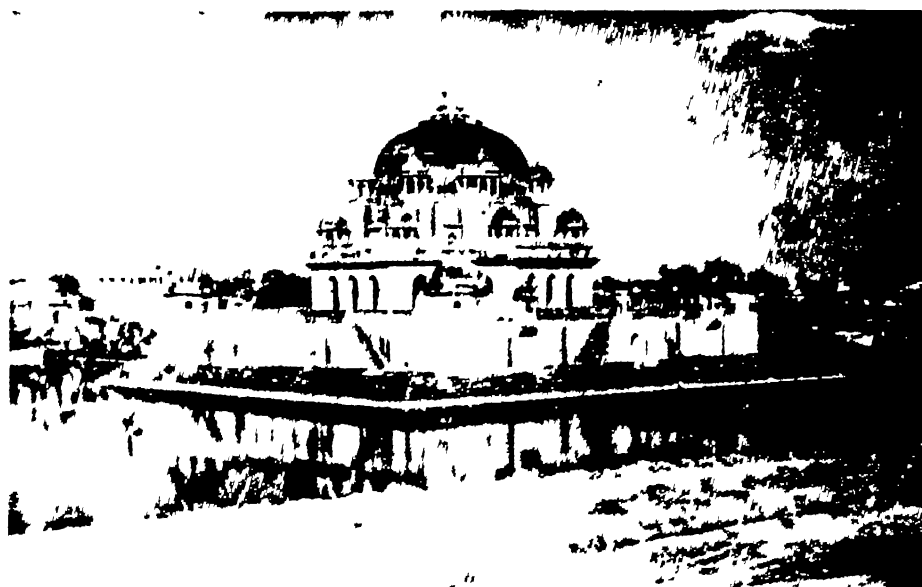
سہرودر اوّل میں ہی اپنی طرف کھینچا۔ منیر شریف ضلع پٹنہ کی بڑی درگاہ کے پچھمی دروازے کے پاس ایک مزار تاج الدین خاندان سے منسوب ہے۔ منیر میں "تاج شاہی" کے نام سے ایک مٹھائی اب تک بنتی ہے۔ مولانا محمد موسوم بہ امام تاج فقیہہ[۱] یروشلم (فلسطین) سے منیر، بہار ۵۷۶ھ ۱۱۸۰ء تشریف لائے۔ آپ بہار کے فردوسیہ اور سہروردیہ صوفیوں کے جد امجد تھے۔ آپ کے فرزند اسرائیل، عبدالعزیز اور اسمٰعیل تھے۔ حضرت تاج فقیہہ تو واپس چلے گئے۔ مگر اپنے دو فرزندوں کو جنوبی بہار میں رشد و ہدایات کے لئے چھوڑا۔ اور تیسرے اسمٰعیل کو شمالی بہار بھیجا۔ جناب اسمٰعیل بنیا بساڑھ کے صوفیوں کے مورث تھے اور جناب اسرائیل حضرت مخدوم یحیٰی منیری کے والد ماجد تھے۔ حضرت پیر شہاب الدین جگجوت (موضع جیٹھلی[۲] ضلع پٹنہ) کی بڑی لڑکی سے حضرت مخدوم یحیٰی منیری کی شادی ہوئی۔ اس مجمع البحرین سے وہ گرانقدر موتی پیدا ہوا جو عالم روحانیت میں آفتاب وار چمکا۔ یعنی حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری ثم بہاری۔ حضرت مخدوم بہار اندرون ملک و بیرون ملک مشہور و مقبول ہوئے۔

بہار کے صوفیائے کرام کی ابتدائی تاریخ "مناقب الاصفیا" ہے۔ اس

۱۔ پروفیسر حسن عسکری کا مقالہ "قرون وسطیٰ بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت" سالنامہ "ساتھی"، پٹنہ، ستمبر ۱۹۵۲ء۔

۲۔ جیٹھلی = جی اُٹھلی ۔ کہا جاتا ہے کہ پیر جگجوت کی کرامت سے ایک "مارگزیدہ" نے نئی زندگی پائی تو بول اٹھا "جی اُٹھلی"۔ یعنی "میں جی اٹھا"۔ یہ مگہی زبان کا نمونہ ہے۔ "جگجوت" اور "جی اُٹھلی" کے الفاظ سے اس عہد کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے۔

کے مؤلف حضرت مخدوم شیخ شعیب شیخ پوروی (ضلع مونگیر) تاج فقیہہ کے پوتے تھے۔
حضرت پیر جگجوت (جیٹھلی) کی تین اور بیٹیاں تھیں۔ ان کے بطن سے مخدوم سید احمد
چرم پوش، تیم اللہ سفید باز (بہار شریف)، بی بی کمالو (کاکو، گیا)۔ اور
تاجپور ضلع پورنیہ (بہار) کے شیخ حسین دھکڑ پوش کی والدہ پیدا ہوئیں۔ حضرت
تاج فقیہہ کے فرزند جناب اسمٰعیل کا سلسلہ شمالی بہار میں خوب پھیلا۔ صوبۂ بہار
کے شطاریہ صوفی آپ ہی کے سلسلہ سے ہیں۔

بہار کے چند اور بزرگ صوفیائے قدیم کا نام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً
حضرات مولانا شمس منظفر بلخی، حسن بلخی، احمد لنگر دریا، بدر عالم (چھوٹی درگاہ
بہار شریف) ابراہیم بن ابوبکر موسوم بہ ملک بیا (جو بہاری ملکوں کے جد امجد
تھے)، مداری صوفی سید جمال الدین (ہلسہ) شیخ برکت اللہ قتال، شیخ تاج الدین
مداری (دربھنگہ) سید محمد (امجھر شریف، گیا)، سید فضل اللہ گوسائیں (بہار شریف)
مخدوم شاہ شمس الدین (اروَل، گیا)، سید احمد جاجنیری (ضلع مونگیر)، سید
احمد جان (اورین، مونگیر)، مخدوم سید حسن (حسن پورہ، ضلع سارن)، حضرت مخدوم
بہار شیخ شرف الدین احمد کے خلفاء میں حضرت منہاج راستی پھلواروی اور حضرت
منظفر شمس بلخی اجل صوفیوں میں سے گذرے ہیں۔ حضرت منہاج راستی کے
سلسلہ کے صوفیا پھلواری شریف، ضلع پٹنہ میں آباد ہے۔ مختصر یہ کہ چشتیہ،
سہروردیا، قادریہ، فردوسیہ، مداریہ، شطاریہ سلسلوں کے صوفیائے کرام
بہار میں موجود تھے۔ اور اُن کے فیوض و برکات سے یہاں کی سرزمین سیراب

ہوتی رہی۔

شاہزادہ عظیم الشان، اورنگ زیب عالمگیر کے جانشیں بہادر شاہ اوّل کا لڑکا تھا۔ وہ ایک عرصہ تک بہار کی صوبیداری پر مامور رہا۔ مولانا محمد نصیر علیہ رحمۃ نے شاہزادہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی۔ جس میں بہار کے ۴۶ مشائخ کے مقابر کی زبوں حالی کی طرف شاہزادہ موصوف کی توجہ منعطف کرائی گئی تھی، تاکہ حکومت کی طرف سے مالی امداد مل سکے " افسوس ہے کہ عرضداشت کی اصل نقل میں شاہزادہ کی خدمت میں پیش کرنے کی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔"

(شاہزادہ عظیم الشان کو ایک عرضداشت، از سیّد محمد مصطفٰی شاہ بوگھوی۔ صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۰ء)

عرضداشت میں حسب ذیل مقبروں کے نام درج ہیں :۔

(۱) مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد۔ بہار شریف۔ ۷۸۲ھ

(۲) شیخ شعیب بن شیخ جلال ۔موضع شیخپورہ پرگنہ مالدہ میں مدفون ہیں۔

(۳) سیّد محمد عظیم آباد میں مدفون ہیں۔

(۴) شیخ خلیل الدین عرف شیخ منگن و شیخ تاج الدین۔ عظیم آباد۔

(۵) سیّد سلیم۔ عالم گنج عظیم آباد۔

(۶) درویش ارزاں۔ محلہ درگاہ، عظیم آباد۔

(۷) شیخ محمد محمود و شیخ عین الدین حسینی مدار۔ لودی کٹرہ عظیم آباد۔

(۸) شیخ شہاب الدین جگجوت۔ موضع ...... محلہ حویلی بلدہ عظیم آباد۔

(۹) شیخ آدم صوفی ۔ موضع جیٹھلی عملہ پرگنہ حویلی بلدہ عظیم آباد۔
(۱۰) سید محمد ۔ قصبہ بہار ۔
(۱۱) شیخ احمد چرم پوش (۷۷۶ھ میں انتقال ہوا) قصبہ بہار ۔
(۱۲) شیخ بدر عالم ۔ موضع سوہ ، بہار شریف ۔
(۱۳) حسین نوشۂ توحید ۔ حضرت مظفر بلخی کے بھتیجے ۔ مقبرہ قصبۂ بہار ۔
(۱۴) شیخ حمید الدین ، ولد شیخ آدم صوفی ۔ قصبۂ بہار ۔
(۱۵) سید یٰسین دانشمند ۔ قصبۂ بہار ۔
(۱۶) مولانا حسام الدین ۔ "
(۱۷) سید فضل اللہ ۔ "
(۱۸) شیخ فرید طویلہ بخش "
(۱۹) تیم اللہ سفید باز ، بن شیخ حمید الدین ۔ قصبۂ بہار ۔
(۲۰) شیخ سعادت ۔ بہار ۔
(۲۱) سید عطا ۔ "
(۲۲) محمد ابراہیم ولد ابوبکر عرف ملک بیا ۔ ۷۵۳ھ ۔ قصبۂ بہار ۔ پہاڑی پر
(۲۳) خواجہ اسحٰق مغربی ۔ موضع مٹوکھر ۔ نزد شیخ پورہ ۔
(۲۴) شیخ یحیٰی منیری ۔ قصبہ منیر ۔
(۲۵) شیخ جلال ۔ "
(۲۶) حاجی صفی الدین و حاجی نظام الدین ۔ قصبۂ منیر ۔ پرگنہ شاہ پور ۔

(۲۷) شیخ احمد - موضع بیا پور - پرگنہ شاہ پور -

(۲۸) شیخ دولت - قصبۂ منیر -

(۲۹) مولانا نور - خواجہ قطب الدین دہلوی کے سگے بھائی - موضع کھکور - پرگنہ سلیم آباد -

(۳۰) شیخ فتو و شیخ برہان - پرگنہ سلیم آباد سرکار -

(۳۱) سید فخر الدین موضع اوکھدی عملہ پرگنہ حویلی سرکار -

(۳۲) سید صفی - صفی پور - پرگنہ بہم پور سرکار -

(۳۳) شیخ داؤد شطاری - قصبہ محب علی پور - پرگنہ معدقہ سرکار

(۳۴) سید محمد عرف جمن - ۹۲۵ھ - موضع ہلسہ، پرگنہ بلخ سرکار -

(۳۵) سید راستی خلیفہ شیخ شرف الدین احمد بن یحیٰ منیری - قصبہ پھلواری عملہ پرگنہ حویلی سرکار -

(۳۶) شیخ ضیاء الدین سہروردی - ۸۲۲ھ - موضع چنڈھوس -

(۳۷) شیخ شمس الدین چنائی - موضع نلوری -

(۳۸) شیخ کمال الدین - موضع ثنایاں -

(۳۹) سید محمدؒ - پرگنہ کلیر سرکار سارن مضافات -

(۴۰) سید احمد غازی موضع امرتھ - پرگنہ بست ہزاری سرکار -

(۴۱) سید نوح - ۸۰۵ھ - موضع لوح پور

(۴۲) شیخ سعد - قصبہ ابراہیم پور -

(۴۳) حوض رانی، عملہ پرگنہ حویلی بہار سرکار میں بہترے اولیاء مدفون ہیں۔ مثلاً: سید علاؤالدین ہمدانی ۔ سید رکن الدین ۔سید بجو د ۔ سید موسیٰ ۔ شیخ لدھا۔ قاضی شمس الدین ۔حافظ یوسف۔ سید عالم ۔ سید قطب الدین، سید محمد سعید، سید جہانگیر، سید محمد، شیخ مدد، شیخ ہدیٰ، بی بی مکہ۔ (۴۴) ادریس نافع ۔ضلع مونگیر سرکار۔ (۴۵) سید چاری بنیاسی ۔ قصبہ مونگیر۔ (۴۶) شیخ مصطفیٰ۔باسدیو پور۔ مونگیر۔ (۴۷) سید ابراہیم ۔ قصبہ سورج گڑھا۔ (۴۸) مولانا شاہباز۔بھاگلپور۔ (۴۹) سید اولیا، پرگنہ بلیا سرکار۔ (۵۰) شیخ عبدالحیٰ۔ حاجی پور۔ (۵۱) شیخ محمد معروف بہ شیخ قاضی ۔موضع بنیا بساڑھ، حاجی پور۔ (۵۲) شیخ ابوالفتح بن شیخ محمد ۹۴۰ھ ۔ موضع تنکول، حاجی پور۔ (۵۳) مولانا خواجہ علی۔ حاجی پور۔ (۵۴) شیخ برکت اللہ عرف شیخ قتال خلیفہ سید محمد گیسو دراز۔ قصبہ دربھنگہ۔ (۵۵) شیخ سلطان حسین ۔ دربھنگہ۔ (۵۶) شیخ شمس الدین عرف شیخ ثمن دربھنگہ ۔ (۵۷) شیخ ظہور حاجی حمید۔ موضع رتن سرائے ۔سارن ۔ (۵۸) شیخ دلاور شیر سوار چابک مار لدوبی۔ سارن ۔ (۵۹) میر عبدالمالک ۔ بارہ سرکار، سارن۔ (۶۰) شیخ محمد یوسف۔ قلعہ رہتاس کلاں ۔ (۶۱) چندن شہید معروف بہ چندن شہید۔ شہسرام۔ (۶۲) شیخ عثمان۔حسین پور۔ رہتاس (۶۳) شیخ عبدالعلیم۔ مستی، چمپارن ۔ (۶۴) سید عمر شہید ۔آرہ (شاہ آباد)۔[1]

مولانا عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔ " دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لئے سب

---

[1] "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" عبدالحق صہ ۱۲

[۵]

[۷]

[۸]
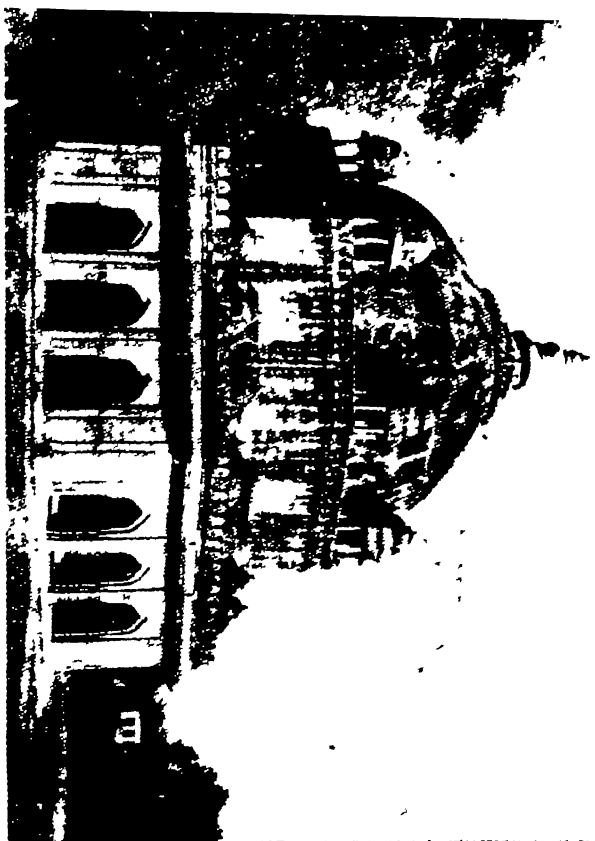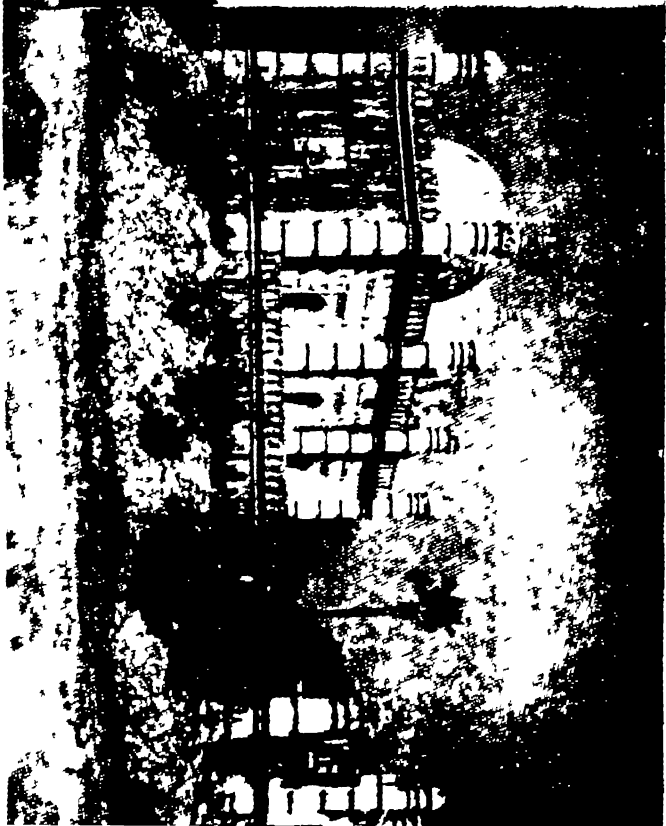
سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے ۔۔۔۔۔۔
جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم وفاضل
ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے
اور تعلیم وتلقین فرماتے تھے۔" ان صوفیاء نے بہار میں بھی مشترک "بہاری ریختہ"
اور پھر "کھڑی بولی ریختہ" یعنی ہندوستانی یا معیاری اُردو کی ابتدا وارتقا میں نمایاں
حصہ لیا ہے۔ یہاں صوفی خانوادوں کی خانقاہیں چھٹی صدی ہجری میں منیر شریف،
بہار شریف، پھلواری شریف وغیرہ میں قائم ہو گئی تھیں۔

صوفیاء و اُمراء کے علاوہ بہار میں فارسی زبان کے شعراء[1] بھی تشریف لائے
اور انہوں نے یہاں قیام کیا۔ ایرانی شعراء اور فارسی ادبیات کا اثر بہار پر دہلی کے
تُرک افغان سلطانوں کے وقت سے ہی پڑنے لگا۔ بہار، ایک اہم مشرقی صوبہ تھا۔
صوبہ داروں اور دوسرے اُمراء کے گرد اہل علم وفضل جمع رہتے تھے۔ مرزا محمد صادق
اصفہانی ۱۰۲۹ھ سے ۱۰۳۳ھ تک پٹنہ میں مقیم رہا۔ اپنی کتاب "صبح صادق"[2]
میں اس نے لکھا ہے کہ پٹنہ کو ایرانی شعراء رشکِ ایران بنائے ہوئے تھے۔ مثلاً
کلیم عارف، مولانا نادم گیلانی، مولانا محمد حسین قزوینی، سیرتی۔ مولانا محمد معزالدین یزدی
مولانا عبدالشکور، مرزا قاسم امامی، میر یحییٰ قسمی۔ میر ہاشم وغیرہم۔ مرزا محمد صادق بن مرزا

۱۔ "بہار اسکول کی اُردو شاعری اور اس کی تخلیق کے اسباب" عبدالمالک آروی:
'نگار' لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۳۵ء۔

۲۔ "عظیم آباد میں ایرانی شعراء کی آمد" سید نجیب اشرف ندوی۔ 'ندیم' گیا۔ بہار نمبر ۱۹۳۳ء

محمد صالح اصفہانی عہد شاہجہاں کا ایک ممتاز مؤرخ ادیب اور شاعر گذرا ہے ۔ صادق گجرات کے شہر سورت میں پیدا ہوا (۱۰۶۱ھ) ۔ پٹنہ کے چار سالہ قیام میں وہ بہت سے فارسی شعراء سے ملا ۔ تذکرۂ " صبح گلشن " میں مولانا محمد حسین قزوینی کے بارے میں درج ہے کہ : " مدتے در عظیم آباد و بنگالہ اقامت گزیدہ " اور حکیم عارف لاہجی کے متعلق ہے کہ : " در عظیم آباد مسکن گرفتہ "

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شعراء سے پہلے اور بعد کثرت سے ایرانی اُدباء وشعراء بہار آتے رہے ہوں گے اور اُن کے اثر سے یہاں مقامی فارسی گو شعراء پیدا ہوئے ہوں گے ۔ بہار میں فارسی گوئی کا مذاق طبقۂ خواص میں عام رہا ہے ۔ ہندو اور مسلم اُدباء وشعراء فارسی کو زمانہ دراز تک ذریعہ اظہار بنائے رہے ۔ اُردو شاعری کے تذکرے بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے ۔ مثلاً : تذکرۂ گلزار ابراہیم، تذکرۂ شورش عظیم آبادی، تذکرۂ عشقی، تذکرۂ عبرتی (' معراج الخیال ' و ' ریاض الافکار ') اور ' تذکرۂ سفینۂ خوشگو ' (بندرابن داس خوشگو) ۔ عبرتی، نومسلم کائستھ تھے ۔ متاخرین میں شیخ علی حزیں عظیم آباد آئے اور راجہ شتاب رائے کے یہاں رہے ۔ بہار کے فارسی گو شعراء میں بیدل عظیم آبادی، شاہ ابوالحسن فرد، شاہ علی حبیب نصر، مولانا محمد سعید حسرت، شاہ اُلفت حسین فریاد اور حکیم عبدالحمید پریشاں دور وسطیٰ اور عہد آخر میں گذرے ہیں ۔

علامہ سلیمان ندوی لکھتے ہیں : " ہندوستان نے ارباب کمال کی تمام اصناف[1]

---

[1] ' نقوش سلیمانی ' ص ۴۰۳ - ۴۰۴

میں سے صرف دو کے نام زندہ رکھے ہیں، مشائخ و اولیاء اور شعراء کہ وقتاً فوقتاً ان کے باا خلاص مریدوں اور معتقدوں نے ان کے ملفوظات و مکتوبات اور تذکرے لکھ کر ان کے فیوض و برکات اور زبانی و ذہنی الہامات کو قائم و باقی رکھا۔ مگر اس صوبہ (بہار) نے حضرت مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے رفقاء کو چھوڑ کر ہندوستان کی اس رسم کہن کو بھی تازہ نہ رکھا۔" علامہ ندوی نے اس اظہار تاسف کے بعد چند بہاری باکمالوں کا ذکر کیا ہے۔ اِن اہل فن[1] اور علماء کے ذریعہ بھی بہار میں اُردو زبان کی ترویج و ترقی ہوئی ہے۔

شیخ برڈھ[2] یا بڈھ بہار میں ایک نامور طبیب اور ممتاز شیخ سلطان سلیم شاہ لودی کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ شیر شاہ سوری کو اِن سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے ملک العلماء دولت آبادی کی تصنیف ارشاد کی ایک شرح لکھی تھی۔ اکبری دور میں بہار میں محدثین کا ایک خانوادہ رہتا تھا۔ اس کے بعض ارکان کے نام یہ ہیں۔ مولانا[3] حافظ شیخ عبدالرزاق بہاری، شیخ الوقت مولانا عبدالنبی، مولانا عبدالمقتدر محدث وغیرہ۔ فتاویٰ عالمگیری کے لکھنے میں بہار کے علماء بھی شریک تھے۔ مُلا مُحب اللہ بہاری[4] جو سلم اور مُسَلّم کے مصنف ہیں۔ یہ صاحب عالمگیر کے عہد میں کابل کے قاضی اور بہادر شاہ اوّل کے

۱۔ 'نقوش سلیمانی' ص۴۰۵ - ۴۰۲

۲۔ تاریخ فرشتہ (احوال سلطنت سلیم شاہ) اور منتخب التواریخ بدایونی (مطبوعہ کلکتہ) جلد ۱ ص۴۰۶۔

۳۔ "ان کی دی ہوئی حدیث کی ایک سند پھلواری میں قلمی ملی ہے" نقوش سلیمانی ص۴۰۳۔

۴۔ سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام، آزاد بلگرامی۔

دَورِحکومت میں کل ہند کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ اِن کے بعد مُلّا غلام یحییٰ بہاری (صاحبِ حاشیہ و مُریدِ حضرت میرزا جانجاناںؔ دہلوی)، مولانا ابراہیم آروی وغیرہ دورِ متاخرین کے جیّد علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔

پروفیسر محمود شیرانیؔ لکھتے ہیں :

"حقیقت[1] یہ ہے کہ اُردو جس طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں اسی طرح پنجابؔ میں برابر بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے۔ پنجابؔ سلطنت اسلامی کا ایک جزو تھا۔ اور سلطنت کا صوبہ ہونے کی حیثیت سے اُردو کو یہاں اسی قدر دخل حاصل تھا، جیسا سلطنت کے اور صوبوں میں .. .. .. "

اب اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ صوبہ بہارؔ میں اُردو کو سرِ دورِ اوّل سے ہی دخل حاصل رہا ہے۔ اس دیار میں بھی لسانی ارتقا کی وہی مرکّب اور پیچیدہ قماش ظاہر ہوتی ہے جو اور صوبوں میں ظاہر ہوئی۔ اور جس کا تفصیلی بیان قبل آچکا ہے۔

صوبہ بہارؔ کی تین نئی ہند آریائی علاقائی بولیاں حسبِ ذیل ہیں : بھوجپوری، مگہی، اور میتھلی۔ ان سب بولیوں میں "ریختہ" کی شکلیں پیدا ہوئیں۔ مگر پٹنہ (عظیم آباد) کی مرکزیت کی وجہ سے "مگہی ریختہ" کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ بہارؔ میں یہی ریختہ اُردو کی بنیادی زمین بنی۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ نالندہ، وکرم شیلا اور پاٹلی پترا

---

[1] 'پنجاب میں اُردو' : شیرانی، ص ۲۲۳۔

کا حلقہ، تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا اور اسی دائرہ پر مغربی اَپ بھرنشوں بالخصوص شورسینی کی مختلف شاخوں (برج ، کھڑی ہندوستانی) کا گہرا اثر مسلمانوں کی آمد کے بہت پہلے سے پڑ رہا تھا۔ مگہہ اور بھوجپور کی علاقائی بولیاں نئے ہند آریائی دور کے آغاز میں خالص مگہی اور بھوجپوری نہیں رہ گئی تھیں۔ بلکہ مگہہ کے علاقہ میں مگہی اَپ بھرنش اور مغربی اَپ بھرنشوں کا ایک آمیزہ تیار ہو چکا تھا۔ اور یہی حال بھوجپور کا تھا۔ ادبی لحاظ سے تو مگہہ اور بھوجپور میں ایک خلا سا تھا۔ علاقائی بولیوں میں ادب پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ اور ادبی ضروریات کے لئے "پنگل"[۱] یا برج بھاشا کا استعمال ہوتا تھا۔ میتھیلی کا حال ان سے بہتر تھا۔ مگر میتھیلی بھی مغربی اَپ بھرنشوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مجموعی طور پر میں "بہاری اَپ بھرنش" کی ترکیب استعمال کروں گا۔ اور اس سے مراد بہاری بولیاں ہوں گی جن پر مغربی اَپ بھرنشوں کا اثر مسلمانوں کی آمدِ بہار سے پہلے پڑ چکا تھا۔ اسی "بہاری اَپ بھرنش" میں عربی و فارسی کے الفاظ ملنے لگے اور رفتہ رفتہ "بہاری ریختہ" بن گئی۔ پہلے 'آمیزش' کا دور آیا۔ اور بعد ازآں 'ترکیب' کا دور آ گیا۔ اور ایک ملی جلی زبان گھُل مل کر بن گئی۔ اسے "بہاری ریختہ" کہئے۔ یہ عہد باضابطہ طور پر ترکوں کی فتحِ بہار کے بعد شروع ہوا۔ پھر اس "بہاری ریختہ" پر بھی کئی دور آئے۔ پہلے دور کو میں بہار میں "اردوئے قدیم" کا دور کہوں گا۔ اس دور میں "ریختہ پن" کے ساتھ کچھ کچھ لسانی پنجابیت بھی

---

[۱] اردو کے ارتقا میں 'پنگل' کا بیان ہو چکا ہے۔ یہ راجپوت درباروں میں شاعری کا ذریعۂ اظہار تھا۔ یہ ملی جلی مغربی اَپ بھرنش تھی۔ بہار میں ایک محاورہ ہے "پنگل چھانٹنا" یعنی علاقائی بولی سے الگ زبان استعمال کرنا، تاکہ بڑے پن کا اظہار ہو۔ 'اورینوی'

ملتی ہے جو دَورِ وسطیٰ تک قائم رہی ۔ لیکن دورِ وسطیٰ کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ بہاری ریختہ کو کھڑی بولی اور "کھڑی بولی ریختہ" تیزی سے متاثر کرنے لگی تھی ۔ اِس عبوری عہد میں بہاری ریختہ اور کھڑی ریختہ سے مرکّب زبان بہار کے ادبی حلقوں میں رائج ہو رہی تھی اور ایک حد تک بول چال کی زبان کو بھی متاثر کر رہی تھی ۔ یہ تبدیلیاں پٹنہ (عظیم آباد) کے اِرد گرد زیادہ نمایاں رنگ میں ہو رہی تھیں ۔ مسلمانوں سے قبل مختلف مغربی اَپ بھرنشوں کا اثر بہاری بولیوں پر پڑا تھا ۔ مگر مسلمانوں کے بعد اختصاصی طور پر کھڑی بولی کا اثر پڑنے لگا ۔ ہرچند کہ شاعری کی زبان سے برج اور اَودھی اثر دیر میں مٹا ۔ لیکن عہدِ عالمگیر کے بعد کھڑی بولی کا سکّہ بڑی ساکھ کے ساتھ بہار میں چلنے لگا ۔ "عہدِ وسطیٰ" کے بعد بہار میں بھی اُردو کا "معیاری عہد" آیا ۔ اس دَور میں کھڑی بولی ہندوستانی ریختہ بہار کے اُردو اَدب کی فضا پر چھا گئی ۔ بہاری بولیوں کی کچھ گونج اور لب و لہجہ و آہنگ قدرے باقی رہ گئے ۔ بہار میں معیاری اُردو (کھڑی بولی ہندوستانی) کا عہد آج سے دو ، ڈھائی سو سال قبل خاصا استوار ہو چکا تھا ۔ مثالیں آئندہ باب میں پیش کی جائیں گی ۔ میرا خیال ہے کہ بہار میں "معیاری اُردو" کا غلبہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی ہونے لگا تھا ۔ "اُردوئے وسطیٰ" کی ابتدا تو تغلقوں کے زمانہ سے ہو گئی تھی ۔ اور یہ دَور جہانگیر کے عہد تک رہا ۔

اِس سلسلے میں مندرجہ ذیل حقائق قابلِ لحاظ ہیں ۔ لکھا ہے کہ :

"سلطان فیروز شاہ ۷۵۲ھ تا ۷۹۰ھ نے اپنے عہد میں ایک لاکھ سے

زیادہ غلام دھلی میں جمع کئے تھے۔ جو زیادہ تر مشرقی ہندوستان سے علاقہ رکھتے تھے۔ فیروز شاہ کے جانشینوں کے عہد میں یہ لوگ اس قدر طاقتور ہو گئے تھے کہ سیاسی معاملات میں دخیل ہو کر ملک میں فتنہ و فساد برپا کرنے لگے۔ ناصر الدین محمد شاہ تغلق ۷۹۲ھ تا ۷۹۵ھ نے تنگ آ کر دہلی سے ان کا اخراج عام کر دیا" (پنجاب میں اردو: شیرانی ص۵ مقدمہ) ظاہر ہے کہ یہ لوگ ملک کے مشرقی علاقوں کی طرف ہی واپس گئے ہونگے اور دہلوی زبان کے اثرات اپنے ساتھ بہار، جو مشرقی صوبہ ہے، لے گئے ہوں گے۔

"سوریوں کو فارسی سے سخت دشمنی تھی" (پ ا: شیرانی مقدمہ ص۵) اور ان سوریوں کا بہار میں غلبہ تھا۔ شیر شاہ سوری اور دوسرے پٹھان بہاری بولیوں کے استعمال و ترقی میں کوشاں ہوں گے اور اس کا لازمی نتیجہ 'ریختہ' کی ترویج میں ظاہر ہوا ہوگا، جیسے بہمنی سلطنت اور اس کے ورثا، کے ذریعہ دکنی ریختہ کو ترقی ہوئی تھی۔ "عالمگیر کے عہد سے دیکھا جاتا ہے کہ طبائع کا عام رجحان اردو کی طرف ہوتا جاتا ہے" (مقدمہ پ ا ص۵)

"عالمگیر کے عہد کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد سے کچھ عرصہ پیشتر ایک نئی تحریک وجود میں آتی ہے، جس کے ماتحت بچوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندی زبانیں بنجاتی ہیں۔ عالمگیر کے عہد میں یہ تحریک عام ہو جاتی ہے۔ اور بے شمار کتابیں بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ جن میں اکثر و بیشتر منظوم ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں جاری ہو جاتا ہے" (پ ا: شیرانی، مقدمہ ص۹)

بہار کی ادبی فضا پر کھڑی بولی ریختہ یعنی اُردو کے غلبہ کے بعد بھی عوام کی بول چال کی زبان اب تک عہد وسطیٰ کی قماش پر ہے یعنی کھڑی بولی اور بہاری بولی کے مرکب سے بنی ہوئی ریختہ زبان زد عام ہے۔ دیہاتوں میں مقامی علاقائی اثر غالب ہے۔ اور شہروں میں کھڑی بولی ہندوستانی کا غلبہ ہے۔ مگر خواص کے درمیان نشستہ مجلسوں میں اور قصبات کی تہذیب یافتہ صحبتوں میں معیاری اُردو ہی بولی جاتی ہے۔ اور اب معیاری ہندوستانی دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف بھی جنتا میں پھیل رہی ہے۔

بقول شیرانی ــ " تغلقوں کے زمانہ سے پیشتر ہی اُردو ایک علیحدہ اور مستقل زبان بن چکی تھی۔ اور اُس نے اپنی صرف و نحو کے قواعد علیحدہ مقرر کر لئے تھے۔ ... ...
لیکن محمد تغلق کے جانشین سلطان فیروز شاہ متوفی ۷۹۰ھ کے بعد گجرات نے دکن کی تقلید کر کے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور تقریباً دو سو[۲۰۰] سال تک گجرات دہلی سے علیحدہ رہا۔ ۹۸۰ھ میں جلال الدین اکبر نے دوبارہ اس کو فتح کیا جس قسم کی اُردو گجراتیوں نے تغلقوں سے سیکھی تھی۔ وہ اسی پر قائم رہے۔ اس کے علاوہ دکن اور گجرات ہمسایہ ممالک ہیں۔ اور ان میں تعلقات بھی قائم تھے۔ قصہ مختصر یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر گجرات اور دکن میں ایک ہی زبان رائج ہے۔" اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ " تین سو پچاس[۳۵۰] سال کے ان علاقوں کا دہلی کے ساتھ الحاق ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے دکنیوں کا براہ راست کوئی تعلق نہیں رہا۔ اور

۱۔ پنجاب میں اُردو: شیرانی صـ۴۷

نتیجہ یہ نکلا کہ دکنی اُردو، متعدد اُمور میں جو بعض صرف و نحو سے تعلق رکھتے ہیں، اور بعض محاورے سے، مختلف ہوگئی"

صوبۂ بہار دکن اور گجرات کے برخلاف قطب الدین ایبک کے وقت سے سلطنت مغلیہ کے اواخر تک اور پھر برطانوی عہد میں بھی سلطنت دہلی کے ماتحت رہا اور اس کا تعلق براہ راست مرکز سے مستحکم اور گہرا تھا۔ اس صورت حال کا لسانی نتیجہ یہ نکلا کہ دہلی اور نواح دہلی میں جو لسانی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ پٹنہ اور بہار پر اُن کا جلد جلد اثر پڑتا گیا۔ عہد وسطیٰ کی بہاری اُردو اور دکنی و گجراتی اُردو میں فرق و امتیاز کے تین پہلو ہیں۔ یوں تو عہد اورنگ زیب سے معیاری اُردو زبان عالمگیر ہونے لگی۔ ہاں تھوڑی تھوڑی علاقائی خصوصیتیں پھر بھی باقی رہ گئیں۔

بہاری اُردوئے قدیم کی سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اس کی زمین بہاری اپ بھرنشیں ہیں۔ یعنی مگہی، بھوجپوری اور میتھیلی۔ جب ان بولیوں میں ریختہ پن، شروع ہوا، تو اس کے ساتھ ساتھ دہلی کے واسطہ سے وسطی بہاری اُردو پر بھی پنجابی بولی کا اثر پڑا جیسے دکن اور گجرات پر پڑا تھا۔ اس کے شواہد ملتے ہیں۔ لیکن اب تک بہار میں تحقیقات و انکشاف کا کام اُس منزل پر نہیں پہنچا جس مقام پر دکن میں پہنچا ہے۔ عہد قدیم اور دور وسطیٰ کے لسانی نمونے بہار میں بہت کم ملے ہیں۔ اور جو ملے ہیں وہ اتنے پرانے نہیں جتنے دکن اور گجرات کے ہیں۔ لیکن قرائن یہ بتاتے ہیں کہ عہد وسطیٰ کی بہاری اُردو پر اتنا

پنجابی اثر نہیں پڑا ہوگا جتنا خود دہلی کی زبان پر اور دہلی کے ذریعہ دکن اور گجرات پر پڑا تھا۔ کیونکہ اس دور دراز علاقے میں پنجابی بڑی تعداد میں نہیں آئے ہوں گے اور دوسرے یہ کہ بہار کی بولیوں میں پنجابی اثر قبول کرنے کا وہ مادہ نہیں تھا جو قرابتِ لسانی کی وجہ سے ہریانہ، دہلی، مغربی اوتر پردیش، راجستھان وغیرہ میں تھا۔ بہاری اردو کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ دہلی سے مسلسل ربط و تعلق کی وجہ سے وہ لسانی تبدیلیاں جو دارالسلطنت میں ہو رہی تھیں دکن اور گجرات کی بہ نسبت جلد تر بہار میں رونما ہوئیں یعنی جب دہلی کی زبان پر مختلف اسباب سے کھڑی بولی ہندوستانی کا غلبہ کامل ہوا تو بہار میں بھی بڑی تیزی سے کھڑی بولی ہندوستانی رواج پانے لگی۔ اس دیار میں علاقائی اور پنجابی اثرات جلد محو ہو گئے۔ اور معیاری اردو زبان تہذیبی اور ادبی طور پر پھیل گئی۔

میں اپنی تازہ ترین تحقیقات کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عہد اورنگزیب عالمگیر (۱۰۶۸ھ/۱۶۵۸ء تا ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کے اختتام تک شمالی ہند میں لسانی یکسانی پھیل رہی تھی اور اس کا اثر دکن اور گجرات پر بھی نمایاں طور سے پڑنے لگا تھا۔

اس امر میں ایک اہم مذہبی کتاب فقہ ہندی کے چند نسخوں کی گواہی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۳ جون ۱۹۵۴ء کو مجھے فقہ ہندی کے دو نسخے شاہ مجتبیٰ حسین صاحب کے خاندانی کتب خانہ واقع بہار شریف، ضلع پٹنہ میں ملے۔ دونوں نسخے قدیم ہیں، کرم خوردہ، قلمی۔ قدیم تر نسخے کے آخری صفحہ پر لکھا ہے:

"تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ ہشتم شہر رجب ۱۲۱۸ھ فصلی۔"

فقہ ہندی کا دوسرا نسخہ مخطوطات کے مجموعوں کی دوسری جلد میں ہے۔ اس کا کاغذ نسبتاً صاف ہے اور اتنا ربودہ بھی نہیں۔ اختتام کے بعد درج ہے کہ:

"تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ سیوم رجب المرجب ۱۲۲۵ھ فصلی از خط خام عاصی گمنام سید نور علی احتمام یافت"

میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فقہ ہندی کے دونوں مذکورہ نسخے کسی قدیم تر بہاری نسخے سے ہی منقول ہیں کیونکہ مثنوی کے ان نسخوں کی زبان پر بہاریت کا صاف اثر ہے۔ مثنوی فقہ ہندی عہد عالمگیر کی تصنیف ہے۔ مجھے اب تک فقہ ہندی کے پانچ نسخوں کی اطلاع ملی ہے، ایک پنجاب میں، دوسرا گجرات میں، تیسرا اودھ میں اور چوتھا و پانچواں بہار میں۔ بنیادی طور پر یہ سب نسخے ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی زبان ایک ہے۔ ہاں تھوڑا مقامی بولیوں کا اثر موجود ہے۔ لیکن فقہ ہندی کے ہر نسخے پر پنجابی بولی کا اثر بھی ہے۔

سب سے پہلے فقہ ہندی کا نسخہ اسپرنگر کو کتب خانۂ اودھ میں ملا تھا۔ اُس نے [1] فہرستِ کتب خانۂ اودھ میں اسے محشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ اس رسالے کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجھر بیان کرتا ہے۔ چند اشعار جو نقل کئے گئے ہیں اُن میں کچھ فقہ ہندی کے دوسرے نسخوں سے ملتے ہوئے ہیں۔ پرافسر شیرانی کو فقہ ہندی کا ایک دوسرا نسخہ مملوکہ پرافسر سراج الدین آذر ام۔اے ملا جو ۱۲۳۳ھ کا نوشتہ ہے۔ اسپرنگر کا افتتاحی شعر کسی اور رسالہ کا

---

[1] پنجاب میں اُردو: پرافسر محمود شیرانی صہ ۲۳۶ تا صہ ۲۳۹ اور صہ ۲۲۵۔

کا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے نسخوں میں وہ شعر ہرگز نہیں۔ اُسے مصنّف کے نام میں بھی غلطی لگی ہے۔ فقہ ہندی کا مصنف عبدی ہے، نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام مثنوی کے مندرجہ ذیل شعر میں آتا ہے۔ ؎

کیتنے مسلہ دین کے عبدی کہے امین ؛ فقہ ہندی زبان پر بوجھو کر ولیقین

ایک ہندوستانی زبان میں فقہ اسلامی کے مسائل پیش کرکے فقہ ہندی کے مصنّف نے بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا۔ اُس کا یہ عمل بہت مقبول ہوا۔ پنجاب کے علاوہ ہریانہ، گجرات، اودھ اور بہار میں اسے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

فقہ ہندی کا گجراتی نسخہ علّامہ سلیمان ندوی کو سفر گجرات[1] کے دوران ملا تھا۔ علّامہ نے مثنوی کے اشعار کے حوالے بھی درج کئے ہیں۔ اس نسخہ میں تصنیف کا سال ۱۰۷۵ھ لکھا ہے۔

فقہ ہندی کون مومنان کرو زبان پر یاد ؛ مسائل آویں دین کے کبھو نہ ہووے فساد
سنہ ہزار پچھتر پیچھے ماہ رمضان تمام ؛ اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس نظم کا وزن عربی و فارسی اوزان میں سے نہیں، بلکہ ہندی وزن کی پیروی میں ہے۔

بہاری نسخوں کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں :-

حمد ثنا سبھ رب کون خالق کُلّ جہان ؛ لایق حمد وثنا کی اور نکوئی جان

---

[1] "سفر گجرات کی چند یادگاریں"؛ نقوش سلیمانی ص۲۷۶

علم شریعت نال کی بھیجا پاک رسول　　جو کچھ بھیجا رب نے سبھ ہم کیا قبول

....　　............

کیتی مسلہ دین کی عبدو[1] کہی ابین　　فقہ ہندوئی زبان پر بوجھو کر ہو یقین

مطلب مسلہ بوجھنا جو کوچھ ہوئی زبان　　عربی ترکی فارسی ہندوی یا افغان

علم شریعت بوجھنا فرض عین کی جان　　بالغ جورو مرد کون جو ہوئی مسلمان

فقہ ہندی خاصا بڑا رسالہ - کُل ۳۲ اوراق بہاری نسخہ نمبر۱ میں موجود ہیں اور ہر صفحہ پر کم وبیش ۶ اشعار درج ہیں - ختم رسالہ پر مندرجہ ذیل اشعار ملتے ہیں :-

کعبہ آوے نظر میں پڑھ درود و دعاء　　اور تکبیر وتہلیل کہہ جو ہی اُمر خداء

فقہ ہندوی کون مومنان آنو زبان پر یاد　　مسلہ اوپی دین کے مول نہوئی فساد

سنہ ہزار چوہتر[2] بیچ رمضان تمام　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

فقہ ہندی کے بہاری نسخوں میں بہاری زبان کے اثرات جا بہ جا ملتے ہیں - مثلاً ، ہندوئی - کرہو - جورو - سبھ - بیچھ - ہاتھہ - دینھہ - جاؤنہ - پانچہ - پچھین - ' ھ ' کی آواز کا اعلان بہاری بُولی میں مبالغہ کے ساتھ دیر تک ہوتا رہا - پنجابی نسخہ میں ' ھ ' کی آواز گر گئی ہے - نئی ہند آریائی

---

[1] بہار شریف کے نسخہ نمبر۱ کے حاشیہ پر "عبدو" کے پاس لکھا ہے ۔ " نام صاحب مصنف "۔

[2] پنجابی اور بہاری نسخوں میں ۱۰۷۴ ہجری سنہ تصنیف لکھا ہے ، گجراتی نسخہ ۱۰۷۵ ہجری اور اودھی نسخہ میں " سن ہزار چو تھے " +

زبانوں یں وسطی زبانیں یعنی مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری زبانیں "ھ"[1]
کی آواز کو الفاظ کے بیچ یا آخر میں بڑی تاکید سے قائم رکھتی ہیں "ھ" کی مرکب
آواز بھی قائم رکھی جاتی ہے۔ مثلاً گھ - جھ - دھ - ڈھ - بھ - برخلاف ان
کے بنگالی، پنجابی اور سندھی میں 'ھ' کی آواز گر جاتی ہے۔ یا بُنیادی طور پر
بدل جاتی ہے۔

فقہ ہندی[2] کے پانچوں نسخوں کی زبان کا عام ڈول اور ڈھانچہ کھڑی بولی
ہندوستانی کا ہے۔ مختلف ناقلوں نے اپنی اپنی مقامی زبان کا لحاظ رکھتے
ہوئے قدرے ردّ و بدل کیا۔ اس مثنوی کے سب نسخوں میں پنجابی اثر کا موجود
ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ عہدِ عالمگیر میں ہی یا اس کے قریب ترین زمانہ میں
فقہ ہندی اودھ، بہار اور گجرات میں منقول ہو کر مقبول خاص و عام ہو
چکی تھی۔ اواخر عہد مُغلیہ میں بہاری اُردو میں پنجابی اثر مٹ چکا تھا۔ اگر مثنوی
کی نقل بہت بعد میں ہوتی تو مقامی ضرورت کا لحاظ کر کے پنجابی الفاظ بالکل
ترک کر دیئے جاتے کیونکہ بہاری نسخوں میں ردّ و بدل کا بہاری میلان پایا جاتا
ہے۔ قرائن یہی کہتے ہیں کہ رسالہ فقہ ہندی تصنیف کے فوراً بعد ہی پنجاب
سے بہار پہنچ گیا تھا اور یہاں اچھی طرح سمجھا جاتا تھا۔ پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں:
"شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے، اُردو کی قلمی

---

[1] انڈو ایرین اینڈ ہندی: چٹرجی، ص ۱۰۵
[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میرا مقالہ "مثنوی فقہ ہندی" رسالہ نقوش، لاہور۔

یادگاریں گیارہویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالۂ فقہ ہندی سب سے قدیم ہے، جو ۱۰۷۴ھ میں بعہد اورنگ زیب عالمگیر لکھا جاتا ہے[1]۔"

بہار میں فقہ ہندی کے دو قدیم نسخوں کا پایا جانا اس حقیقت کا ایک ثبوت ہے کہ اس صوبہ میں اُردو زبان عہد عالمگیر میں پھیل گئی تھی۔ مثنوی کے مختلف نسخوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عالمگیری دور میں شمالی اور جنوبی ہند میں قدرے مقامی رنگ کے ساتھ لسانی یکسانی پیدا ہوگئی تھی۔ یہ زمانہ بہار میں اُردو زبان کے ارتقا کا ایک اہم سنگ میل ہے۔

مجھے ایک اور اہم اور قدیم کتاب کے دو قلمی نسخے بہار میں ملے ہیں۔ یہ کتاب مُلا محمد رمضان کی نظم کردہ ہے۔ نام "آخرت نامہ"[2] یا "آخرگت" ہے۔ پہلے پہل مجھے اور پرافسر حسن عسکری صاحب کو یہ خیال ہوا تھا کہ "آخرت نامہ" کسی بہاری کی تصنیف ہے۔ مگر بعد میں خارجی اور داخلی شہادتوں سے حقیقت معلوم ہوئی۔ بہرکیف صوبۂ بہار کے دو مختلف مقامات میں "آخرت نامہ" کے پُرانے قلمی نسخوں کا ملنا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس صوبہ کے قصبات میں بھی اُردو زبان کا اثر و نفوذ عہد عالمگیر کے بعد بھی دن بہ دن بڑھتا گیا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وسط تیرہویں صدی ہجری تک لسانی و ادبی لحاظ سے ہریانہ سے لے کر صوبۂ بہار

---

[1] "پنجاب میں اُردو" ص ۲۲۵ [2] ملاحظہ ہو میرا مقالہ مطبوعہ "معاصر" پٹنہ دسمبر ۱۹۵۶ء۔

تک ایک وسیع دائرہ قائم ہو چکا تھا۔ 'آخرت نامہ'، ملّا محمد رمضان متوطن ہریانہ کی تصنیف ہے۔ پرافسر محمود شیرانی نے اپنی مشہور کتاب 'پنجاب میں اُردو' کے مقدمہ میں محمد رمضان اور "آخر گت" کا سرسری تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"...... ہریانی علاقوں میں تصنیفات کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن اس کے ادبیات کے متعلق ہماری موجودہ معلومات بہت محدود ہیں۔ حضرت شاہ غلام جیلانی رُہتکی مصنّف 'چو پائیہا' متوفی ۱۲۳۵ھ اور مولوی محمد رمضان مصنف 'آخرگت' و 'بلبلِ باغِ محمدؐ' (۱۲۲۶ھ) اور انور رُہتکی (جو اسی صدی کے نصف دوم سے علاقہ رکھتے ہیں) کے نام اور تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ محبوب عالم کی تحریک اس علاقہ میں برابر جاری رہی ہے۔" (مقدمہ ص ۹، ز)

'آخرت نامہ' کا ایک نسخہ بانگ درا کے سائز کا ہے۔ اس میں ایکسو سولہ ۱۱۶ اوراق ہیں۔ دوسرا نسخہ الفاروق کے سائز کا ہے۔ دونوں نسخوں کا کاغذ زرد اور موٹا ہے۔ دونوں بہاری نسخے مکمّل ہیں۔ ایک نسخہ مجھے پرافسر سیّد حسن، صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ کالج کے توریعہ شیخ محمد منصور ام۔ اے سے ملا اور دوسرا پرافسر سید حسن عسکری، صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج سے حاصل ہوا۔ اوّل الذکر نسخہ پر درج ہے:

"حق مالک این نسخہ کتاب آخرت نامہ شیخ غلام مخدوم ابن شیخ

غلام نجف بن شیخ محمد عالم ولد محمد جہانگیر ساکن موضع اوگانواں پرگنہ
حویلی بہار اند ...."

ثانی الذکر نسخہ پرافسر سید حسن عسکری کو خانقاہ منیر شریف سے دستیاب ہوا تھا۔ دونوں نسخوں میں تھوڑا تھوڑا فرق نظرانداز کرنے کے قابل ہے۔ آخرت نامہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

پہل حمد ہی پاک سبحان کی — بنائی ھی جن صورت انسان کی
کئی آپ عالم اٹھارہ ھزار — بزرگی کا آدم پی کیّا اوتار
جو لاشی و مذکور ظاہر کیا — سبب خاک نطفہ کی باہر کیا

اختتام کتاب یوں ہے :۔

تیری دوست کی نام پر ہی ختم — محمدؐ نبی جو شفیع الامم
ختم دوست کی نام اوپر ہوئے — محمد محمدؐ محمد نبیے
محمدؐ محمد علیہ السّلام — علیک الصلوٰۃ ہمیشہ مدام

تمت تمام شد کتاب آخرت نامہ و آخر گت
بتاریخ ہشتم شہر ربیع الثانی ۱۲۳۲ھ ہجری المقدس

دوسرے نسخہ میں تاریخِ کتابت "بست وپنجم شہر جمادی الاول ۱۲۴۹ھ" درج ہے۔

کتاب کے خاتمہ سے کچھ پہلے مصنف فرماتے ہیں :۔

غرض ایک ہی سب پڑھن ہار پر — کریں وی دعا مجھ گنہ گار پر

اخرگت میں تاریخ ہی سن کتاب — بھر آخرت نامہ نامہ کتاب

اس ادہیں ات چہیں رمضان نام — محمدؐ ہو سر پر تو ... نام

محمد و رمضان دونوں ملیں — گیارہ سے ترا سے عدد ہوں کہیں

یہی سن ولادت ہی رمضان کے

جو ابجد سے واقف ہو پہچان کے

محمد رمضان کا سن ولادت ۱۱۸۳ھ ہے اور "آخرت نامہ" کا سن تصنیف "اخرگت" سے ۱۲۲۲ھ نکلتا ہے۔ آخرت نامہ ایک مذہبی منظوم کتاب ہے، جس میں مناجات کے علاوہ جانکنی، موت، عذاب قبر، موجبات نجات، احوال شہداء، احوال قیامت، علامت قیامت، امام مہدی، جنگِ نصاریٰ، احوالِ دجّال، نزول عیسٰی علیہ السّلام، یاجوج ماجوج، شفاعت، نامۂ اعمال، میزان، کلمۂ تمجید وغیرہ کا بیان ہے۔

کھڑی بولی ریختہ

اب میں عہد وسطیٰ میں بہار کی زبان کی کیفیت کا ایک دوسرا پہلو پیش کرتا ہوں۔ کھڑی بولی ہندوستانی نے بہار میں اب تک گھر بنا لیا تھا اور سماج کے مختلف طبقوں میں طرح طرح سے اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ ملی جلی پوربی اور بہاری بھاشاؤں کے درمیان کھڑی ہندوستانی بولی ریختہ کے سہارے پنپنے اور پھیلنے لگی تھی۔

راجہ مان سنگھ، بہار کا ایک جلیل القدر گورنر تھا۔ پرافسر حسن عسکری کو راجہ موصوف کا ایک فرمان شاہ محمد احمد ساکن جروہہ، متصل حاجی پور سے

ملا ہے۔ اس کا عکس بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جلد ۶۶ سنہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں حسن عسکری نے اپنے مقالہ کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ فرمان فارسی میں بھی ہے اور ہندوستانی میں بھی۔ ہندوستانی عبارت مہاجنی رسم الخط میں ہے اور اس کی ۲۵ سطریں ہیں۔ ہندوستانی عبارت داہنی طرف ہے اور فارسی عبارت بائیں جانب۔ فرمان راجہ مان سنگھ حسب ذیل ہے:

"سید[1] محمد و سید احمد عرف ماموں بھانجا

حکم عالی شد ○ عمال و متصدیان مہمات پرگنہ حاجی پور بعنایت

و التفات امیدوار بودہ بدانند کہ بموجب تصحیح و تصدیق صدارت

پناہ مرحومی قاضی یعقوب و اسناد حکام سابق موازی چہاردہ

بگھہ زمین مزروعہ خارج جمع اثر سال تمام از موضع جروہہ از

پرگنۂ مذکور در وجہ مددِ معاش شیخ بخش و جمال مجاورانِ مزار

متبرکہ قطب الاقطاب مقرر بود والخ۔ ۲۱- ذی الحجہ ۹۹۹ھ"

ہندوستانی عبارت مہاجنی رسم الخط میں حسب ذیل ہے:-

"سری مہاراج دھیراج۔ سری مان سنگھ جیو۔

نانو متصدی مہمات پرگنہ حاجی پور آدی سیس اسنا نیچنے

اپر بموجب تسہی[2] و تصدیق قاضی یعقوب و سند سابق حکام

---

[1] BENGAL PAST AND PRESENT, VOL 66-1946-47.

[2] تسہی = تصحیح +

موازی مزروعہ چودہ بگہہ کاشت سال تمام ازموضع جروہہ از پرگنہ مذکور در وجہ مدد معاش شیخ بخش با جماعہ مجاوران مزار مقرر ہے۔ سہی فصل خریف پارس ایل[۱] سنہ ۹۹۹ھ۔ بہ این دستور سابق بشرط قبض و تصرف و موافق تقسیم قانون گویان حوالہ مشارٌ الیہ کے کیجیو۔ دخل مت کرو۔ وہر سال پروانہ طلب مت کرو۔ سال تمام میں فی بگہہ مزروعہ پیچھے ٹکہ[۲] یک خالصہ لیجیو۔ اورو اور کچھو دخل مت کرو۔ سری سری۔ اپوکرن ۱۲ ذی الحجہ سنہ ۹۹۹ھ[۳]"

یہ ہندوستانی عبارت فارسی وعربی آمیز یعنی 'ریختہ' ہے۔ "اورو" اور "کچھو" کے فارم اور مہاجنی (راجستھانی) رسم الخط کے استعمال سے راجستھانی اثر کا پتہ چلتا ہے۔ راجہ مان سنگھ، راجپوتانہ کا ہی رہنے والا تھا۔ اُس کے عملہ کے کچھ لوگ بھی راجستھانی ہوں گے۔ قرینہ یہ ہے کہ فارسی عبارت کے ساتھ ہندوستانی عبارت اس لئے لکھی گئی کہ بہار کے لوگ اور سرکاری عُمّال ہندوستانی کھڑی بولی ریختہ کو آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ اس کا رواج عام ہو رہا تھا۔ سرکاری زبان تو فارسی تھی۔ مگر کھڑی ہندوستانی بولی

۱۔ پارس ایل ترکی مہینہ ہے غالباً۔ ۲۔ ٹکہ = چونّی +

۳۔ یہ دستاویز اب تک مالک (شاہ مختار احمد، ساکن جروہہ، متصل حاجی پور) کے پاس ہے۔ ملکس، بنگال پاسٹ اینڈ پریزنٹ، جلد ۶۶، ۴۷-۱۹۴۶ء۔

بھی بہار میں اب تک اپنی انفرادیت، وقار اور عمومیت قائم کر چکی تھی۔ حکومت کی رواداری کی یہ ایک اچھی مثال بھی ہے۔ سرکاری دستاویزوں میں سرکاری زبان کے علاوہ اگر دوسری علاقائی یا عمومی زبانوں کو جگہ دی جائے، تو یہ دستاویزیں، اعلان نامے اور حکم نامے لوگوں کے ہر طبقہ میں اچھی طرح سمجھے اور پسند کیے جائیں۔

اُوپر کی سطروں میں راجستھانی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندوستانی کھڑی بولی ریختہ یعنی اُردو کا ایک نمونہ پیش کیا گیا جو بہار میں ملا ہے۔ یہ سولھویں صدی عیسوی کے اواخر اور سترھویں صدی عیسوی کے آغاز کی زبان ہے جو اس صوبہ میں رواج پا چکی تھی۔ اب میں میتھیلی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندوستانی کھڑی بولی کا ایک قدیم نمونہ[1] پیش کرتا ہوں جو آج سے قریبًا دو سو[۲۰۰] سال قبل کا ہے یعنی وسط اٹھارویں صدی عیسوی کا۔ اس میں عربی و فارسی لفظوں کی آمیزش بھی ہے۔ غرض یہ کہ یہ نمونہ کھڑی بولی ریختہ کی اچھی خاصی مثال ہے۔ مگر اس میں تتسم سنسکرتی شبد بھی ہیں۔ کیونکہ جس کتاب سے یہ عبارت لی گئی ہے وہ ایک مہامیتھیلی پنڈت کی لکھی ہوئی ہے۔ مجھے مذکورہ بالا مخطوطہ پرافسر

---

[1] انیسویں صدی کے اواخر تک کھڑی ہندوستانی بولی مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی رہی ہے۔ پرافسر سید حسن، صدر شعبہ فارسی پٹنہ کالج کے پاس بمبئی کے تھیٹروں میں کھیلے جانے والے درجن بھر ایسے مطبوعہ اُردو ڈرامے ہیں جو گجراتی رسم الخط میں شائع کئے گئے ہیں۔ رسالہ ' نوائے ادب' بمبئی میں ان کا مقالہ شائع ہو چکا ہے۔

جےؔ دیو مصرا[1] سے حاصل ہوا تھا۔ پنڈت کودانند مصرا معروف بہ ڈلھہ مصر (डुल्लह मिश्र) نے سنسکرت زبان میں علم نجوم کی ایک معیاری کتاب 'سوریہ سیدھانت' یا 'سورج سدھانت' (सूर्य - सिद्धान्त) مصنفہ وراہہ میہیر کا ترجمہ ہندوستانی کھڑی بولی میں کیا تھا۔ پنڈتوں کے درمیان یہی زبان اُس عہد میں چلی ہوئی تھی یعنی ملوان کھڑی ہندوستانی بولی۔ پنڈت کوداننر مصر چونکہ میتھیلی تھے، لہذا اُنہوں نے میتھیلی رسم الخط استعمال کیا۔ یہ ترجمہ قریبًا دو سو[2] برس پہلے وسط اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ کسی بڑے علم دوست انگریز نے پنڈت ڈلہہ مصر کے سپرد علم کی یہ عظیم الشان خدمت کی تھی، جس سے پنڈت جی کما حقہٗ عہدہ برآ ہوئے۔ "سوریہ سیدھانت" کا مذکورہ ترجمہ ایک لپیٹے ہوئے پلندے کی شکل میں پرافسر

---

[1] پرافسر جےؔ دیو مصرا، صدر شعبہ میتھیلی، پٹنہ کالج۔ علم نجوم کی یہ کتاب 'سورج سدھانت'، سنسکرت کا ترجمہ ہے۔ جسے کوداننؔد مصرا نے کیا تھا۔ انہیں ڈلہہ مصر بھی کہا جاتا تھا۔ آپ پرافسر جےؔ دیو مصر کے لکڑ دادا تھے۔ میتھل پنڈتوں میں علوم قدیمہ کا ذوق وشوق اب تک ہے۔

[2] 'سوریہ سدھانت'، بھاشکر چارج سے بھی موسوم ہے۔ اس کے علاوہ "گرہ لاگھوا" مصنفہ برہم گپتا کا بھی ترجمہ 'کھڑی بولی' میں ہے۔ ترجمہ کوداننؔد مصرا ہی کا کیا ہوا ہے۔ غالبًا سوریہ سدھانت (सूर्य - सिद्धान्त) ۱۷۸۲ء میں لکھی گئی۔

کوداننؔد مصرا کے عہد کا تعین دوسری دستاویزوں اور مذکورہ کتاب سے بھی ہوتا ہے۔ پنڈت موصوف نے شاہ عالم (سنہ ۱۷۶۰ء تا ۱۸۰۶ء) بادشاہ کے عہد سلطنت اور شتاب رائے کی صوبہ داری کے دور میں علم نجوم کی یہ کتاب لکھی تھی۔ لکھتے ہیں:

"شری شری شری گوہر شاہ پادشاہ، شری شری شری مظفر جنگ نواب، شری شری شتاب رائے صوبہ (دار) شری شری مہاراج پرتاب سنگھ ......" (آغاز کتاب سوریہ سدھانت)

جئے دیو مصر کے پاس موجود ہے۔ یہ قدیم مخطوطات اور تصویروں کے لپیٹنے کا چینی طریقہ ہے۔ کاغذ نیپالی ہے جسے ماڑ سے لیسدار بنا کر (مَڑیا کر) سُکھایا جاتا ہے۔ اور پھر سَنکھ سے چکنا کیا جاتا ہے۔ میتھیلا علاقہ تبتیوں اور نیپالیوں کے قبضہ میں رہ چکا ہے وہاں چینی اثر کا پایا جانا تعجب خیز نہیں۔ دستاویزوں اور مخطوطوں میں ورق کے نیچے ورق چپکائے جاتے تھے اور لکڑی کے دستے میں اس طومار کو لپیٹ دیا جاتا تھا۔ "سوریہ سِدّھانت" کا ترجمہ بھی نیپالی کاغذ کے کئی اِسکرولوں میں پیش کیا گیا تھا۔ اُسی صورت میں وہ مخطوطہ آج بھی موجود ہے۔ پرافسر جئے دیو مصر کی مدد سے میں نے اس کتاب سے عبارتیں نقل کی ہیں :

"'چندر رککشا' کا پیدا اِسی کہتین ہے۔ جس روج[۱] مین بوجھنے کا ہوئے۔ تس اَپانے روج[۲] میں راتی کئے چندرا ودے کال میں چندرما کا چھایا دو آدشا نگل شنکوسین چھایا ناپنا۔ تس ہی کال مین جنتر سین چندر اسپشٹ معلوم کرنا۔ تس چندرما کا اسپشٹ کرانتی (ایک آدمی) جیا کرنا تس سین شیتی جیا لاؤنا۔ تس سین چرجیا (دوسرے آدمی) سادھنا۔ تس کا دھنو سین چَر ہوتا ہے۔ چرسین چندرما کا دنارد ھ کرنا .. .. والخ"

اور :

"سورج سِدّھانت میں بھی کہا ہے۔ شلوک ایک سرشٹی شروع[۳] سین

[۱] و [۲] روج = روز + [۳] شروع

بُرہسپتی کا جتنا بھگنز بتیا ہوئے تِس کون بارہ سین پورن کرنا۔ تِس
مین جتنا راشی میزان کرنا ۔ تِس کون ساٹھ سے بھاگ ہرتے میں سیس
بوجھنا ۔ بجئے شروع[1] جئے اوغیرا[2] گنڑنا کریکیے برہسپت کا برس
معلوم کرنا ... ..."

اور :

"جس سیب سین سوگرہ کگشا کا شٹا مارد ھ چلکرن ہے ۔ گنڑت
سے بھی چلکرن لاؤنا ۔ اس طرح سے جو چلکرن معلوم ہوا ۔ تِس کا برگ
مین دورجیا ورگ کی کرنا ۔ تِس کو جو مول سوکوٹی ہے ۔ سوجو کوٹی
سو مکراد کیندر مین کو تیجا انت پھلجیا اس دونوں کا میزان بروبر[3]
دیکھا ... ..."

معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب سورج سدھانت کا آزاد ترجمہ ہے ۔ کیونکہ
لکھا ہے کہ : "سورج سدھانت میں بھی کہا گیا ہے" یہ لفظ "بھی" قابلِ غور
ہے ۔ قرینہ ہے کہ علم نجوم کی مذکورہ کتاب سوریہ سدھانت کی بنا پر لکھی گئی ہے،
مگر ترجمہ نہایت ہی آزادانہ ہے ۔ عبارتوں کا "ریختہ پن" اور 'تت سم' شبدوں
کا بھوار ساتھ ساتھ دلچسپ اور سبق آموز ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو کے مزاج میں
'تدبھاؤ' شبد بار پائے ہوئے ہیں ۔ لیکن 'تت سم' کا قدرے استعمال ہوتا رہا ہے ۔
اگر آج اور آئندہ بھارتی اُردو میں کچھ اور ڈھب کے موزوں تت سم سنسکرت شبد

---

[1] شروع = شروع + [2] اوغیرا = وغیرہ + [3] بروبر = برابر +

سلیقے اور قرینے سے لے لئے جائیں تو سازگار ہوں گے۔ بہرکیف مذکورہ بالا تین چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں مندرجہ ذیل عربی و فارسی الفاظ[1] استعمال کئے گئے ہیں:-

پیدا۔ روز۔ آدمی۔ شروع۔ میزان۔ معلوم۔ وغیرہ۔ طرح۔ کمی۔ برابر۔ سبب +

روز، دو بار۔ معلوم کرنا، دو بار۔ معلوم ہوا، ایک بار۔ آدمی، دو بار۔ شروع، دو بار۔ میزان، دو بار، (میزان اور میزان کرنا)۔ پیدا، ایک بار۔ وغیرہ، ایک بار۔ طرح، ایک بار۔ کمی کرنا، ایک بار۔ برابر، ایکبار۔ سبب، ایک بار +

پوری کتاب میں کثرت سے عربی و فارسی لفظ برتے گئے ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے پیش ہو چکا۔ اس قیمتی مخطوطہ سے دو نتیجے نِکلتے ہیں۔ اوّل یہ کہ کھڑی بولی ہندوستانی میں 'ریختہ پن'، فطری اور عمومی رَو ہے اور اس میں 'ہندو ہندوستانی' اور 'مسلم ہندوستانی کی تفریق غلط اور فتنہ ساماں ہے۔ یوروپی تحقیق کرنے والوں اور اساتذہ نے ناحق یہ تقسیم کی اور دو طرز کے لسانی میلانوں کو فرقہ وارانہ نام دیدیئے۔ حد یہ کہ پرافسر گارساں دتاسی نے بھی[2] "ہندوستانی

---

[1] عربی و فارسی الفاظ بھی "پراکرتی رَو" سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور اُن کا بھی "تدبھاؤ" بنا ہے۔ مثلاً:

روج - شروہ - اوگیرا +

[2] خطبات گارساں دتاسی سنہ ۱۸۵۰ء تا سنہ ۱۸۶۹ء - دوسرا خطبہ ص ۶ تا ص ۱۶ -پانچواں خطبہ ص ۴۵ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) سنہ ۱۹۳۵ء -

زبان کی ہندوئی اور اسلامی شاخوں" کا فرق روا رکھا ہے۔ اگر ہندوستانی کی دو[۲] طرزوں کی انفرادیت تسلیم بھی کرلی جائے تو بھی یہ بات نامناسب اور غلط ہوگی کہ ایک کو ہندو طرز اور دوسرے کو مسلم طرز کہا جائے۔ یہ تو طے ہے کہ دونوں طرزوں میں ریختہ پن کم و بیش موجود ہوتا ہے[۱]۔ پھر اُردو زبان ہندوؤں میں بھی مروّج ہے اور ہندی مسلمانوں میں بھی۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسم الخط کے معاملے میں ہندوستانی جیسی وسیع الاثر اور ہمہ گیر زبان کو وحدانی بنانا غلط ہے۔ مذکورہ مخطوطہ میں ہندوستانی کھڑی بولی ریختہ کو میتھیلی رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے ناگری رسم الخط میں پیش کیا جائے یا فارسی رسم الخط میں یا گجراتی، مرہٹی اور گورمکھی و بنگالی میں، اس تنوع کی اجازت ہونی چاہیئے اور ہندوستانی کے دو میلانات کو انتہا پسندانہ طور پر منحرف ہونے دینا نہیں چاہیئے۔ یہی سلامتی، صحت، امن اور اتحاد کا طریقہ ہے۔

به هر رنگے که خواهی جامه می پوش

من انداز قدت را می شناسم

قبل تذکرہ ہو چکا ہے کہ معیاری اُردو زبان کی ترکیب کی دو جہتیں ہیں، کھڑی بولی کی جہت اور عربی، فارسی و ترکی الفاظ کی آمیزش کی جہت۔ عہد قدیم و عہد وسطیٰ دونوں میں بسا اوقات پر مغربی مدھ دیش کی بولیوں کا اثر پڑا اور یہاں کی بولیوں میں عربی و فارسی لفظوں کی آمیزش بھی ہوئی۔ آج بھی اس امر کا بکثرت ثبوت

۱؎ ہندی کی لغت "شبد ساگر" میں بکثرت عربی و فارسی الفاظ ہیں۔ نیز نئی۔ روسی۔ ہندی ڈکشنری میں۔

ملتا ہے کہ یہاں کی بھوجپوری، مگہی اور میتھیلی بولیوں میں عوامی حیثیت سے عربی، فارسی
وترکی الفاظ داخل وشامل ہیں اوران کا روزمرّہ استعمال ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ
نئے مہمان نہیں ہیں، بلکہ صدیوں پہلے بہاری بولیوں میں گھر کر چکے ہیں۔

میں نے بہار کے گاؤوں، بستیوں، قصبوں اور شہروں سے ایسے الفاظ جمع
کئے ہیں جو عربی، فارسی یا ترکی ہیں۔ مگر عوام کی بولیوں سے اس طرح گھُل مِل گئے
ہیں کہ وہ صوبہ کی مختلف علاقائی بولیوں اور مقامی روزمرّہ کا اٹوٹ حصّہ بَن کر
زبانِ عام پر چڑھ چکے ہیں اور جنتا کے خیالات و جذبات میں گھر کر گئے ہیں۔ ظاہر
ہے کہ یہ عمل صدیوں قبل شروع ہوا ہوگا اور یہ الفاظ اس امر کا ثبوت ہیں کہ
بہاری بولیوں میں "ریختہ پن" علاقائی لسانی تحریک وعمل ہے۔ اس عمل نے
صوبہ میں معیاری اُردو زبان کے جڑ پکڑنے میں بڑی مدد دی ہے۔ ہندوستانی
زبانوں کا "ریختہ" بننا بہت ہی قیمتی، فائدہ رساں اوریکسانیت واتّحاد پیدا کرنے
والا عمل ثابت ہوا۔ اس 'ریختہ پن' نے بھانت بھانت کی نئی ہند آریائی بولیو
کو متحد کیا، ملک کو ایک بین العلاقائی زبان بخشی، ہَمہ گیر معیاری اُردو زبان کے
پیدا ہونے میں مدد دی، ایک قومی زبان کے تصوّر کو جنم دیا اوراس کی پرورش
کا سامان بہم پہنچایا۔

اَب میں اپنے پنج سالہ لِسانی سَروے کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ اگر زیادہ
وسعت سے صوبہ میں لسانی سَروے اور تجزیہ کا کام سائنٹیفک طور پر کیا جائے لسانی
تو نتیجے زیادہ بصیرت افروز ثابت ہوں گے۔ سارے صوبۂ بہار کی بولیوں میں

تدبھاؤ شبدوں کا عمل دخل ہے اور ان سے مل کر بنی ہوئی ریختہ کا۔ عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کے ساتھ بھی اسی طرح پراکرتی عمل (PRAKRITISATION) ہوا اور پھر اَپ بھرنشوں کی سی کیفیت بھی پیدا ہوئی جیسی عہد قدیم میں سنسکرت شبدوں پر گزری تھی۔ شمالی اور جنوبی بہار کے اکثر باشندوں کی زبان کا یہی ڈھانچہ، ڈھنگ قماش اور رنگ ہے۔ چھوٹا ناگپور میں آدی باسی قبائلی بولیاں اور تدبھاؤ الفاظ سے بنی ہوئی ملوان مکھی بولی، بولی جاتی ہے جس میں عربی و فارسی لفظ بھی ملے ہوئے ہیں۔

موجودہ بہار تین حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ شمالی بہار (جو دریائے گنگا کے اُتر ہمالہ تک واقع ہے)، جنوبی بہار (جو دریائے گنگا کے دکھن چھوٹا ناگپور کی سطح مرتفع تک پھیلا ہوا ہے)، اور چھوٹا ناگپور (یعنی جنوبی بہار کے دکھن کی سطح مرتفع اور کُستان، جو اُڑیسہ تک وسیع ہیں)۔ شمالی اور جنوبی بہار میں نئی ہند آریائی بولیوں کا غلبہ ہے۔ مگر چھوٹا ناگپور میں کول ڈراور آدی باسی بولیوں کا زور ہے۔ اس کے باوجود اس علاقہ میں بھی اُردو زبان اسی ڈھنگ سے پھیلی ہے جیسے وہ دکن میں پھیلی تھی۔ حیدرآباد کا شہر تلنگانہ علاقہ میں ہے مگر وہ اُردو کا مرکز بنا۔ اسی طرح رانچی اُڑاؤں مُنڈا زبانوں کے حلقہ میں ہے، پھر بھی وہ چھوٹا ناگپور میں مرکزِ اُردو کی حیثیت رکھتا ہے۔ شہر عظیم آباد (پٹنہ) اس دیار میں شاہ جہاں آباد (دہلی) کا مثیل ہے۔ قدیم عہد میں جھارکھنڈ کا علاقہ آریائی اثرات کے تحت نہیں آیا تھا۔ شیر شاہ سوری نے اس خطہ میں ڈراور قوم (چیرو قبائل) کا زور توڑا۔ اور جہاں گیر

کے زمانہ میں چھوٹا ناگپور سلطنت دہلی کے زیر نگیں ہو کر پٹنہ کی عملداری میں آیا ۱۷۶۶ء کے بعد آریائی بولیوں کا اثر تیزی سے چھوٹا ناگپور میں پڑنے لگا۔ قربت کی وجہ سے مگہی بھاشا چھوٹا ناگپور میں پھیلی۔ شمال کے رہنے والے بھی وہاں جا کے بسے اور اپنی بولی ساتھ لے گئے۔ مقامی لب و لہجہ سے متاثر ہو کر مگہی بھاشا ہی پہلے مروّج ہوئی اور بعد ازاں کھڑی بولی ریختہ کا اثر و نفوذ ہوا۔ عہد وسطیٰ میں ہی اُردو زبان چھوٹا ناگپور پہنچ گئی تھی۔ عہد جدید میں عیسائی مشنریوں کے ذریعہ کھڑی بولی ہندوستانی کے پھیلنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ آدی باسی قبائل کے لوگ بھی اب ہندوستانی بولنے لگے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نے سہیل عظیم آبادی کو تقسیم ملک سے پہلے قبائل میں ترویج اُردو کے لئے مقرر کیا تھا۔ فی الحال رانچی، ٹاٹا نگر، ہزاری باغ چائی باسہ، پرولیا، لوہردگا، گوملا، اِٹکی، ڈالٹن گنج وغیرہ کے گرد اُردو زبان پھیل رہی ہے۔ اِن مراکز میں اُردو بولنے اور پڑھنے والوں کی بڑی خاصی تعداد موجود ہے۔ اور وہاں اُردو تحریک بھی چل رہی ہے۔

بہاری جنتا کی بولیوں میں گھلے ملے ہوئے عربی، فارسی و ترکی الفاظ درج ذیل ہیں:۔

مُلک۔ بادشاہ۔ سرکار۔ حاکم۔ رعیت۔ فیصلہ۔ داروغہ۔ جمعدار۔ منشی۔ قبالہ۔ حصّہ۔ تحصیلدار۔ تحصیل۔ وصول۔ قسط۔ مُسماۃ۔ بقلم خاص۔ خاص۔ عام۔ ناظر۔ عدالت۔ عذر۔ عذرداری۔ داخل خارج۔ جمع۔ جمع بندی۔ زمینداری۔ زمیندار۔ آبپاشی۔ گل اندازی۔ بارانی۔ چاہی

زمین - جائیداد - مزروعہ - غیر مزروعہ - تعیناتی - بحث - وکیل - مختار - جرح -
صلح - صفائی - فیصلہ - مقدمہ - فوجداری - پیشی - دیوانی - خاص محال
کاشت - کاشتکار - خود کاشتہ - مدعی - مدعاعلیہ - زمانہ - نگاہ - زور -
مضبوط - نظر - ہردم - سوال - جواب - باورچی - جہیز - بیکار -
بیکاری - ایمان - بے ایمان - قسمت - تقدیر - نصیب - پردہ - خراب -
رکاب - چابک - لگام - زین - اصطبل - عداوت - دشمن - دشمنی -
آسمان - چارخانہ - فیلبان - موزہ - پاتابہ - مکان - چہار دیواری -
حدبندی - بندوبستی - دروازہ - دربار - ناشتہ - غالیچہ - شامیانہ - قالین -
خیمہ - قنات - تکیہ - گاؤتکیہ - درباری - سرکاری - فانوس - چادر -
آرام - بیماری - علاج - خیال - پرہیز - روشنائی - تختہ - تختی -
حکیم - مؤکل - دوا - روشنی - تخت - سخت - کوشش - دری -
کم - بیش - رعب داب - بہادر - شریف - ہمت - محنت -
مزدوری - مزدور - انقلاب - دانہ بندی - عبا قبا - جامہ - آئین -
قانون - سلامت - حلوہ - انتظام - آباد - پاندان - قورمہ -
قلیہ - پلاؤ - قاب - طشتری - دیوارگیر - خوگیر - کفگیر -
بارہ دری - سینہ - بازو - دستی - سر - پاجامہ - شیشہ - آئینہ -
قلم - دوات - کاغذ - کتاب - دفتر - جلد - دریچہ - دریچی - دستخط -
دستاویز - وکالت نامہ - عرضی دعویٰ - دعویٰ - دائر - مزاج - معافی

قبول - قبولیت - انصاف - منصف - قبضہ - تیر - تلوار - دخل -
دہانی - بیع - بنام - عرض - گذار - گواہ - گواہی - دوست
خواب - خوب - شان - فقیر - صورت - شکل - خوبصورت -
بدصورت - نام - بدنام - دوست - زلزلہ - آوارہ - خرچ - تماشہ -
چشمہ - قمیص - ازار - ازاربند - اجارہ - اجارہ داری - خاکی -
بادی - قرض - شیرنی - سایہ - نشان - پتہ - پنجہ - ناخن -
کُشتی - کِشتی - تباہ - برباد - خطرہ - خطرناک - جان - شبہ -
فکر - مدد - مددگار - بندوق - صندوق - خورش پوشش - خیرات -
مرد - عورت - مردانہ - زنانہ - بچہ - حرام - مال - عجب -
تعجب - گناہ - ثواب - عزّت - عملہ فعلہ - بے عزّتی - عملداری - معاملہ -
قافلہ - سروکار - پیروی - شاباش - بدمعاش - بدمعاشی - ثبوت - چراغ -
شیخی - زہر - باغ - گلزار - غلّہ - ربیع - شیر - زبان - بیان
تحریر - تحریری - طوفان - دنیا - جہان - پرچہ - پُرزہ - پَر - حَرج
حرجانہ - سبز - سُرخ - نقارہ - چالاک - چالاکی - چُست - قلعہ - پیوند
پابند - پابندی - فریاد - آبادی - فریادی - فصل - دوکان -
دوکاندار - خرید - خریدنا - اقرار - اقرارنامہ - سردار - سرداری
دوستی - دریا - سمندر - سردی - سَرد - گرمی - گرم - نرم - بستر
محل - مسجد - تازہ - سرا - حُقّہ - نان بائی - حوض - کمال -

حملہ - زخم - مرہم - مہمان - میدان - خاصدان - انسان - حیا -
شرم - سامان - گلدان - دربان - پاسبان - مزہ - مزہ دار - تر
خشک - خشکی - تری - پوشاک - خوراک - خوراکی - خزانہ - خزانچی
بندوقچی - وزیر - بادشاہی - بیگم - حکم - احکام - ہوشیار - ہوشیاری
قول - قرار - بےقرار - بےقراری - دل - بزدل - خوش - خوشی -
راضی - رضامند - غم - غمی - مردہ - زندہ - قبر - کفن - آتشبازی -
شکار - میرشکار - نشانہ - نذرانہ - بیعانہ - چادر - غلاف - چارپائی -
قسم - قسم - درد - بےدرد - پسند - ناپسند - سپاہی - موضع - ضلع -
ساکن - رسید - سکونت - خرابی - شرابی - جایز - ناجایز -
نازک - قطار - فرصت - تلاش - تلاشی - نالش - ثالثی - جرمانہ
خواہش - گردش - گرد - سفید - سفیدی (چونا) - گردانی - محبت
نفرت - جوان - جوانی - بیوہ - سادہ - ارادہ - مہتابی - جلد -
جلدی - شریک - شریک دار - غریب - امیر - غریبی - امیری - ناراض -
سزا - حساب - پروانہ - قرق - قرقی - چاقو - بدہضمی - شادی -
برادری - مقام - صبح - شام - درخت - روزگار - درجہ - زبردستی
مالک - جہیز - تاریخ - ملاحظہ - شوق - شوقین - صحیح - غلط -
غلطی - کاروبار - بد - بدی - غلام - غلامی - آزادی - داغ - ذکر -
جگر - جگری - یار - بہار - دماغ - شہر - دیہات - دیہاتی - سوار -

پیادہ ۔ قینچی ۔ حصّہ ۔ حصّہ دار ۔ حصّہ داری ۔ شروع ۔ گزارہ ۔ اندر ۔ ظالم ۔
ظلم ۔ غضب ۔ حال ۔ حالت ۔ طور ۔ طریقہ ۔ راہ ۔ اثر ۔ معلوم ۔ ہزار ۔
مزار ۔ گرفتار ۔ بازار ۔ گرفتاری ۔ بازاری ۔ مقابلہ ۔ استعفیٰ ۔ طرح ۔
موسم ۔ قیمت ۔ سفارش ۔ خیریت ۔ خبر ۔ خط ۔ اخبار ۔ بدل ۔ افسوس ۔
طرف ۔ طرفداری ۔ علاقہ ۔ قصور ۔ حضور ۔ ضرور ۔ نشہ ۔ زندگی ۔ تیز ۔
چہرہ ۔ نقشہ ۔ جاہل ۔ رنگ ۔ مطلب ۔ غرض ۔ نبض ۔ قارورہ ۔ تنگ ۔
تنگی ۔ نواب ۔ نوابی ۔ لفافہ ۔ لحاف ۔ توشک ۔ جہاز ۔ دقّت ۔ سفر ۔
پریشان ۔ پریشانی ۔ حیران ۔ حیرانی ۔ میراث ۔ درخواست ۔ ترقّی ۔
دُور ۔ نزدیک ۔ ختم ۔ آخر ۔ بخار ۔ علم ۔ رحم ۔ دوامی ۔ نامی ۔
گرامی ۔ روز ۔ مستی ۔ سُستی ۔ سُست ۔ ترازو ۔ کبوتر ۔ باز ۔ سُرخاب ۔
مرغابی ۔ تیّار ۔ تیّاری ۔ صوبہ ۔ مُلکی ۔ گلاب ۔ گلابی ۔ شراب ۔ کباب ۔
زردہ ۔ ضمانت ۔ کارخانہ ۔ مشاہرہ ۔ درماہہ ۔ صد ۔ صدی ۔ شوخ ۔
شوخی ۔ مشعل ۔ قلعہ ۔ سُرمہ ۔ نقصان ۔ محلّہ ۔ نتیجہ ۔ باقی ۔ اختیار ۔ اجازت ۔
حاضر ۔ حاضری ۔ غیرحاضر ۔ غیرحاضری ۔ تماشہ ۔ نازک ۔ نادان ۔ نیک ۔
نیکی ۔ تکلیف ۔ صحبت ۔ پاک ۔ ناپاک ۔ عیب ۔ ہُنر ۔ عیب دار ۔ بےعیب
بےعزت ۔ عزت دار ۔ شرم ۔ بےشرم ۔ مزاج ۔ مشکل ۔ آسان ۔ آسانی ۔
نصیحت ۔ فضیحت ۔ تقدیر ۔ قسمت ۔ ہوش ۔ حواس ۔ تدبیر ۔ نگاہ ۔ بیہوش ۔
مصیبت ۔ سال ۔ تنخواہ ۔ آہ ۔ خواب ۔ دماغ ۔ نوبت ۔ نتیجہ ۔

عمر - سن - خط - فصد - فصدی - خزانہ - خزانچی - زندگی - وغیرہ وغیرہ۔

صوبۂ بہار میں قدیم اُردو کے نمونے حضرت شیخ شرف الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ کے عہد سعید سے ملتے ہیں - حضرت ۶۶۱ھ میں بمقام منیر (ضلع پٹنہ) پیدا ہوئے اور ۷۸۲ھ میں بہ مقام بہار (ضلع پٹنہ) انتقال فرمایا [1] تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی اور بیعت دِلّی جا کر حاصل کی تھی - ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں جن میں بعض بیماریوں کی مجرب دوائیں بتائی گئی ہیں [1] ؎ [2] ابتدا میں سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کے مرید ہونے کی نیت سے ۷۲۵ھ میں دہلی آئے - لیکن اس وقت تک اُن کا انتقال ہو چکا تھا - آخر دہلی میں شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے - بہار جا کر مدتوں کوہِ راجگیر میں ریاضت و عبادت میں مشغول رہے، ۷۸۲ھ میں وفات پائی - اور میر اشرف جہانگیر سمنانی نے نماز جنازہ پڑھائی - تصنیفات کے کے سلسلہ میں آپ کے ملفوظات و مکتوبات موسوم بہ معدن المعانی، کتاب ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین، مشہور ہیں - شرف نامہ [3] احمد منیری ابراہیم بن قوام فاروقی نے آپ ہی کے نام پر سلطان باربکشاہ ۸۶۲ھ و ۸۷۹ھ والی بنگالہ

---

[1] نقوش سلیمانی : علامہ سلیمان ندوی، ص ۴۹-۴۸

[2] پنجاب میں اُردو : پرافسر محمود شیرانی، ص ۱۴۵-۱۴۴ - نیز مکتوبات صدی -

[3] " " " " " ص ۲۱۵ مولانا ابراہیم فاروقی، بنگالہ کے رہنے والے تھے - یہ فرہنگ انہوں نے بڑی محنت سے تالیف کیا تھا - اس میں عربی، فارسی الفاظ کے ہندی مرادف الفاظ دیئے ہیں -

کے عہد میں لکھا ہے "شیخ شرف الدین بہاشاہیں بھی شاعری کرتے تھے ۔ اور شرف آپ کا تخلص تھا" حضرت مخدوم سے کئی فالنامے "کج مندرے"، نسخے، نقش، اور طلسمات منسوب کئے جاتے ہیں ۔ ان سب کے متعلق قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ حضرت مخدوم کے قلم یا زبان سے نکلے ۔ لیکن قرائن یہی کہتے ہیں کہ ملفوظات اور بیاضوں میں جو آپ کے نام سے کلام درج ہیں وہ کسی نہ کسی حد تک ضرور حضرت شرف الدین احمد بہاری کے ہی ہیں ۔

"معدن المعانی حضرت کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ۔ جس کو ان کے مرید زین بن بدر عربی نے ان کی زندگی ہی میں لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا ۔ یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں بہار کے مطبع شرف الاخبار میں چھپی تھی ۔ اس کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۲۰۳ میں مذکور ہے کہ حضرت اور اُن کے ایک رفیق خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی میں گفتگو ہو رہی تھی ۔

"ہم درین محل جلال الدین مذکور گفت کہ بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است ۔ 'باٹ بھلی پر سانکری'، بعد از آں بندگی مخدوم عظمہ اللہ بر زبان مبارک راند، "دیس بھلا پر دور"۔ [۱]

---

[۱] 'بہار میں اُردو' سلیمان ندوی' ندیم، گیا، بہار نمبر، ۱۹۳۳ء

[۲] 'نقوش سلیمانی' " " ص ۴۹-۴۸ ۔ بحوالہ معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار، ۱۸۸۴ء، مطابق ۱۳۰۱ھ، جلد اوّل' ص ۲۰۳ ۔ اور 'قرون وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت' پروفیسر سید حسن عسکری، سالنامہ ساتھی، پٹنہ، ستمبر ۵۲ء، ص ۴۹ +

پرافسر حسن عسکری اس طرز کے حوالوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان کی "صداقت میں شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں"

باٹ بھلی پر سانکری = راہ اچھی پر تنگ ۔ شادی بیاہ کی گیتوں میں سانکری رے گلیا ، بمعنی 'گلی تنگ ہے ۔ آج تک بہار کے مسلمان گھرانوں میں بھی مستعمل ہے ۔ 'دیس بھلا پر دور' کی ترکیب میں ندبھاؤ شبدوں کے ساتھ 'دور' فارسی لفظ کی آمیزش قابل مطالعہ ہے ۔ بہار میں 'ریختہ' بن چکا تھا اور یہ رَو رفتہ رفتہ آگے بڑھ رہی تھی ۔ علامہ ندوی فرماتے ہیں ۔" اس وقت تک ایک متحدہ زبان کا قالب تیار ہو چکا تھا" (ندیم ، بہار نمبر ۱۹۳۳ء)

ایک دفعہ معمول کے مطابق حضرت مخدوم بہاری شب گشت کر رہے تھے تو انہیں کسی گاؤں کے قریب رات گذارنے کے لئے پوال سے بدن ڈھانکنا پڑا ۔ جب گاؤں والوں نے آپ کو شبہ پر پکڑا تو آپ نے فرمایا :

"دو منھو ترک چھنّو نا بھاتی" [۱]

یعنی 'دو مجھ کو چھوڑ ، تنگ ہونا نہیں بھاتا' ۔

اس جملہ کی ترکیب نہایت توجہ کش ہے ۔ 'دو منھو ترک' ، میں فارسی ترکیب کی پیروی ہے یعنی فعل پہلے ہے ۔ اردو میں اوّل اوّل یہی وضع تھی ، جو فارسی اثر کے تحت دیر تک قائم رہی ۔ اور ہندی بھاشاؤں کی ترکیب سے اُسے ممیز کرتی رہی ۔

---

[۱] 'قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوّف کی تاریخی اہمیت' ۔ از پرافسر سید حسن عسکری ، سالانہ ساتھی ، پٹنہ ، ستمبر ۱۹۵۲ء ۔ بحوالہ 'گنج رشیدی' ، ملفوظات صوفی جونپوری حافظ دیوان عبدالرشید ۔

گریرسن[1] نے بھی اُردو اور ہندی کے اس فرق کو بیان کیا ہے۔ لیکن جدید اُردو میں یہ فرق باقی نہیں رہا۔ دوسری بات یہ کہ حضرت مخدوم کے اس جملے میں بھی 'ریختہ پن' موجود ہے۔ یعنی لفظ 'ترک' کا استعمال جو عربی ہے۔

اُوپر کی مثالوں کے علاوہ اندرون صوبہ اور بیرون صوبہ کی مختلف بیاضوں میں حضرت مخدوم بہاریؒ کا کلام ملتا ہے۔ مثلاً:

فالنامہ:۔ دس[2] چار کچھ اگم آوے آٹھ پانچ پھل مانگے آوے
تین اگیارہ بنھچے راج نوسو سترہ کرے اکاج

اس کے علاوہ آپ کا ایک شعر یہ بھی ہے: ؎

[3] شرفا گور ڈراون نس اندھیاری رات
وان نہ پوچھے کون تمہاری جات

---

[1] 'لنگوئسٹک سروے آف انڈیا' گریرسن، جلد نہم، حصہ اوّل ص۴۷۔

[2] و [3] 'بہار اور اُردو شاعری' از پرفیسر محمد معین الدین دردائی (علیگ) ص۱۳ بحوالہ ملفوظات خاندانی قلمی

سید شاہ نجم الدین نجم دردائی صاحب خسرو سے پہلے کے ایک بہاری شاعر کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"ناصر الدین اور اس کے بیٹے معز الدین کیقباد کی جنگ کے حالات کو حضرت خسرو سے بہت پہلے ایک بہاری شاعر نے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ قلم بند کیا تھا۔ خسرو کی قرآن السعدین ہر جگہ مشہور ہے۔ لیکن غریب بہاری شاعر کا بھی ایک شعر یاد ہے ؎

منکی اوجڑی نگری کو تب کریں آباوان
ناصر دیں سے جب ملیں موجدین کیا دان"

('بہار اور اُردو شاعری' از محمد معین الدین دردائی ص۱۲)

'پنجاب میں اُردو' میں حضرت مخدوم بہاری کا جو 'کچھ مندرہ' درج ہے۔ اِس کے اہم ٹکڑے حسب ذیل ہیں :

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط اَللّٰھُمَّ صلِ علیٰ محمدؐ و آلِ محمدؐ .. ..

.. .. کرتا .بیدن ہرتا وہی ایک سرجن ہار ....

.. ..جوک مورت میں تُمہیں ساکھی دہرت ہوں ۔جو کچھ فلانے کے پنڈ پران میں ہُوی ، راہ کا ، باٹ کا ، کوّے کا ، پوکھر کا ، اندہیاری کا ، اُجیالی کا ، چوٹ کا ، پھیٹ کا ، کئے کا ، کرائے کا ، بیھجے کا ، بھجائے کا ، لانگھے کا ، اُلکھین کا دیو داو بُھوت پلیت راکس بھوکس ، ڈائن ڈکن سکھن کچّن چوڑیل میل ملان جان بھوان .. .. گلٹی پھرکی باؤ گولا ، سرخ باد سبز باد ، سیاہ باد ، زرد باد و ہفتاد دو باد ہر بادے کہ باشد در وجود فلاں جن آپکار دہس ہے دوہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی جل بھسمنت ہو بیک بلا جائے ، بیک بلا جائے .. ..

.. .. .. سراپ جی جی کرنت تی تی مرنت .. ..

کالا ہنسا نرملا بسے سمندر تیر

پنکہ پسارے بکہ ہرے نرمل کرے سریر درد لہے نہ پیر

بحق لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ این دوہرہ راسہ بار بخواند "

شرف حرف مایل کہیں ورد کچھو نہ بسائے
گرد چھویں دربار کی سو درد دور ہو جائے[1]

پرافسر محمود شیرانی لکھتے ہیں: "رقعہ مندرجہ اس عہد کی اُردو کا بھی ایک اچھا خاصہ نمونہ ہے" (پ ا صـ۱۴۴) رقعہ مندرجہ میں عربی فارسی عبارت کے علاوہ ہندوستانی عبارت کے اندر اور دوہروں میں بھی 'ریختہ پن' موجود ہے۔ مثلاً 'فلانے'۔ 'راہ'۔ 'جان'۔ 'بلغم'۔ 'فلاں'۔ 'بن'۔ 'پیغمبر'۔ 'ورد'۔ 'حرف' 'گرد'۔ 'دربار'۔ 'دور'۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شرف الدین احمد بہاری کے عہد میں اُردو زبان کی بُنیاد قائم ہو چکی تھی۔ "آپکا ر دہس ہے دو ہائی سلیمان بن داؤد پیغمبر کی" کے جملے میں "دہس" بہاری زبان کی خاص علامت ہے۔ 'دہس ہے' بمعنی 'دی ہے'۔ یا 'دیا ہے'۔ دوسری اہم بات "ہے" کا استعمال ہے۔ فعل[2] "ہے" کھڑی بولی کی خصوصیّت ہے۔ یہاں اس کا استعمال اہمیّت سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ اُردو کی پہچان ہے۔

"دیسنہ، ضلع پٹنہ کے کتب خانۂ اصلاح میں ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہیں .... اس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم

---

[1] 'پنجاب میں اُردو' از پرافسر محمود شیرانی: صـ۱۴۴ تا صـ۱۴۶۔ بحوالہ بیاض مملوکہ' مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار۔ نیز 'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام' صـ۲۰

[2] 'قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوف کی تاریخی اہمیت' پرافسر سید حسن عسکری: ساقی، سالنامہ، ستمبر ۵۲ء صـ۴۹۔ عسکری صاحب کے نزدیک "ہے"۔ دوسری آپ بھرنشوں میں نہیں پایا جاتا۔ اور یہ لفظ کھڑی بولی، میں فارسی سے آیا ہے ؎ ساقی اگرت ہولے مے ہے ۔ جز بادہ میار پیش ملتئے۔ (حافظ شیرازی)

کی طرف کی گئی ہے، اس میں کُل ستائیس فقرے ہیں۔ جن میں سے بعض یہ ہیں "
(نقوش سلیمانی : سلیمان ندوی ص ۴۹)

۱۱۱ جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی۔

۱۱۳ ناہیں کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے۔

۱۳۱ ایہین، ابھین ناہین۔

۳۱۱ ابھین ناہین، سوت رہو جائے۔

۲۳۳ ناہین ہیگا اور کام کرو۔

۳۳۱ راج پاٹ اچل کے دیا تمکون۔

۲۳۲ آگے برے دن گئے اب سُکھ پاوہ گے۔

۲۳۲ ابھین ناہیں آگو ہو چکا۔

مجھے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں کتب خانہ خانقاہ بلخیہ، فتوحہ، ضلع پٹنہ میں ایک اور فالنامہ ملا۔ یہ بھی حضرت مخدوم بہاریؒ سے منسوب ہے۔ یہ حضرت میر جعفر حسین رحمۃ اللہ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ سَنہ کتابت ۱۰۹۷ھ۔ حضرت جعفر کی مزار باڑھ، ضلع پٹنہ میں ہے۔ جناب سیّد شاہ تقی حسن صاحب بلخی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوحہ کے پاس اور کئی قیمتی ملفوظات و مخطوطات موجود ہیں۔ فالنامہ حضرت مخدوم بہاری کے فقرے اور جملے حسب ذیل ہیں :

ناھیں کیوں کرہو، نصیب لاگی بات

ناھیں ابھین، ناھیں ابھین کچھ

جو مَن چنتا ہو، سُستی پاؤگی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

علامہ سلیمان ندوی نے شفاء الامراض، حکیم محمدی دیسنوی مرحوم کی قلمی نسخہ (دیسنہ) کے حوالہ سے حضرت مخدوم کے ہندی دوہے نقل کئے ہیں[۱] ۔

لودھ پھٹکری مرداسنگ ہلدی زیرا ایک ایک ٹنک
افیون چنہ بھر مرچیں چار ارد پھر موتھا اس میں ڈار
پوست کی پانی پوٹلی کرے نینا پیرا پل میں ہرے

تلاش و جستجو سے حضرت مخدوم بہاری کا اور کلام بھی مل سکتا ہے ۔ مگر قطعیت کے ساتھ ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ من وعن حضرت کا کلام ہے ۔ پروفیسر حسن عسکری ایک ایسے دوصد سالہ قلمی نسخہ کی اطلاع دیتے ہیں ۔ جو ہندی میں ہے اور محفوظ پایا گیا ہے ۔ اس نسخہ میں بھی حضرت مخدوم کا کلام ملا ہے ۔

حضرت مخدوم شرف الدین احمد بن یحیٰ[۲] (منیری) بہاری کے ارشد خلفاء میں حضرت مظفر شمس بلخیؒ اور حضرت منہاج راستی پھلواروی بہار کے اَجلّ صوفیوں میں سے گذرے ہیں ۔ حضرت بلخیؒ ۷۸۲ھ میں اپنے پیر حضرت مخدوم بہاری کے وصال کے بعد سجادہ نشین

---

۱ نقوش سلیمانی : ندوی، ص۴۳

۲ 'بہار اور اردو شاعری' میں پروفیسر معین الدین دردائی نے اس نسخہ کو یوں لکھا ہے :

لودھ پھٹکری مردارسنگ ہلدی زیرا اک یک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں چار ارد برابر تھوتھا ڈال
پوست کے پانی میں پوٹری کریں آنکھ کے پیرا ترتے ہریں

ہوئے۔ آپ کا انتقال ۸۰۰ھ میں ہوا۔

حضرت بلخیؒ کی پیدائش غالباً ۷۲۵ھ میں ہوئی تھی۔ آپ کی تصنیفات اور ملفوظات بہت ہیں۔ سو کے قریب آپ کے مکاتیب ملتے ہیں جنہیں مولوی عبدالرحمٰن بہاری نے ترجمہ کرکے مع متن طبع کرانا چاہا تھا۔ تیئس ۲۳ مکاتیب طبع بھی ہوئے۔ بقیہ قلمی مکاتیب مع ترجمہ پرافسر معین الدین دردائی[1] کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ آپ کا ایک مطبوعہ دیوان فارسی بھی ملتا ہے۔ مکتوبات مظفر شمس بلخیؒ کتب خانہ مشرقیہ خدا بخش خاں بانکی پور میں بھی ہیں۔ جناب حکیم تقی حسن صاحب بلخیؒ، فتوحہ (ضلع پٹنہ) کے کتبخانہ میں بھی حضرت مظفر بلخیؒ اور شاہ یداللہ (۸۵۳ھ) کے ملفوظات موجود ہیں۔

حضرت مخدوم بہاری کے انتقال کے بعد حضرت مظفر بلخیؒ نے خواب میں آپ کو فرماتے ہوئے سُنا۔

"آئیں رات سُہائیاں، جن کارَن ڈھئیاں کھائیاں"[2]

یعنی "وہ سُہانی راتیں آ گئیں جن کے لئے میں نے اتنے دھکّے کھائے"

(مونس القلوب)

{حضرت مظفر بلخیؒ کے پرپوتے، حضرت احمد لنگر دریا بلخیؒ کی تصنیف۔}

حضرت بلخیؒ کا ایک دوہہ پرافسر دردائی نے نقل کیا ہے:

---

[1] "بہار اور اردو شاعری"، پرافسر معین الدین دردائی، ص۱۳۱ و ۱۳۲

[2] قرونِ وسطیٰ کے بہار میں اسلامی تصوّف کی تاریخی اہمیت، پرافسر حسن عسکری۔ سالنامہ "ساتھی"، پٹنہ، ستمبر ۱۹۵۲ء، ص۴۹ اور پٹنہ یونیورسٹی جرنل جلد دہم ص۶۶

[1]سجّی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں
جن کے کارن تھے بہت دن سو بنائیں گتیاں

بہار کے صوفیا کی بول چال میں کھڑی بولی کا عنصر نمایاں ہوتا تھا۔ لیکن اُن کی بھاشا کی شاعری مِلی جُلی اَپ بھرنش میں ہوتی تھی۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

دوہہ — [2]آمی کوَنَ تنِ پنکھروا جنگل کر نہہ اُداس
کنکر چُنہہ جَل بنہہ دھنی نہ چھود نہ پاس

دیگر — [3]جیٹھ اساڑہ نہ آییا باتاں بھر ہریا نہہ
تی بھیری بسار دہن تھکی جلتھلنا نہ

پہلے دوہے میں بنگالی اور پوربی (اودھی و بہاری) اثر موجود ہے۔ دوسرے میں پنجابی اثر بہاری اَپ بھرنش کے ساتھ آمیز ہے۔

دوہہ — [4]باٹ بھلی پر سانکری، نگر بھلا پر دور ٭ نانہہ بھلا پر یا تلا ناری کر ہر چور

دیگر — [5]سانکر کوئی تبتال پانی لاکھنہ بوند لکائی ٭ بجر پر واتھہ متھر انگری کا نہہ پیاسائی

دیگر — [6]کہا یون آپن گھر تتیھر کہا یون نست بہتار ٭ بیچ بلندیا گھر چوہی بوند پری نہنہار

دیگر — [7]جالوں تور چلکیں جالوں بکَٹ کتار ٭ جبین سروٹ سوتش سایہین بہنسار

خدا بخش خاں کی لائبریری کے علاوہ مولانا تقی بلخی کے پاس بھی مکتوباتِ مظفر شمس بلخی کا ایک نسخہ موجود ہے۔ اُس میں بھی یہ دوہے ہیں۔

---

[1] بہار اور اُردو شاعری: دردائی، ص ۱۴۔ [2] و [3] مکتوبات حضرت مظفر شمس بلخی، کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ، مکتوب نمبر ۱۷۳؛ سنہ کتابت ۱۱۵۰ھ۔ [4]، [5]، [6]، [7]۔ مکتوب ۱۷۲، کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ۔ نیز د شمالی ہند کے صوفیائے کرام کی ہندی دوستی، معاصر، پٹنہ حصہ ۴ از سید حسن عسکری۔

حضرت بلخیؔ اپنے ایک سو اکیسویں[۱۲۱] خط میں فلسفۂ عشق و جان سپاری سے بحث کرتے ہوئے ایک واقعہ کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ واقعہ مختصراً یوں ہے کہ ایک "کماچی" حضرت مخدوم بہاری کے سامنے اپنے "کماچہ" پر تماشہ دکھلانے لگا۔ اُس نے ایک دوہرا گایا۔ حضرت کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دوہرا یوں ہے:

ایکٹ کنڈی بیدھا بھوتر بھر کہ کائن
جتاہین رنجیا مرن تتھی نہائن

(مکتوب صد و بست و یکم۔ در مُردن بکوئے دوست۔ بجانب مولانا کریم الدین۔ مکتوب حضرت بلخیؔ۔ کتب خانہ مشرقیہ، بانکی پور۔)

حکیم تقی حسن بلخی فتوحہ کے مملوکہ نسخے میں دوہرا کا پہلا مصرع یوں ہے:

ایکٹ کنڈی بیدھا بھوتر بھر کے کائن

اِس دوہے سے اس عہد کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے اور صوفیوں کے مذاق و مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔

حضرت بلخیؔ کے ہم عصر صوفی حضرت سید احمد چرمؔ پوش بہاری کے فقرے بھی ملفوظات میں ملتے ہیں۔ آپ زاہد و پارسا کا فرق بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میتا[۱] من نمو نیہ شرومنی کہا ہوئے۔ اینہیں بیدھا بیدمان میاں سر نہ کینی کوئے" (ضیاء القلوب)۔

---

[۱] 'اردو ہندی زبانیں': سید حسن عسکری، معاصر جلد ۲ حصہ ۶۔ اپریل ۱۹۵۴ء۔ پٹنہ +

پٹنہ یونیورسیٹی کے شعبۂ مخطوطات میں ایک گرانقدر مخطوطہ[1] کتاب 'مناقب محمدی' کا ہے۔ یہ کتاب حضرت سید محمد امجھری کے مناقب میں ہے۔ آپ سید درویش محمد قادری الجیلانی کے فرزند تھے۔ حضرت امجھری کے مرید خاص علی تنبہر شیرازی القادری نے یہ کتاب لکھی تھی۔ اس میں حضرت سید محمد امجھری کے بغداد شریف سے امجھر تک کے سفر کے حالات ہیں۔ آپ نے بڑی لانبی عمر پائی، غالباً ایک سو بیس[12] برس۔ تاریخ وفات ۹۴۰ھ، ربیع الاول، روز جمعہ ہے "سال تاریخ رفتنش 'عشق ست'"۔ مناقب میں حضرت سید محمدؐ کا ایک جملۂ ہندوستانی بھی درج ہے۔ اور وہ یہ ہے:

"نہ مانا بھیو اینھا نرہنا ہوا"

مناقب محمدی میں سوانح نگار اپنے پیر و مرشد کے ذوق و شوق تبلیغ اور اس راہ میں مصائب برداشت کرنے کا تذکرہ لکھتے ہوئے بہار کے حاکم دریا خان کی سیاسی مصلحت اندیشیوں کی وجہ سے ایک مظلوم مسلمان کی فریاد سننے سے انکار کا ذکر کرتا ہے۔ حضرت سید محمد نے کول سرداروں اور گوالوں میں تبلیغ اسلام کیا تھا۔ گوالوں کے ایک نومسلم سردار کا نام صادق رکھا گیا تھا۔ حضرت گاؤں گاؤں دورۂ تبلیغ فرماتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے اور وہاں مرکز بنا کر خدا کا پیغام اکمل پہنچانے لگے۔ قادری بزرگ کی کرامت کا شہرہ سن کر حاکم نے آپ کے لئے کوشک و خانقاہ تعمیر کروا دی۔ مگر اس بے لوث و سخت کوش خدا کے بندے کو

---

[1] نمبر ۱۱۸، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، حصۂ مخطوطات۔ اس مخطوطہ میں لکھا ہے "از دست سید غلام حیدر تحریر گشت، بتاریخ نوزدہم ربیع الثانی مطابق ہفتم ماہ بہادون ۱۲۴۲ فصلی۔"

یہ آرام و آسائش پسند نہ آئی۔ اور آپ نے اس جگہ کو چھوڑنے کا ارادہ فرمایا۔ مناقب محمدی، میں شیرازی لکھتا ہے۔

"ہمدریں صادق در رسید و گفت۔ سید ایں چنیں کوشکہا آراستہ و پیراستہ گذاشتہ چرامی روی۔ او کہ ہندی بود و نیز فہم و فراست نہ داشت از آں اورا آنحضرت ہم بزبان ہندی ہمیں قدر فرمودند۔ 'نہ مانا جیو اینہا نرہنا ہواۓ از آں روز نام آں جنگل 'چشمۂ نرہنا' اُفتاد۔" باب دوازدہم ص۵۷

حضرت سید محمدؒ نرہنا سے اُمجھر (ضلع گیا) تشریف لے گئے اور وہیں وصال ہوا۔ یہ واقعہ غالباً ۸۴۶ھ کا ہے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے ایک جلیل القدر بہاری[۱] صوفی حضرت ابوالفیض قاضن بن علا بن عالم ترہتی ثم المنیری الہاشمی جنہوں نے حضرت عبداللہ شطاری سے مانڈو میں ۲ ذی الحجہ ۸۱۸ھ کو خرقۂ خلافت پایا اپنے ملفوظ معدن الاسرار میں حضرت سید جلال بخاری علیہ رحمت المشہور بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت (متوفی ۷۸۵ھ) کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔

"کھندا ہے پھندا کہاں"

۱۔ آپ بنیا بساڑھ، ویشالی (حاجی پور) کے رہنے والے تھے۔ 'معدن الاسرار' کے دو نسخے پھلواری شریف میں ہیں۔ ایک قدیم اور دوسرا اٹھارویں صدی کا۔ سالنامہ ساتھی، پٹنہ، ستمبر ۱۹۵۲ء۔ ومعاصر، پٹنہ جلد ۲، حصہ ۶۔ اپریل ۱۹۵۴ء۔ ومعاصر حصہ ۴۔ مقالات از پرافسر سید حسن عسکری (کھجوہ) پٹنہ کالج۔

ایک شخص نے مخدوم جہانیاں سے یہ سوال کیا کہ آخر کیا بات ہے کہ جب میں عبادت کرتا ہوں تو میری دُعائیں اتنی مؤثر نہیں ہوتیں جتنی مخدوم موصوف کی تو حضرت نے جواباً فرمایا: "کھندا ہے، پھندا کہاں" حضرت قاضی مانڈو سے آگے نہیں بڑھے اور سید جلال رحمۃ اللہ دہلی تک آئے اور پھر اوچہ واپس تشریف لے گئے۔ لیکن ان دور اُفتادہ بزرگوں کی زبان سے ہندوستانی بولی کا ایک جملہ متفقہ طور پر ادا ہوتا ہے۔

انگریزوں کی عمل داری کے بعد جو دور آیا اُس میں زبان اُردو کو بہار میں بڑی عمومیت حاصل ہوئی۔ امن کے قیام کی وجہ سے متحدہ ہندوستانی تہذیبی زبان یعنی اُردو مقبول خاص و عام ہونے لگی اور اس میں مذہب و ملّت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔

پٹنہ کمشنری کے ریکارڈوں میں جناب فصیح الدین بلخی اور جناب قیام الدین احمد ریسرچ فیلو جیسوال انسٹیٹوٹ کی کوششوں سے نہایت قیمتی دستاویزیں ملی ہیں۔ یہ دستاویزیں اُردو میں ہیں اور رسم خط بھی اُردو ہے۔ ان سے سرکاری کاموں میں اُردو کا عام استعمال ثابت ہوتا ہے۔ اور اُس عہد کی اُردو زبان کا حال معلوم ہوتا ہے۔ قدیم ترین دستاویز ۱۸۳۹ء کی ہے۔ میں ۱۸۶۴ء تک کے نمونے درج ذیل کر رہا ہوں۔

(۱) مندرجہ ذیل درخواست بیچن لعل کارپرداز و مختارِ عام نے مہاراجہ دھیرج نرائن بہادر (برادر مہاراجہ رام نرائن لعل) کے ورثا کی طرف سے سرکارِ انگلشیہ میں تاریخ ۲۲ اپریل ۱۸۳۹ء پیش کی۔

"غریب[1] پرور سلامت !

مواضعات نورن وغیرہ متعلقہ کنکولی پرگنہ شہسرام ضلع شاہ آباد ملکیت مہاراجہ دھیرج نرائن مقبوضیت رائے ہزاری لعل مورث آقائے فدوی کا بذریعہ قانون دوم کے ضبط ہوا اور بندوبست سرسری اُس کا ساتھ بے علاقگان کے ہوا ۔ بامید حصول بندوبست دوامی مواضعات مذکور آقائے فدوی کارپرداز حضور میں صاحب مہتم بندوبست و کارپرداز مذکور بحالت بیماری کے کمال مبتلا ہو کر چلا آیا و ظاہر و دریافت ہوا کہ بندوبست دوامی اس کا ساتھ رائے ہرنرائن بشرط منظوری حضور و صدر بورڈ کے عمل میں آیا ۔ مسل واسطے منظوری کے صاحب مہتمم بندوبست بھیجا ہے ۔ موکل فدوی کا جو کچھ استحقاق بہ نسبت حقیت ملکیت مہاراجہ دھیرج نرائن و مقبوضیت رائے بنواری لعل متوفی کے ہے موافق دفعات مندرجہ ذیل کے التماس کرتا ہے ۔ اوّل یہ ہے کہ دستاویزات مندرجہ ذیل واسطے ثبوت وراثت و استحقاق ملکیت کے ہے ....

(۱) کرسی نامہ

(۲) چھٹیاں سکریری بموجب کونسل بخط انگریزی دربارے تعیّن مشاہرہ

(۳) ترجمہ چھٹی مذکور بخط فارسی ۔

---

[1] "معاصر" حصہ ۳ - پٹنہ - دسمبر ۱۹۵۲ء - قیام الدین احمد -

(۴) پروانہ کونسل اسمی مہاراجہ دھیرج نرائن بہادر بنا برتقرر مشاہرہ بوجہ معاش

(۵) ڈگری کونسل بہ مادہ تقرر مشاہرہ بنام .. .. بوراثت

مہاراج دھیرج نرائن ورائے بنواری لعل ہمشیرہ زادہ متبنی مہاراجہ ممدوح

.. ..؁

خاصی بڑی درخواست ہے ۔ اختتام حسب ذیل ہے ۔ :

"سوال ہٰذا شامل مسل بند و بست دوامی موضع نورن وغیرہ متعلقہ تعلقہ کنکولی پرگنہ شہسرام ضلع شاہ آباد کے ہوکر بہ تجویز استحقاق فدوی بندوبست دوامی صاحب مہتمم بندوبست کا مسترد فرما کے بندوبست دوامی ساتھ موکل صادر ہو و درصورت کہ اگر مسل ہائے بندوبست دوامی موضع مذکور حضور میں صاحبان عالیشان صدر بورڈ کے واسطے منظوری حضور کے ارسال کیا گیا ہو۔ سوال ہٰذا فدوی کا بذریعہ چھٹی انگریزی حضور میں صاحبان عالیشان صدر بورڈ کے ترسیل فرمایا جائے کہ وہاں بھی موکل تجویز سے حاکمان ممدوح کے اپنے حق کو پہونچے گا ۔ فقط

فدوی بیچن لعل ملازم کارپرداز و مختار جمیع امورات رائے کیولا پرشاد نواسہ مہاراجہ دھیرج نرائن بہادر متوفی مالک مقرری دار دیہات متعلقہ تعلقہ کنکولی پرگنہ شہسرام ضلع شاہ آباد ۔ ۲۲ اپریل ۱۸۳۹ء"

(ریکارڈ نمبر ۱۶/ع کمشنر آفس ۔ پٹنہ ڈویژن کمشنری)

(۲) ایک درخواست ۲۰ جنوری ۱۸۵۵ء کی ہے۔ شہسرام کے شہریوں نے لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں شیر شاہی تالاب کی صفائی اور مرمّت کے بارے اپنی گذارش پیش کی ہے۔ ابتدائی القاب فارسی ترکیبوں اور بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ نمونۂ تحریر حسب ذیل ہے۔

"........ ازشاہان سلف شیر شاہ بادشاہ اولاً بتعمیر و تیاری تالاب کے آبادی اس شہر کا فرمایا۔

.... ساکنان این مکان و مسافران وغیرہ بآرام تمام جمیع امورات و آب نوشی وغیرہ تعلق تالاب کی ہے کہ بنوعہ گذران دفع الوقتی ساکنان و مسافران یہاں کے کرتے چلے آتے ہیں و مردمان غایت غریبی ولاچاری و بے روزگاری کے گذران کرتے ہیں و اوس تالاب کو زیادہ عرصہ تین سی برس کا ہوا .. .. و باعث بھر جانے تالاب کے پانی غایت ضرر و مکدر ہوگیا۔ و اس شہر میں چاہ و کوال پانی میٹھا بجز آب شور کے نہیں ہے کہ اس پر گذارہ کریں علی الخصوص گرما و طپش میں باعث بھر جانے تالاب کے پانی خشک و مکدر مضر ہو جاتا ہے کہ مردمان و جنوران مانند مچھلی بے آب کے حیران و پریشان رہتے ہیں .. ..

.. .. زیادہ حد ادب آفتاب عظمت و اقبال از مطلع اجلال کی پایان و درخشان ہوجیو۔ فقط

فدویان دلاور سنگھ و شیخ چندو۔ ساکنان
قصبہ سہسرام متعلقہ ضلع شاہ آباد بیسویں ماہ
جنوری ۱۸۵۵ء

العبد لچھمن پرساد۔ العبد وزیر علی خاں۔ العبد منو سنگھ۔ صحیح امیر سنگھ۔
م شہداد خاں۔ م رام ٹھر داس۔ م بھگوان داس "۔۔۔ وغیرہ وغیرہ
(ریکارڈ کمشنر آفس۔ پٹنہ۔ جلد ۱۳۔)

اس درخواست کے آخر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اُردو رسم الخط میں بکثرت دستخط ہیں۔ اس امر سے اُس عہد میں اُردو زبان کی وُسعت وہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۳) ایک نہایت ہی دلچسپ دستاویز قیام الدین احمد صاحب کو گیا کلکٹری کے محافظ خانہ سے ملی ہے۔ یہ ۱۳ اگست ۱۸۵۷ء کی لکھی ہوئی ایک عرضی ہے۔ عرضی مذکور گیا سے کمشنر پٹنہ کے پاس بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے تحقیقات کے لئے اُسے کلکٹر گیا کے پاس بازگردان کردیا تھا اور اپنا ریمارک بزبان انگریزی تحریر کیا تھا عرضی ذیل میں درج ہے۔

"بحضور ملازمان عالیشان نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ !
عرض پرداز ہے کہ چونکہ بوجہ تشریف لے جانے حاکمان انگریزی ضلع بہار کے خلفشار عظیم ومفسدہ ضخیم اس شہر صاحب گنج اور اطراف میں اس شہر کے واقع ہوا ہے۔ اس واسطے اطلاع کرنا کل حالا ضلع کا بتصریح وتوضیح تمام بحضور والا خیر خواہان سرکار پر اَنسب

والزم معلوم ہوتا ہے ۔ تصریح اس کی یوں ہے کہ بتاریخ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء روز جمعہ قریب نواخت پنج گھنٹہ روز کے بلا ظہور کسی امر کے مسٹر طامس کوٹس ٹرائر صاحب جج اور باغوائے اون کے مسٹر ای منی صاحب کلکٹر و مجسٹریٹ و مسٹر ایس ایچ سی بٹلر صاحب جنٹ مجسٹریٹ و اسسٹنٹ مجسٹریٹ و حالن صاحب اوپیم ایجنٹ وصاحب اڈشنل جج مع جملہ کرانیاں اسٹینڈین و دیگر صاحبان و سپاھیان گورہ و کمپنی سکھان جو اس شہر میں مقیم تھے ، بلا دینے چارج کسی حاکم ہندوستانی کے بیکبار شہر عظیم آباد تشریف لے گئے ۔ ظاہر ہے کہ وقت تشریف لے جانے صاحبانِ ممدوحین کے اس قدر بلوہ ہوا تھا کہ حاکمان ہندوستانی و دیگر ملازمان سرکاری و حضار کچھیری تاب استقامت کا کچھیری میں نہ دیکھکر اپنے اپنے ڈیرے پر بھاگتے گئے ۔ اگر اوس روز سپاہیان نجیب جو حفاظت خزانہ و جیلخانہ کے کرتے تھے خیر خواہی اور نمک حلالی کو راہ نہ دیتے تو بیشک اوس روز خزانہ سرکاری لُٹ جاتا و قیدیان بھاگ جاتے ‘‘ .. ..

.. .. وغیرہ وغیرہ ۔

’’ .. .. چونکہ بندہ خیر خواہ سرکار کا ہے و قاضی شہر کا اسواسطے کُل حال شروعًا عرض پرداز ہوا ۔ والّا مجھے کیا غرض

تھی۔ سب کی عزت و جان کے ساتھ میری عزت و جان بھی ہے۔ فقط

عرضی خواجہ علی رضا قاضی

پرگنہ گیا۔ مقیم شہر صاحب گنج

معروضہ ۱۳ اگست ۱۸۵۷ء عیسوی

روز پنجشنبہ۔"

(۴) ۸ دسمبر ۱۸۵۷ء۔ حکم کمشنر آف ریونیو بنام جے کومبی، کلکٹر آرہ

برائے ضبطیٔ املاک بابوان کنور سنگھ و امر سنگھ۔

۳ اکتوبر ۱۸۵۷ء

(۵) "۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ رپورٹ داروغہ تھانہ داؤد نگر باطلاع ضبط

کرنے جائداد مراد خان و ممکو خان و عصمت علی و مدد خان و

کن کن پانڈہ و بودہو وغیرہ"

جو لوگ سواران باغیان سرکار کے ساتھ چلے گئے۔

"حکم ہوا ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اسواسطے داروغہ داؤد نگر تھانہ کو

لکھا جائے کہ وہ دریافت کرکے ثبوت بہ نسبت ۔۔ ۔۔ ۔۔

واحمد علی کے بھیجدیوے۔

دستخط اے مونی	فقط العبد
مجسٹریٹ	شیولعل محرّر"

(۶) عرضی فدوی مبرارشاد علی داروغہ تھانہ داؤد نگر معروضہ سیزدھم

۱۸۵۷ء ہ نومبر ۱۸۵۷ء۔

مُہر تھانہ داؤدنگر ضلعبہار

(کمشنر آفس، پٹنہ۔ ریکارڈ جلد ۱۲۔ بنڈل نمبر ۴ متفرقات۔ فائل نمبر ۱)

(۷) پٹنہ کمشنری سے دستیاب شدہ ایک اور اہم ریکارڈ کی نقل درج ذیل ہے۔

" عدالت فوجداری ضلع شاہ آباد واقع بتاریخ ۶ر جون ۱۸۵۸ء مطابق ۱۰ر جیٹھ ۱۲۶۵ فصلی روز اطوار با جلاس کول صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ سہسرام۔ بیان نشان سنگھ باغی سرکار۔ باپ کا نام رگھو بیر سرن قوم راجپوت چوہان عمر شماری ساٹھ برس سے زیادہ ہے۔ گذران زمینداری سے۔

سوال۔ کیا بیان تمہارا ہے مفصل ظاہر کرو۔

جواب۔ عدالت دیوانے میں مقام آرہ کے ہمارا چار مقدمہ بہ نسبت موضع چناری، کھورتہا (صاف نہیں۔ ناقل) و سونگاوان اور ایک مقدمہ چہارم اگست ۱۸۴۰ء کا دائر تھا۔ اوسمقدمہ کی خبرگیری کے لئے آرہ میں بلبیسر سنگھ بیٹا ہمارا حاضر تھا۔ ہم کو خبر اوسکی ماندا ہونے کا ملا تب ہم خود آرہ میں گئے و بلبیسر سنگھ اپنے بیٹا کو گھر پر بھیجدیا و ہمارا بیٹا جب آرہ کے مقام میں

بیمار تھا تب اوسکا دوا بیشیشر دیال گماشتہ کوئی آرہ کا کرتا تھا۔ میان جیٹھ واساڑھ وساون سنہ گذشتہ تک ہم آرہ میں رہے۔ اسمیں ملنگا سب داناپور کے بغی ہو کر آئے و آرہ شہر کو لوٹ لیا۔ وکنور سنگھ کے نوکروں سے کہا کہ کنور سنگھ کو حاضر کرو نہیں تو جگدیشپور لوٹ لینگی۔ لیکن یہ بات ہماری مقابلہ مین نہیں کہا۔ ہم سونا ہوا یہ بات بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ کنور سنگھہ اوسے روز یعنے جس روز ملنگا سب آئے تاریخ ۱۸ ساون کا تھا جگدیشپور سے آرہ کے مقام میں آئی۔ دو تین روز کے بعد سرکار کی طرف سے گوروں کی فوج آئی و ملنگا سب سے داناپور کے جو باغی تھے لڑائی ہوئی۔ و سپاہی سب کی مدد میں کنور سنگھ تھی۔ ہم بھی اپنے ڈیرہ پر آرہ کے مقام میں رہی ہیں۔ وکنور سنگھ جب ہمکو بولا بھیجتے ہیں تب ہم انہیں سلام کے واسطے اونکی پاس جاتے تھے اور ہمسے راہ و رسم کنور سنگھ سے قدیم تھا۔ و ہمارے پاس کچھ حربہ ہتیار نہیں تھا۔" ....

.. ..

وغیرہ .. ..

" ... ... تب ہم جنگل میں جا کر رہے۔ کہ جب کچھ فرصت ہو

تب حاضر ہوں گے یا کیسے جگہہ بھاگ جائینگے۔ ایسے دو مراد سے
جنگل میں آج رات کو سوئے ہوئی تھی سرکاری سوار گئی گرفتار
کرلیا۔ فقط

سوال ۔ کنور سنگھ مرگیا یا زندہ ہے۔

جواب ۔ مکان پر آکر مرگیا۔ ہم سے ملاقات نہ ہوا "

اسی طرح کئی سوالات وجوابات درج ہیں۔ یہ بیان[1] لے۔ ان ۔ کول صاحب
ڈپٹی مجسٹریٹ کے سامنے لیا گیا۔ اختتام پر اُن کے دستخط ہیں۔

(۸) بنڈل نمبر ۵۵ ۔ ضلع شاہ آباد ۔ متفرق کاغذات سنہ ۱۸۶۴ء ۔ متفرقات
نمبر ۲۳۳ ۔ ریکارڈ جلد ۱ ۔ کمشنر آفس، پٹنہ

"بحضور خداوند نعمت بلند درجت والا حشمت دام اقبالہم !
عرض کرتا ہے ۔ عرصہ دس روز سے اس قریہ میں ایک مولوی باسم
عبداللہ مذہب وہابی باشندہ ملک مغرب وارد ہوئے جمعیت
اکثر افغانان وقصابان جو اس مذہب کی طرف رجوع رکھتی ہے
ساتھ اونکے مصاحب ہوئے۔ پہلے مولوی صاحب نے چند روز
وعظ ونصائح جو معمول اس فرقہ وہابی کا ہے بیان کیا

---

[1] اس بیان کے بارے میں ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر کالی کنکر دت صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسیٹی کا مختصر مضمون
"حالیہ منکشف ریکارڈ"، شائع شدہ پٹنہ یونیورسیٹی جرنل، نمبر ۱ و ۲ جلد ۸ ۔ مارچ ۔
جون سنہ ۱۹۵۴ء "SOME NEWLY DISCOVERD RECORDS" ۔

اور یہ ظاہر فرمایا کہ ہم خلیفہ ہیں طرف سے مولوی عبدالغفور صاحب مجاہد جو ملک مغرب میں تشریف رکھتے و آمادۂ جہاد ہیں اور ہم کو اجازت ہے کہ تم اس بات کو جہاں کثرت ہمارے فرقہ کے ہو بیان کرو اور جو شخص کہ مستعد جہاد ہو۔ اس کو یہاں روانہ کرو۔ چنانچہ ہزاروں بنگالے و پورب سے بھی انکی خدمت میں روانہ ہوئے ہیں .. .. وغیرہ وغیرہ۔

سیّد محمد جان و سیّد محمد روشن جان

ساکنان و مالکان قصبہ کواتھ پرگنہ دتوار، ضلع۔

شاہ آباد معروضہ ۲۹ ستمبر ۱۸۶۴ء

اس باب میں سولہویں صدی عیسوی کے اواخر یعنی عہدِ اکبری سے لے کر وسط انیسویں صدی عیسوی یعنی بہادر شاہ ظفر کے عہد تک بہار میں اُردو زبان کی کیفیتِ ارتقا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اس کی عمومیّت دکھلائی گئی ہے اب میں اس دَور کے بعد کی لسانی حالت کا سَرسَری نقشہ اس لئے پیش کرتا ہوں تاکہ ارتقائے اُردو کے تسلسل کا اثر قائم ہو۔ بعد از آں آئندہ ابواب میں اُردو اَدب کے ارتقا کی وہ منزلیں پیش کی جائیں گی جو ۱۸۵۷ء تک بہار میں طے ہوئیں۔ یوں تو بحمد اللہ اُردو کا سفر اس پُورب دیس میں اب تک جاری ہے۔

ڈاکٹر کالی کنکر دت کی وساطت سے مجھے

گورنمنٹ گزٹ[1] ممالک مشرقی کی ایک جلد ملی ہے۔ پہلا نمبر ۶ جنوری ۱۸۶۵ء کا اور آخری ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء کا ہے سلسلۂ اشاعت کے لحاظ سے پہلا نمبر جلد ۸ نمبر ۱ ہے اور آخری جلد ۸ نمبر ۵۱۔ گزٹ بیشتر اُردو میں ہے۔ اور جہاں انگریزی عبارت ہے۔ وہاں مقابل میں اُس کا اُردو ترجمہ ضرور درج ہے۔ سرکاری نشان و علامت کے بعد ہر نمبر پر لکھا ہے :۔

GOVERNMENT GAZETTE, LOWER PROVINCES

گورنمنٹ گزٹ ۔ ممالک مشرقی گورنمنٹ کے حکم سے جاری ہوا۔
مقام الہ آباد۔ سائز بڑا فولسکیپ۔ چھپائی کا نٹے کی نسخ، کلکتیہ۔

یہ گزٹ ہفتہ وار ہر جمعہ کو شائع ہوا کرتا تھا۔ جمعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء سے اس کے سرورق میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی۔ اب اس کا نام " اُردو گورنمنٹ گزٹ، ممالک مشرقی " ہوگیا۔ ساری باتیں حسب سابق رہیں۔ غالباً یہ تبدیلی برائے نام ہی تھی۔ میں اس گزٹ سے چند حوالے نقل کرتا ہوں۔ وسط انیسویں[19] صدی میں اُردو ممالک مشرقی میں عوام و خواص کے درمیان اور سرکار و دربار میں مقبول

---

[1] " غدر سے سات برس پہلے بہار کا ایک اخبار ' نور الانوار ' آرہ سے ۱۸۵۲ء میں نکل رہا تھا۔ اس کے تین برس بعد ۱۸۵۵ء میں گیا سے ' ویکلی رپورٹ ' نکلنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اخبارات بھی مختلف مقامات سے نکلتے رہے۔ .. .. بہار شریف جیسے قصبہ سے بھی مختلف اوقات میں متعدد اخبار نکلے : شرف الاخبار، یہاں کا مشہور اخبار تھا "
(درخشاں ابدالی، اسلام پور، پٹنہ اُردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ ' ندیم ' بہار نمبر ۱۹۳۵ء۔ اگست و ستمبر)

و باریاب تھی۔

" قواعد در باب اهتمام اور انتظام جیلخانہ ہائے ممالک مشرقی واقعہ پریزیڈنسی بنگالہ مرتبہ جناب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر بنگالہ حسب منشاء احکام ایکٹ ۲ سنہ ۱۸۶۴ء کونسل بنگالہ۔

(تتمہ گزٹ جمعہ گذشتہ)

فصل ۱۹

مُشقّت اور کام جو قیدیوں سے لیا جائے گا۔

دفعہ ۲۴۸۔ قانون کا یہ منشاء ھی کہ قید بمنزلہ سزا سمجھی جائے پس مشقّت لینے میں اول امر لائق لحاظ یہ نہیں ھی کہ اُس مشقت سے انتفاع ہو بلکہ یہ کہ مشقت کے باعث عوام الناس جیلخانہ کی بود و باش کو مقام خطرہ اور تکلیف اور لائق احترازکے سمجھیں۔ جیلخانہ کی تعمیل سیاست کے لئے مشقّت ایک ذریعہ مقدم ھی لہذا ہرایک جیلخانہ میں دیواروں کے اندر مشقت لینے کا بندوبست مناسب کرنا چاہیئے۔ دیوار سے باہر مشقت لینا بجز اس کے کہ جیلخانہ کے باغ میں محنت لی جائے قطعاً ممنوع ھی"

.. ..

" دفعہ ۲۵۰ مشقت جیلخانہ کی تین قسمیں ہیں وہ یہ ہیں :

1ST CLASS	**قسم اول**
1. OIL-PRESSING.	۱. کولھو سے تیل نکالنا۔
2. LIME-GRINDING.	۲. چونا پیسنا۔
3. FLOUR-GRINDING.	۳. آٹا پیسنا۔
.. ..	.. ..
4. PAPER-POUNDING	۴. کاغذ کوٹنا۔
.. ..	.. ..
6. PAPER POLISHING	۶. کاغذ پر مُہرہ کرنا۔
.. ..	.. ..
2ND CLASS	**قسم دوم**
1 MASONRY.	۱. معمار کا کام۔
2. STONE CUTTING.	۲. سنگ تراشی۔
3. PAPER MAKING.	۳. کاغذ سازی
.. ..	.. ..
3RD CLASS	**قسم سوم**
1. TAILORING.	۱. درزی کا کام
2. DYEING.	۲. رنگریزی
.. ..	.. ..
"9. SIZING AND DRYING PAPER-	۹. کاغذ کو اھار دینا اور سُکھلانا"
.. ..	.. ..

گورنمنٹ گزٹ۔ ممالک مشرقی

(جلد ۸ نمبر ۱۔ جمعہ کا دن۔ جنوری مہینے کی ۴ تاریخ سنہ ۱۸۴۵ء)

گزٹ کی جلد ۸ نمبر ۴ میں قواعد جیلخانہ کی فصل ۳۲ یوں شروع

ہوتی ہے :

" بہی جات اور کتب رجسٹر اور نقشہ جات
اور افراد حساب

بہی جات اور کتب رجسٹر مطابق نمونہ ہائے مقررہ مندرجہ ضمیمہ کے مرتب اور نقشہ جات اُنھیں نمونوں کے بموجب طیار ہوکر مرسل کئے جائینگے *

ا ۔ بہی جات اور کتب رجسٹر جو معرفت افسر مہتمم جیلخانہ کے مرتب ہونگی "

اس فصل میں دفتری کاموں کے لئے اُردو اصطلاحیں بکثرت درج ہیں ۔ ان کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے ۔

JOURNAL. — روزنامچہ

LETTER BOOK. — نقل بہی چھٹیات

VISITOR'S BOOK. — وزیٹر کی کتاب

JAIL OFFICERS' APPOINTMENT AND HISTORY BOOK
جیلخانہ کے عہدہ داروں کے تقرر اور اُنکے احوال کی کتاب ۔

MIS-CONDUCT BOOK. — کتاب بداعمالی ۔

ORDER BOOK. — آرڈر بک یعنی حکم بہی ۔

CIVIL JAIL. — جیلخانہ دیوانی ۔

RELEASE DIARY.	روزنامچہ رہائی
GENERAL ABSTRACT AND LOCK-UP REGISTER.	گوشوارۂ عام اور رجسٹر حوالات۔
CRIMINAL JAIL.	جیلخانہ فوجداری۔
RELEASE AND TRANSFER REGISTER.	رجسٹر رہائی اور انتقال۔
REGISTER OF ESCAPES.	رجسٹر فراری۔
" " DEATH	رجسٹر قیدیان فوت شدہ
LABOUR REGISTER.	رجسٹر مشقت
EXEMPTION "	" معافی
PUNISHMENT "	" سزادھی
PROPERTY BOOK	" مال نامہ
SECURITY REGISTER	" ضمانت
STATISTICAL ABSTRACT	گوشوارہ حالات قیدیاں
CLASSIFICATION	درجہ بندی
CASE BOOK	بہی مقدمات
RETURN BOOK	بہی ریٹرن
LEDGER	کھاتہ بہی
CASH BOOK	روکڑ بہی

CLOTHING STOCK BOOK.	حساب ذخیرہ پارچہ
PERIODICAL RETURNS.	نقشہ جات میعادی
TRANSACTION	عمل درآمد
ESTABLISHMENT	سررشتہ
EXPIRY OF SENTENCE	انقضائے میعاد
BUDGET	بجٹ
REPORT.	رپورٹ
CALENDAR YEAR.	سال کلنڈرہ

اُردو گورنمنٹ گزٹ کے نمبر ۴۶ جلد ۸ - تاریخ ۱۷ نومبر ۱۸۶۵ء سے ایک اشتہار نقل کیا جاتا ہے :

" اشتہار

واضح ہو کہ بمقام پٹنہ واسطے قسمت ہائے بھاگلپور و پٹنہ نمائش کاشتکاری بماہ جنوری آئندہ ہوگی۔ نمائش جانوروں و حاصلات و آلات کاشتکاری بمقام پٹنہ تاریخ سی ام جنوری ۱۸۶۶ء و تین روز مابعد اُس کے ہوگی۔ بسفارش کمیٹی قسمتی بہ امر از حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر تنقیح پایا کہ نمائش کاشتکاری برائے ۱۸۶۶ء بمقام پٹنہ ہو۔ پس یہ بات لازم ہوئی کہ قسمت ہائے بھاگلپور و پٹنہ یک شامل کیا جائے بکار ہائے نمائش مذکور و اعانت بدل مطلوب ہے۔ کل باشندگان

ہر دو قسمت جو اہل ولایت یا رؤساء سے اس ملک کے خصوصاً
زمینداروں ذی مقدور سے جو کہ مدد کامل دے سکتے ہوں واسطے
کامیابی ایسے امر مفید کے اور لا سکتے ہوں واسطے نمائش کے
بہتر نمونہ جانوران و حاصلات زراعت موجودہ زمینداری خود ہا
وہ بھی نمائش میں خود معہ رعایان و تابعان جو بآسانی لا سکتے
ہوں حاضر ہو سکتے ہیں ....‘‘

ینٹفک سائٹی

مغربی علوم کے ترجمہ کے لئے مظفرپور میں ایک ’سائنٹیفک سوسائٹی‘ قائم کی گئی تھی۔ گارساں دتاسی لکھتا ہے :

’’بہار کی ’سائنٹیفک سوسائٹی‘ کا صدر مقام مظفرپور ہے۔ اس انجمن کے معتمد ایک فاضل مسلمان ہیں۔ اس وقت انجمن میں ۳۱۸ ارکان ہیں۔ اس تعداد میں ۲۸ مسلمان ہیں، ۱۶۲ ہندو ہیں اور ۲۰ یوروپین ہیں۔ انجمن کی طرف سے ’اخبار الاخیار‘ شائع ہوتا ہے۔ تجویز ہے کہ انجمن مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قائم کرے اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دے۔‘‘

(خطبات گارساں دتاسی۔ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء)

بارات

دتاسی کی تصریحات کے بموجب عظیم آباد (پٹنہ) کا سب سے پہلا اُردو اخبار ’’چشمۂ علم‘‘ ہے۔ جو ۱۸۶۹ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

’’چشمۂ علم۔ یہ پٹنہ سے اُردو میں مہینہ میں دو دفعہ نکلتا ہے۔ اس سے

پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا۔ اس کی پہلی اشاعت یکم جنوری ۱۸۶۹ء کو شائع ہوئی۔ یہ چھوٹی تقطیع پر ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں .. .. اس کا ایک مضمون مجھے پسند آیا، جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا۔"

(خطبات گارساں دتاسی، انیسواں خطبہ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء)

رسالہ معاصر، پٹنہ، حصہ ۳، دسمبر ۱۹۵۲ء میں قاضی عبدالودود رقم طراز ہیں:

"انیسویں صدی کے اواخر میں ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار انڈین کرانکل پٹنہ سے نکلتا تھا، اور وہ شخص یا اشخاص جو اس کے مالک تھے 'اردو انڈین کرانکل' بھی انہیں کی ملک تھا۔"

اوائل ۱۸۸۵ء میں اس کی زندگی کا پانچواں سال شروع ہوا تھا، جس سے ظاہر ہے کہ پہلا شمارہ جنوری ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا ہوگا۔ اوائل ۱۸۸۶ء میں اس نام کا اخبار نکلنا بند ہوگیا۔ اور ایک دوسرا اخبار "اردو بہار ہیرلڈ و انڈین کرانکل" جاری ہوا۔ جلد پنجم میں مختلف مقامات پر خریداروں کے نام ملتے ہیں۔ ان میں ۱۹۷ ہندو ۱۶۲ مسلمان اور ۴ عیسائی تھے۔ قاضی عبدالودود کرانکل کے مقالات افتتاحی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک اس زمانے کے اردو اخباروں میں شائد ہی کسی کے مقالات افتتاحی کرانکل کے مقالات افتتاحی کا مقابلہ کر سکتے

ہیں ، اور ان میں متعدد ایسے ہیں کہ اس زمانے میں بھی کسی کے قلم سے نکلیں تو مستحق تحسین قرار پائیں ۔ اس اخبار کی ایک خصوصیّت یہ بھی ہے کہ یہ ہندو مسلمان دونوں کا اخبار تھا ۔" کرانکل کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں :۔

"فطرت انسانی کی رو سے کسی قوم کے اخلاق وعادات ، خیالات و معتقدات پر ان قِصّے کہانیوں کا کیسا زبردست اور لازوال اثر ہوتا ہے ، ہر متنفّس اپنے خاص تجربے سے اس کی شہادت دے گا ۔ اس کے سوا عموماً نظم میں بھی ایک ایسی دلفریب تسخیر ہے جس کے اثر سے ممکن نہیں کہ کوئی بچا ہو ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری قوم نے اگر اس کی گردن پر چھُری نہ پھیری تو اس کا گلا گھونٹا ۔ دنیا کی کل شایستہ قومیں زمانے کے ساتھ ان دونوں قوتوں کو ، اگر ہم ان کو قویٰ سے تعبیر کر سکیں ، کیسی رونق دے رہی ہیں ۔ روز بروز کیسی خوش آیند تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں ۔ لیکن اس انیسویں صدی میں بھی ان کی اصلاح کی ضرورت ہمارے ملک کے قِصّہ گویوں اور شاعروں کی سمجھ میں نہ آئی ۔ قِصّے ہیں تو انھیں عجائب اور خلاف قیاس باتوں سے بھرے ہوئے جن کو یورپ کا ایک قُلی بھی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ سرتاپا جھوٹ سمجھے اور مخرب اخلاق کہے ۔ نظم ہے تو ایسی جس کے

گندہ خیالات اور گمراہ کرنے والی تاثیر سے شیطان بھی
پناہ مانگے۔"

(اقتباس تبصرۂ جوان بخت وشمس النہار
از مدیر[1] - ۲ر مارچ ۱۸۸۵ء)

"جوان بخت وشمس النہار - یہ ۷۳ صفحوں کا ...... ناٹک
نظمِ اُردو میں اوپرا کے طور پر لکھا گیا ہے .... جوان بخت
وشمس النہار کے مصنّف مولوی محمد نواب[2] صاحب نے .....
ان دونوں باتوں کا خیال رکھا ہے ...... نہ اس میں کہیں
کوہ قاف کی پریوں، طلسم کے جنجال کا بیان ہے اور نہ کہیں
بدکاریوں کی ہدایت ہے۔ روز مرّے کی سادی سادی باتیں
ہیں ...... ایّام غدر کا تذکرہ ہے .... تناسبِ وقت،
تناسبِ مقام اور تناسب مبحث اِن تینوں باتوں کا جو ڈرامے
کی جان ہیں ہر جگہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ پورا لحاظ رکھّا
گیا ہے۔ بیان کا پیرایہ اور زبان بھی بہت دل فریب ہے
اور خاص کر آپس کی گفتگو کی زبان تو وہ بلا کی ہے کہ پناہ بہ خدا

---

[1] مدیر کا نام (مولوی) سید عبدالغنی تھا۔ انھیں "ایڈیٹر اُردو انڈین کرانکل" لکھا ہے۔ غالبًا یہ بزرگ استھانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے۔

[2] مولوی سید محمد نواب مختار فوجداری و کلکٹری - بادشاہی گنج - علاقہ تھانۂ پیر بہوڑ، باقی پور (بانکی پور) پٹنہ -

... ... قصّے کا خاتمہ ایسے مؤثر طور سے کیا گیا ہے کہ دل ہل جاتا ہے ... ... " (ایضاً)

"الپنچ، ... ۱۸۸۵ء میں منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ... ... یہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۰ء تک نکلتا رہا۔ پہلے اڈیٹر سید رحیم الدین صاحب استھانوی تھے ... ... حضرت آزاد عظیم آبادی، حضرت رنجور عظیم آبادی ... ... پروفیسر شہباز ... ... مولوی شوق نیموی ... وغیرہ اس کے مستقل مضمون نگار تھے۔ الپنچ نے قومی وملکی، اصلاح وتعلیمی امور میں خاصی جد وجہد کی۔"

(رخشاں ابدالی۔ بہار نمبر، ندیم گیا ۱۹۳۵ء)

"الپنچ، کے اجراء سے ایک برس پہلے جولائی ۱۸۸۴ء میں شمس العلماء مولوی محمد حسین ذبیح عظیم آبادی نے ایک اخبار "پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" نامی جاری کیا۔" (ایضاً)

باب دوم

بہار میں اُردو ادب

تمہید صوبۂ[1] بہار میں مسلمانوں کے سیاسی و تہذیبی اثرات کا آغاز باضابطہ طور پر اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی کی فتوحات سے ہوا۔ اس کا زمانہ سنہ ۱۱۹۲ء تا سنہ ۱۲۰۴ء (سنہ ۵۹۰ھ تا سنہ ۶۰۲ھ) تھا۔ لیکن بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن بختیار سے پہلے مسلمانوں نے یہاں قدم جمانا شروع کر دیا تھا۔ محمود غزنوی کے بھانجے سالار مسعود غازی کے لشکر کا اطراف بنارس تک آنا ثابت ہوتا ہے۔ جن جن جگہوں میں مسعود غازی کے مجاہدین نے

---

[1] منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد۔ فصیح الدین بلخی مصنف "تاریخ مگدھ"، ندیم، گیا، بہار نمبر اگست و ستمبر سنہ ۱۹۳۵ء، صفحہ ۶۴-۷۰

محمد بن بختیار کے حالات کے لئے دیکھئے "طبقات ناصری"۔ مؤلفہ منہاج الدین سراج، اور تاریخ فرشتہ، جلد ۲۔

جنگ کی اور مقتول ہوئے وہ مقامات گنج شہیدان کے نام سے مشہور ہیں، اور وہاں غازی میاں کا میلہ لگتا ہے۔ سیوان، ضلع سارن بہار اور منیر، ضلع پٹنہ میں بھی ایسی جگہیں ہیں جہاں یہ میلے لگتے ہیں۔

منیر شریف کے اہل خانقاہ کے سفینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۷۸ء (۵۷۶ھ) میں حضرت تاج فقیہہ اور قطب سالار نے راجہ منیر پر فتح پاکر اس علاقے پر قبضہ کیا۔ قطب سالار کا مزار موضع مہدآواں میں منیر سے دو میل پورب، مسجد کے پس پشت واقع ہے۔ ایک لوح بھی ملی ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قنوج کے راجہ گوبند چندر نے منیر کے ایک برہمن کو جاگیر عطا کی۔ لوح پر جو سنہ درج ہے وہ از روئے حساب ۱۱۲۶ء بنتا ہے۔ اس میں یہ فرمان ہے کہ دوسرے محصولات و مالگزاری کے ساتھ ترکوں کا محصول ("ترک ڈنڈ") بھی جو ادا ہوتا رہا ہے، ادا ہوتا رہے[1]۔

بارہویں صدی کے آغاز سے صوبۂ بہار پر مسلسل مسلمانوں کی حکومت رہی اور اس علاقہ میں نئے تہذیبی اثرات گھر کرتے رہے۔ بہار اور بنگال سلطنت دہلی کے صوبے تھے۔ جب دہلی کی سلطنت کمزور ہوتی تو یہ صوبے خود مختار ہو جاتے۔ ۱۵۱۸ء میں بابر نے بنگال و بہار پر فوج کشی کی۔ بابر کی وفات کے بعد لودی اور سوری افغانوں نے اپنی جمعیت کو فروغ دیا۔ ۱۵۷۶ء

---

[1] بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جرنل جلد ۲، ۱۹۱۶ء۔ ایک اور لوح ملی ہے۔ جس میں یہ عبارت لکھی ہے۔ "دین محمدی شد قوی"

میں شہنشاہ اکبر نے بہار اور بنگال کو فتح کر لیا۔ پہلے ابواب میں اس امر کی تفصیل بیان ہو چکی ہے کہ دو تہذیبوں کے میل سے شاہجہاں کے عہد تک بہار میں اُردو زبان رس بس چکی تھی۔ اور اب ادب کی پیدائش و ترقی کا وقت آگیا تھا۔ شاہزادہ عظیم الشان ۱۶۹۷ء میں پٹنہ آیا۔ اور پٹنہ عظیم آباد[1] بن کر تخت گاہِ اُردو کی حیثیت سے مسلّم الثبوت بنا۔ پھر فرخ سیر یہاں آیا اور امیر الامراء نواب سیّد حسین علی خاں صوبہ دار پٹنہ کی اعانت سے وہ یہیں شہنشاہ ہندوستان بنا۔ فرخ سیر کی تاجپوشی عظیم آباد میں ہوئی۔ سیّد حسین علی خاں نے فوج جمع کی اور اسی فوج کی مدد سے فرخ سیر دِلّی پر قابض ہوا۔ سیر المتاخرین کے مؤلف سیّد غلام حسین عظیم آبادی کے قول کے مطابق بہاریوں نے یہ فتح حاصل کی (۱۷۱۳ء)۔ اس کے بعد شاہجہان آباد دِلّی اور عظیم آباد پٹنہ کے درمیان روابط و مراسم بہت بڑھ گئے۔ بہت سے اُمراء دِلّی چھوڑ کر پٹنہ آ بسے لہٰذا اُن کی زبان و معاشرت میں یکرنگی آنے لگی۔" فرخ سیر کے زمانے میں ایک امیر با تدبیر تھا جسے تاریخی زبان عمدۃ الملک اور عوام محمد امیر خاں کہتے اور انجمنِ شعر انجام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ یہ نواب بھی بیدل ہی کا دلدادہ اور مقلّد تھا اور جس وقت اُستاد اُردو کی طرف مخاطب ہوا، مؤدب شاگرد بھی ہمہ تن اُدھر متوجہ ہو گیا۔ اس کی اس توجہ و خیال سے اِس زبان کا وہ آوازہ بلند ہوا کہ ساری دِلّی گونج اُٹھی اور پھر تو گھر گھر سے اس کی صدا

---

[1] "متصدیان دفتر شاہی کے لئے دیوان محلہ اور اُمراء فوج کے لئے لودی کٹرہ بسایا۔ مغلوں کے رہنے کے لئے مغلپورہ اور شاہزادوں اور اُمراء کے لئے محلہ کیواں شکوہ 'جو اب بگڑ کر 'کواکھوہ' ہو گیا ہے۔ عظیم الشان کا قصد تھا کہ عظیم آباد کو رشک دِلّی بنا چھوڑے۔" (بہار اور اُردو، حمید عظیم آبادی، ندیم، بہار نمبر ۱۹۴۰ء)

آنے لگی۔" (نصیر حسین خیال عظیم آبادی) ۔ مرزا بیدل، اورنگ زیب کے زمانہ میں پٹنہ سے دلی گئے اور فرخ سیر کے عہد تک فارسی اور اُردو کو فروغ دیتے اور بہار و عظیم آباد کے نام کو روشن کرتے رہے۔ نواب لُطف اللہ خاں صادق اور مرزا معز موسوی خان فطرت دلی سے پٹنہ آئے۔ عظیم آباد پٹنہ نے صوبہ بہار کے دوسرے شہروں سے بہ حیثیت زبان و ادب امتیاز حاصل کیا۔ لیکن بہار کے دوسرے مراکز بھی اُردو ادب کی تخلیق و ترویج میں مشغول تھے، کیونکہ اُردو زبان سارے صوبہ میں آہستہ آہستہ مقبول ہو رہی تھی۔ شہروں اور قصبات میں اُردو کو فروغ ہو رہا تھا۔ پٹنہ، گیا، آرہ، چھپرہ اور مظفرپور۔ نیز اُن شہروں کے قریبی قصبات اور مفصلات کے علاوہ صوبہ کے مشرقی اور جنوبی علاقوں میں بھی اُردو زبان و ادب کی خدمت ہو رہی تھی۔ افسوس کہ بزرگوں کے ادبی سرمایہ کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا۔ یہاں تحقیقات علمیہ کا کام جب سے شروع ہوا ہے بہار میں اُردو کی قدامت، وسعت اور ہمہ گیری ثابت ہوتی جاتی ہے۔

اب تک کی تلاش و جستجو سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ولی دکنی کے زمانہ سے بہار میں اُردو ادب کی تخلیق ہو رہی ہے اور یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ادب اُردو کے سلسلہ میں جس طرح اورنگ آباد دکن کا اثر دہلی پر پڑا ہے۔ اسی طرح ایک حد تک عظیم آباد، بہار کے

ذریعہ بھی دِلّی میں تحریک اُردو کو تقویت پہنچی ہے۔ عظیم آباد کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے مرکز اور دائرے میں اُردو ادب کی تخلیق ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جب دکن، دھلی اور لکھنؤ میں نوبت بہ نوبت اُردو کا طوطی بولا تو عظیم آباد میں بھی اس کے ہم صفیر موجود تھے۔ عین ممکن ہے کہ دکن کے دورِ اولی کے متوازی بھی اَدب قدیم کے نمونے بہار میں مل جائیں۔ لیکن اب تک تو دکن کا قدیم اَدبی سَرمایہ سب پر بھاری ہے اور اغلب یہی ہے کہ اس کی اہمیّت غیر متزلزل ہے۔ کیونکہ خاص تاریخی تہذیبی و سیاسی وجوہ کی بنا، پر وہاں 'ریختہ' کا باغ سب سے پہلے لہلہایا۔ یکّا دُکّا پیڑ پودے تو سارے برّصغیر ہند میں سَرسَبز ہوئے۔ بہرکیف تحقیقات اور انکشافات کے دَروازے کُھلے ہوئے ہیں۔ علم اور تحقیق کی دُنیا میں صُوبائی عصبیّت، قطعیت اور کٹّرپن کی کوئی جگہ نہیں۔

میں تحقیق و مُطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ دور قدیم اور دَور وسطیٰ میں علی الترتیب اُردو ادب ہر دبستان میں بُنیادی اعتبار سے یکساں رہا ہے۔ جدّت، اختراع اور قابلِ ذکر تبدیلیوں کی سکت ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں نظیر اکبر آبادی ایک استثناء ہے۔ دکن، دھلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کے اُردو اَدب میں سطحی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ اَدب کے عام تجربے، ہیئت، صنفیں، مزاج، روایات، تلمیحات، تشبیہیں، اور

استعارات سب کم وبیش ہر دبستان میں ایک جیسے ہیں۔ یعنی دبستانوں کی انفرادیت اور اُن کے فن کاروں کی اِنفرادیت ہنوز بالیدہ اور نمایاں نہیں ہوئی۔ تھوڑے سے رنگ اور مذاق کا فرق یا بعض صنفوں کی طرف نسبتاً زیادہ توجہ کا امتیاز ضرور پایا جاتا ہے۔ اس لئے اگر دبستانِ عظیم آباد میں نمایاں انفرادیت نہیں تو کوئی حیرت کی بات بھی نہیں۔ عام طور پر دِلّی اور پٹنہ کے میلانِ شعر وادب میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ اواخر انیسویں صدی میں دبستانِ لکھنؤ کا اثر بھی بہار پر پڑا ہے۔ اور ایک طبقۂ شعراء کا میلان اُسی جانب ہوگیا۔ نثر میں بھی ہمیں دِلّی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کا اثر ملتا ہے۔ خصوصاً ناول نگاری میں۔ پھر عہدِ شاد میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ دبستان عظیم آباد نے دِلّی اور لکھنؤ کے مذاق و میلان کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا جو جیتا جاگتا، خوبصورت، اثر آفریں اور بار آور تھا۔ اس امتزاجی فن نے بیسویں صدی کے اَدب کو گہرے طور پر متاثر کیا۔[1]

حمید عظیم آبادی لکھتے ہیں:

"اصل حقیقت یہ ہے کہ دہلی و لکھنؤ و عظیم آباد وغیرہ وغیرہ شہروں کی زبانیں ایک ہی چمن کی دو ڈالیں اور شاہجہانی اُردو کی بیٹیاں ہیں۔ ایک ہی گھر میں پیدا ہوئیں، ایک ہی جگہ کھیل کُود کر بڑی ہوئیں، ایک ہی طرح کے جہیز پائے۔ کوئی بیاہ کر پورب

---

[1] ملاحظہ ہو میرا مقالہ 'حسرت کی انفرادیت' ۔ اُردو واَدب، علی گڑھ، حسرت نمبر۔ اور 'قدر و نظر' از اختر اورینوی

گئی، کوئی پچھم، کوئی اُتر اور کوئی دکھن۔ لہٰذا فرق بھی اتنا ہی ہونا چاہیئے، جتنا دو بہنوں میں ہوتا ہے[1]۔"

اگر اس تمثیل کو بہت زیادہ کھینچا نہ جائے تو میں اِس خیال سے متفق ہوں۔ دبستان بہار کی خصوصیّات کے مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بہار میں اُردو ادب کی پیدائش یا درآمد کا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں بھی افراط و تفریط کو راہ دینا نہیں چاہیئے۔ بہرکیف بہار کا اُردو ادب بیرونی یا مصنوعی نہیں بلکہ مقامی اور اصلی ہے۔ "یہ شہر اپنے مذاق شاعری میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ آپ اپنا مقلد و شاگرد رہا۔ اور یہیں کے فیض سے اپنا کشکول بھرا گیا ہے۔" بقول حضرت شاد ؏ "درِ اُردو پیرو آبائے خویشم" اور:

زبان مادری من ہماں است
نہ ماخوذ از کلام دیگراں است

حق یہ ہے کہ جب اُردو زبان بہار میں بالیدہ ہوگئی، تو وہ ازخود اسی صوبہ کی مٹّی سے رَس اور جَس لے کر، اسی کے پانی سے سیراب اور اسی کی ہَوا سے شاداب ہو کر پھولنے پھلنے لگی اور اس اَدب کی خوشبو ملک کی فضا میں پھیلی اور سامانِ نشاط و مسرت بنی۔

پرافسر معین الدین دردائی لکھتے ہیں:

"بہار نے دہلی اور لکھنؤ سے بہت پہلے اُردو کی طرف توجہ کی۔"

---

[1] ندیم، بہار نمبر ۱۹۴۰ء۔ 'بہار اور اُردو'۔ صہ ۱۶۰

بہار اور اُردو شاعری ص۹۷) .. ..

" بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بہار کی شاعری کا کوئی خاص اسکول نہیں ہے۔ بلکہ دہلی اور لکھنؤ اسکول کی پیرو ہے۔ لیکن اس کی تاویل کیونکر کی جائے گی کہ اگر[1] آشکی اور رجمالی نے خواجہ میر درد کو اپنا اُستاد بنایا، تو میر تقی میر نے بھی جعفر عظیم آبادی کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ ان کے علاوہ غالب نے بھی مرزا بیدل عظیم آبادی کا کلام سامنے رکھ کر مشق سخن کی ہے .... با کمال شاعر بجائے خود ایک اسکول ہوتا ہے " (ایضاً ص۲۱)

پروفیسر دردائی کے برخلاف قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :

" ۱۱۵۱ھ سے ۱۱۷۰ھ تک اور اس سے پہلے صوبۂ بہار میں اُردو کے مقابلہ میں فارسی کا زیادہ چرچا تھا اور یہاں اچھے اچھے فارسی گو موجود تھے لیکن اس زمانہ میں ایک ریختہ گو شاعر بھی جسے مسلم الثبوت اُستاد مانا گیا ہو اور جس کی خوش گوئی کا عام طور پر اعتراف کیا گیا ہو، منظر عام پر نہیں آیا۔ وہ شعراء جو عظیم آباد سے تعلق رکھتے، دھلی کی زبان کے مقلد معلوم ہوتے ہیں .... ۱۱۷۰ھ سے ۱۲۲۰ھ تک کا زمانہ اس صوبہ کی اُردو شاعری کا عہد زرّیں ہے۔ .. .. اس زمانے

۱؎ حیات فریاد ۔ شاد عظیم آبادی ص۱۵۷

میں بھی یہاں کے تمام اساتذہ دہلی کے مقلّد رہے ....
زیر بحث بہاری شعراء میں کوئی نیا رنگ و آہنگ، کوئی نیا زاویۂ نگاہ
نہیں ملتا ......"

(بہار کی اُردو شاعری - عید نمبر صدائے عام ۱۹۵۳ء)

ان دونوں اقتباسات میں کچھ ایسی باتیں ہیں جن کی صحت کے متعلق مجھے کلام ہے۔
سب سے پہلے اس امر کے یقین کرنے کی کافی وجوہ نہیں کہ میر تقی میر نے جعفر
عظیم آبادی کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ میں یہ بھی نہیں مانتا کہ عظیم آباد،
بہار کا دبستانِ ادب نمایاں انفرادیّت رکھتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ
عظیم آباد بہار اُردو ادب و شاعری کا ایک اہم اسکول ہے۔ یہ بالکل غلط
ہے کہ یہاں کے سب اساتذہ دِہلی کے مقلّد رہے ہیں۔ دردائی نے
بڑے نکتہ کی بات لکھی ہے کہ " باکمال شاعر بجائے خود ایک اسکول
ہوتا ہے۔" چھوٹے فن کار اپنے دبستان اور اُستاد کی تقلیدِ محض کرتے
ہیں اور بڑا صاحبِ فن اِن سے بلند ہوتا ہے۔ مثلاً میرا مطالعہ یہ ہے
کہ راسخ عظیم آبادی، میر دہلوی کے مقلّد نہیں۔ اُن میں کافی انفرادیّت پائی
جاتی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ قاضی عبدالودود خود عظیم آباد
کی مرکزیّت کو تسلیم کرتے ہیں " اس عہد میں اُردو شاعری کا جو چرچا یہاں
نظر آتا ہے، اور خوش گو شاعروں کی جو بہتات یہاں پائی جاتی ہے، دہلی،
لکھنؤ کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی اور شہر میں نہ ملے گی ......" مقلّد شعراء

ہر دبستان میں ملتے ہیں اور مجتہد فن کار کی ہر جگہ کمی ہوتی ہے۔ بہ حیثیت دبستانِ عظیم آباد اور دہلی میں مماثلت ضرور ہے۔ ویسے دہلی کا اثر لکھنؤ اور عظیم آباد دونوں پر پڑا ہے۔ لکھنؤ کی بغاوت بھی محض سطحی تھی۔ نوعی یا بُنیادی نہیں تھی۔ اُس کا نیا رنگ و آہنگ محض مصنوعی اور بہ رعایت لفظی تھا۔ اس نکتہ کی وضاحت نظیر[1] اکبر آبادی، حالی اور اکبر کی شاعری کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ ان فن کاروں نے اُردو شاعری میں اختراعی اور بُنیادی تبدیلی پیدا کی۔ اصل چیز غور کرنے کی یہ ہے کہ عظیم آباد کے اساتذہ محض تقلید اور نقالی میں شاعری نہیں کرتے بلکہ اُن کی شاعری اُن کے حال اور تجربہ پر مبنی ہے۔ ان صاحبِ حال بزرگوں کو مقلد نہیں کہا جا سکتا۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> "اگر بہار بنگالہ سے الگ ہوتا اور یہاں کا صوبہ دارالسلطنت مُغلیہ کے ضعف سے فائدہ اٹھا کر ایک آزاد یا نیم آزاد حکومت یہاں قائم کر لیتا، تو بہ خوبی ممکن ہے کہ عظیم آباد بھی لکھنؤ کی طرح عَلَمِ بغاوت بلند کرتا، یہاں کی زبان بجائے خود معتبر

---

[1] سیّد ولی محمد نظیر "عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور سن شعور کو وہیں گذارا، پھر اکبر آباد پہنچے"... ...... "آپ کے والد بزرگوار کا نام سید محمد فاروق ہے۔ جو سادات بارہہ میں سے تھے۔ اور عظیم آباد خاص میں کسی نواب کے مصاحب تھے۔" پیدائش ۱۱۴۸ھ۔

(پیامِ نظیر، از عبدالمجید حمید تاج محلی، رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء، ص ۱۶۳-۱۶۲)

قرار پائی اور نئی طرز کی شاعری وجود میں آئی۔"[1]

ممکن ہے لکھنؤ کی طرز ایک حد تک "ایجادِ بندہ" ہو۔ لیکن وہ ایجاد نہ تو بڑے انحراف و اقدام فن کی دلیل ہے اور نہ مستحسن۔ میرا خیال اس سلسلے میں یہ ہے کہ کئی میلانات ادب وشعر جو لکھنؤ میں نمایاں ہوئے اُن کا آغاز دہلی میں ہو چکا تھا۔ بلکہ بعض لکھنوی میلانات کی ابتداء دکن میں ہو چکی تھی۔ دبستانِ لکھنؤ میں برتی جانے والی شاعرانہ صنعتیں کوئی نئی نہیں۔ وہ فارسی اور عربی شاعری سے لی گئی ہیں۔ اہلِ دکن نے بھی انہیں برتا ہے اور اہل دہلی وعظیم آباد نے بھی۔ صرف یہ ہوا ہے کہ شعرائے لکھنؤ کے ایک طبقہ نے ان صنعتوں کو بے تکے پن سے برتا ہے۔ اور اپنی صناعت کو مصنوعی بنا دیا ہے۔ دہلی اور لکھنؤ میں داخلیت و خارجیت کا فرق بھی زیادہ گہرا نہیں۔ دبستانِ دہلی کا عام مزاج داخلیت کی طرف مائل ہے اور لکھنؤ اسکول کا عمومی مذاق خارجیت کی جانب۔ لیکن دہلی میں بھی خارجیت کے نمونے نہ صرف نصیر دہلوی اور ذوق کی شاعری میں ملتے ہیں۔ بلکہ میر، درد، سوز، مومن، اور غالب تک کے کلام میں خارجیت موجود ہے۔ اسی طرح دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کے فن میں داخلیت بھی پائی جاتی ہے۔ مصحفی اور انشا، تو دہلی سے ہی لکھنؤ گئے۔ ان کے کلام کے علاوہ آتش، ناسخ، انیس و دبیر کے

---

[1] "بہار کی اُردو شاعری" صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء ص ۱۷

کے فن میں بھی داخلیت ہے۔ ہم اگر سودا اور انیس کے فن کا مطالعہ کریں، تو ہمیں یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ اُن کے یہاں داخلیت و خارجیت کا اچھا خاصا توازن پایا جاتا ہے۔ میرتقی میر اور میرحسن کی مثنویوں کا آرٹ بھی امتزاجی اور متوازن ہے۔

دبستانِ عظیم آباد دِلّی اسکول سے مماثلت ضرور رکھتا ہے۔ مگر اس مماثلت کی وجہ اتنی سطحی نہیں کہ دھلی سے شعراء عظیم آباد آئے اور ان کا اثر پڑا۔ یا یہاں کے شعراء دلّی گئے اور وہاں کی نقالی کرنے لگے۔ دہلی کا اثر سارے مراکز اُردو پر ملک بھر میں پڑا ہے۔ عظیم آباد اس سے مستثنیٰ نہیں۔ لیکن دِلّی اور عظیم آباد میں مماثلتِ فن کے اسباب اس اثر و تاثر کے علاوہ بھی ہیں۔ تاریخی وجوہ سے دہلی اور پٹنہ کی فضا ایک جیسی تھی۔ زندگی اور اس کا ماحول ایک جیسا تھا۔ دھلی میں اگر حملۂ نادر و ابدالی اور سکھ و مرہٹہ بغاوت و یورش کی وجہ سے سماج اور حکومت کی بُنیادیں ڈانواں ڈول تھیں۔ اور ایک عام یاس وحسرت درد و اضمحلال جاری وساری تھا، تو پٹنہ پر بھی بنگالہ سے انگریزوں کی سازشوں وحملوں نیز مرہٹہ گردی کا عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔ زندگی بےچین و دردمند تھی۔ اِن دونوں کے درمیان لکھنؤ ایک جزیرہ تھا۔ عارضی طور پر رُومان پرور۔ مگر پٹنہ اور دِلّی کا ایک حال تھا۔ ایک جیسے ماحول میں دونوں مقاموں کے فن کاروں کا ایک جیسا رَدّعمل بھی ہوا۔ فن کاروں کی انفرادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عظیم آباد اسکول کے فنکاروں

میں داخلیّت اور درد و سوز، یاس وحسرت اُنہیں اسبابِ زندگی سے پیدا ہوئی، جن اسبابِ حیات سے دبستانِ دہلی میں وجود میں آئی تھی اور یہ اسباب مقامی تھے۔ عظیم آباد اسکول کے فن کاروں کے اخلاص تجربہ اور صداقتِ فن کی دلیل اُن کے کلام کی تاثیر ہے۔ وہ دِلّی کے محض مقلّد اور نقال ہرگز نہیں تھے۔ یہاں کے فن میں خارجیت کے نمونے بھی ملتے ہیں اور فرداً فرداً فن کاروں میں انفرادیّت و جدّت کی بھی ایسی کمی نہیں۔ منفرد صنّاع تو ہر اسکول میں قلیل تعداد میں ہوتے ہیں۔ دبستانِ عظیم آباد کے فن کاروں میں جدّت و اختراع کا مادّہ تو اتنا تھا کہ جب دورِ آخر میں یہاں دبستانِ لکھنؤ کا رنگ جمنے لگا تو بہت جلد عظیم آباد اسکول کے اساتذہ نے مقامی اور لکھنوی رنگ و آہنگ کو ترکیب دے کر ایک تازہ کار اسلوب وطرز پیدا کر لیا۔ اُنہوں نے دہلی اور لکھنؤ کی خوبیوں کو اپنایا اور خامیوں سے کنارہ کش رہنے کی کوشش کی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُنہوں نے اپنی رُوح اور مزاج کے امتیاز کو قائم رکھا، روایات کے محاسن میں نئی تبدیلیوں کے اچھے عناصر کو سمویا، اور اُردو اَدب کے خزانے میں اضافہ کیا۔ خود قاضی عبدالودود صاحب کو تسلیم ہے کہ "عہدِ آبرو و مضمون کی ایہام بندی سے اس صوبہ کے شعراء کو کچھ سروکار نہیں رہا" (بہار کی اُردو شاعری' عید نمبر ۱۹۵۳ء، صدائے عام، پٹنہ)۔

اِس باب کے اختتام پر میں علّامہ ندوی کے اقوال کو نقل کرتا ہوں:-

"صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں غلط نہیں لکھا ہے کہ دِلّی اور لکھنؤ کے بعد یہ شہر اُردو کا تیسرا مرکز ہے .... دِلّی کی تباہی کے بعد جس طرح لکھنؤ میں نوابی قائم ہوگئی، بہار و بنگال میں الگ مسندیں لگیں' .... آخر میں بنگال کی نظامت سے الگ ہوکر یہ صوبہ ایک مستقل نظامت کی صورت میں منتقل ہوگیا .... اس خود مختارانہ عہد حکومت کا بانی راجہ شتاب رائے کا خاندان تھا ...... راجہ خود بھی شاعر تھا۔ اور شتاب تخلّص کرتا تھا .... راجہ شتاب رائے کے علاوہ جو صوبہ دار آتے وہ بھی مرکزی کمزوری کے باعث اپنی ایک مستقل شان رکھتے تھے، اور اس عہد کے لوازم دربار کے مطابق شعر و سخن کی سرپرستی اور قدر دانی میں بھی حوصلہ دکھاتے تھے[1]"

بہار میں اُردو ادب کا سرمایہ کثیر ہے۔ میں اُن میں سے منتخب فن کاروں کے خزانہ سے زر و جواہر پیش کروں گا۔ میں اُن کی ساری دولت منظرِ عام پر نہیں لا سکتا۔ کیونکہ میرا دامن تنگ ہے۔ میں انتخاب میں چند باتوں کو پیش نظر رکھوں گا۔ اوّل یہ کہ میں اہم فن کاروں کو چُنوں گا۔ دومؔ

---

[1] کلام شاد پر مقدمہ، نقوش سلیمانی، ص ۹۵-۳۹۴۔

نیز ملاحظہ ہوں' نقوش سلیمانی صفحات ۱۲۹' ۲۶۹- ۲۵۹ و ۴۱۷ - ۴۰۰ +

یہ کہ انتخاب اس لحاظ سے بھی ہوگا کہ اُردو کی متحدہ وراثت اور غیر فرقہ وارانہ حیثیت ثابت ہو۔ سوئم یہ کہ اُن ادبی نمونوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی جن سے لوگ عمومی طور پر واقف نہیں۔ میرا دائرہ انتخاب سترہویں صدی عیسوی کے اواخر سے اُنیسویں صدی کے قریبًا وسط تک ہوگا۔ میں پیشکش میں یہ ترتیب ملحوظ رکھوں گا کہ پہلے شعراء کا بیان ہو، پھر تذکرہ نویسوں کا اور بعد ازآں نثر نگاروں کا۔

خطۂ بہار میں کول، ڈراوڑ، آریہ، ترک، پٹھان، عرب وغیرہ نسل کے لوگ بستے ہیں۔ ان کے آباء واجداد مختلف اوقات میں یہاں آکر بسے۔ میرے نزدیک جو یہاں آکر، یہاں کا ہو رہا وہ اسی دیار کا رہنے والا کہلائے گا اور اسی خطّہ کی طرف منسوب ہوگا۔ متاخرین میں تورانی، ایرانی، اورعرب خاندان مغربی ہند سے یا بیرون ہند سے براہ راست 'بہار' میں آکر آباد ہوئے۔ ان میں بھی اُردو شاعر و ادیب پیدا ہوئے اور یہاں کے قدیم باشندوں میں سے بھی اٹھے۔ بعض لوگ دھلی سے عظیم آباد آئے اور اپنی شاعری ساتھ لائے۔ مثلاً میر باقر حزیں اور فقیہہ صاحب دردمند۔ " دردمند دکنی تھے، مگر ان کی شاعری نے دکن نہیں دھلی کی آغوش میں پرورش پائی تھی "

رُخ (الف)

بہار میں اُردو شاعری

سنہ ۱۶۷۰ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

مرزا عبدالقادر بیدلؔ

(۱۰۵۴ھ/۱۶۴۳ء تا ۱۱۳۳ھ)

عبدالقادر "خلف مرزا عبدالخالق۔ متوطن عظیم آباد، ۱۰۵۴ھ/۱۶۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ایک مدت تک ناظم بنگالہ شہزادہ محمد اعظم خلف اورنگ زیب کے دربار سے منسلک رہے۔ پھر دکن کی سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ عرصہ دکن میں رہنے کے بعد دلی چلے آئے اور عمر کا بقیہ حصہ وہیں گزارا۔ ماہ صفر ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا[1]۔"

صفیرؔ بلگرامی "تذکرہ جلوۂ خضر، جلوۂ پنجم میں لکھتے ہیں :-

"یہ بھی مصلحانِ اردو میں شمار ہوتے ہیں گو کہ فارسی فرماتے تھے مگر خود اپنے طور پر اردو بھی کچھ کہہ گئے ہیں ....
...... بیدلؔ مرزا عبدالقادر عظیم آبادی عمدہ سخن طرازوں سے ہیں۔ اقسام نظم میں پایہ بلند اور اسلوب نثر میں رتبہ ارجمند رکھتے ہیں .. .. بلدۂ عظیم آباد پٹنہ مین پیدا ہوئے اور ہندوستان میں نشو و نما پائی .. .. اور سوم صفر ۱۱۳۳ھ میں انتقال کیا[2]۔"

---

[1] تاریخ شعرائے بہار، سید عزیزالدین احمد بلخی راز عظیم آبادی، ص۶

[2] جلوۂ خضر، جلد اوّل ص۹۸-۹۴، بہ حوالۂ تذکرۂ سروِ آزاد۔ مولفہ سید غلام علی آزاد بلگرامی۔ (بقیہ ص۱۹۷ پر)

مرزا بیدؔل کی جائے پیدائش میں اختلاف ہے۔ اُنہیں کوئی بُخاری کہتا ہے، کوئی لاہوری، کوئی دہلوی، کوئی اکبر آبادی اور کوئی عظیم آبادی۔ بندرابن خوشگو نے اپنے تذکرہ 'سفینۂ خوشگو' میں بیدؔل کو اکبر آبادی لکھا ہے۔ علّامہ آزاؔد بلگرامی نے اپنے تینوں تذکروں یعنی 'ید بیضا'، 'خزانۂ عامرہ' اور 'سروِ آزاد' میں بیدؔل کو عظیم آبادی بتایا ہے۔ آزاؔد بلگرامی، بیدؔل کی وفات کے وقت سترہ[1] سال کے تھے۔ مصحفی کے تذکرہ 'عقد ثریا' میں بھی بیدؔل کو عظیم آبادی تسلیم کیا گیا ہے۔ علّامہ سلیمان ندوی کا خیال بھی یہی ہے کہ بیدل کا مولد و منشا صوبۂ بہار تھا۔ اس عظیم المرتبت شاعر کی طفولیّت اور آغاز شباب کا زمانہ بہاؔر ہی میں گزرا ہے۔ بیدؔل کے والد اور چچا مرزا قلندر نے آرّہ ضلع کے ایک بزرگ شاہ کماؔل قادری سے بیعت کی تھی۔ وہ بھی انہی کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے[1]۔

بیدؔل عہدِ عالمگیر میں پٹنہ سے دہلی گئے تھے۔ وہاں شاہزادہ اعظم و معظم کے اُستاد و اتالیق مقرر ہوئے۔ اُنہوں نے فرخ سیرؔ کا زمانہ بھی دیکھا۔ ایک دفعہ شاہزادہ محمد اعظم نے اپنی مدح میں قصیدہ کی فرمائش

(باقی حاشیہ ص۱۹۶ کا) بیدل کی تاریخ وفات حسب ذیل ہے:۔

سربر آوردۂ ارباب سخن ⁂ از غم آباد جہاں خورم رفت

گفت تاریخ وفاتش آزاد ⁂ میرزا بیدل ازیں عالم رفت ۱۱۳۳ھ

'بہار اور اُردو شاعری'، در دائی، ص۳۰۔ بحوالہ چمنستانِ شعرا ص۴۴

[1] رسالہ نقوش، لاہور: شخصیات نمبر ۲، ص۱۳۴۱۔

اور منصب کی افزائش کی پیشکش کی۔ بیدل نے اُسی وقت نوکری ترک کی اور گوشۂ عزلت اختیار کیا۔ باقی عمر فقر و توکّل میں بسر کی۔ صوفی مشرب تھے اور شاہد معنی کے فریفتہ[۱] "دن کو گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے اور شام سے آدھی رات تک شعراء اور شاگردوں سے صحبت رکھتے تھے[۲]" بڑے بڑے امراء اور ارکانِ سلطنت ان کے معتقد تھے اور ان کا اعزاز و اکرام کرتے تھے۔ مثلاً نواب شکر اللہ خاں، نواب آصف جاہ، امیر الاُمراء سیّد حسین علی خاں بارہہ وغیرہ۔ صدر بیگ خاں نے امیر الامراء کو خنجر سے ہلاک کیا۔ شاید یہ قتل فرخ سیر کے اشارہ سے ہوا تھا۔ اس کا انتقام امیر الامراء کے بھائی سیّد عبداللہ خاں وزیر نے بادشاہ سے لیا۔ اُس پر بیدل نے تاریخ کہی[۳] ؎

دیدی کہ چہ با شاہ گرامی کردند ‏ ‏ صد جور و جفا براہ خامی کردند

تاریخ چو از خرد بجستم فرمود ‏ ‏ سادات بوے نمک حرامی کردند

یہ تاریخ بہت مشہور ہوئی۔ سادات بارہہ کے خوف سے بیدل دہلی سے لاہور چلے گئے۔ عبداللہ خاں ناظم لاہور نے بہت عزّت و تعظیم کی۔ جب سادات بارہہ کا دَور ختم ہوگیا، مرزا پھر دہلی آ گئے۔

۱۔ 'جلوۂ خضر' صـ۹۵، جلد اوّل ۲۔ 'جلوۂ خضر' جلد اوّل صـ۹۷ 'بحوالہ روزنامچہ تبصرۃ الناظرین

۳۔ 'جلوۂ خضر' صـ۹۵ - مرزا بیدل محلہ پٹنہ دیبی کے رہنے والے تھے۔ بہ حوالہ 'حمید عظیم آبادی' ندیم، بہار نمبر ۱۹۴۰ء۔ صـ۱۵۶، حاشیہ۔

بیدل، ہند تا ایران شہرت رکھتے تھے " انہوں نے بیدل تخلص شیخ عبدالعزیز عزت کے دامنِ تربیت میں اختیار کیا تھا"[1] بیدل ہی نے دکن کے مقابلہ میں شمالی ہند کی لاج رکھ لی"[2] " فارسی کی طرح اُن کے اردو کلام میں بھی زوربیان اور پاکیزگی خیال نمایاں ہے"[3] مؤلف چمنستان شعرا لکھتے ہیں :

" حقا کہ در سرزمین ہندوستان مثل ایں سخن پناہ صاحب کمالے بقید از خواب عدم سر بر نداشتہ"[4]

میرحسن دہلوی تحریر کرتے ہیں :

" مرزا عبدالقادر بیدل صاحب طرز فارسی ... ... دو شعر ہندی از آن بزرگوار مسموع شدہ[5] ... ... "

۵

مت[6] پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

صفیر بلگرامی نے "تذکرہ سخن شعرا، مؤلفہ عبدالغفور خاں نساخ کے حوالہ سے صرف ایک شعر لکھا ہے اور وہ بھی یوں :-

---

[1] "تاریخ شعرائے بہار" بلخی ص۶
[2] "بہار اور اُردو شاعری" دردائی ص۲۶
[3] "بہار اور اُردو شاعری" دردائی ص۲۷
[4] "چمنستانِ شعرا ص۴۴ - مؤلفہ رائے لچھمی نرائن شفیق -
[5] "تذکرہ شعرائے اُردو" میرحسن ص۵۹ -
[6] "تذکرہ شعرائے اُردو" ، میرحسن ، ص۵۹
[7] " جلوہ خضر" جلد اوّل ص۹۸

اس دل کے آستاں پر جب عشق آ پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم ہیں

اگر پہلے اور دوسرے دونوں اشعار کو دیکھا جائے تو "ہم ہیں" مناسب و موزوں نہیں ثابت ہوگا۔ میرے خیال میں میر حسن کے نقل کردہ اشعار ہی صحیح ہیں۔ صفیر بلگرامی نے ایک اور شعر سید موسیٰ کاظم بلگرامی کاظم کی بیاض سے نقل کیا ہے[1]:

شہرۂ حسن سے از بسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے چہرے سے جھگڑتا ہے کہ کیوں خوب ہوا

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے رسالہ اُردو جنوری ۱۹۲۳ء میں بیدل کی طرف ایک بھاشا کا شعر منسوب کیا ہے۔ لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔ انہوں نے لکھا ہے :-

"اُس عہد میں اُردو کی ابتدا تھی ...... چنانچہ جب حضرت بیدل گردش روزگار سے چلنے لگے تو اپنی مُنھ بولتی ماں کے ہاں ...... رخصت ہونے گئے تو کہا[2]

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آپن کیس
پٹنہ نگری چھاڑ دین اب بیدل چلے بدیس

حمید عظیم آبادی لکھتے ہیں :

---

[1] جلوۂ خضر، جلد اول ص ۹۸ [2] رسالۂ اُردو، جنوری ۱۹۲۳ء ص ۵۸

"بیدل جب پٹنے کو خیرباد کہتا ہے تو یہاں کے درو دیوار پر بحسرت نظر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے[1] ؎

سر اوپر مایا رام نہیں دشمن آپن کیس
پٹنہ نگری چھوڑ دہن بیدل چلے بدیس

حمید عظیم آبادی نے بھی کوئی حوالہ نہیں دیا۔ نیز پرافسر نجیب اشرف کے پیش کئے ہوئے شعر سے تھوڑا اختلاف بھی ہے۔ میں دردائی کی رائے سے ایک حد تک متفق ہوں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مجھے اس شعر کے بیدل کی طرف منسوب کئے جانے سے اختلاف ہے .... شعر کے نقل کرنے سے قبل اس کے ماخذ کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے تھا[2] "

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا بھاشا کا شعر روایتاً مشہور چلا آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں یہ بیدل ہی کا شعر ہو۔ صاحبِ جلوۂ خضر نے 'تبصرۃ الناظرین' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بیدل کے یہاں ایک صحبتِ ادبی برپا تھی۔ اُس مجلس میں چنتامن کا کبت پڑھ کر سنایا گیا۔ مرزا بولے "میں ہندوی نہیں سمجھتا مجھے سمجھا دو[3] "

مگر یہ تو ہو سکتا ہے کہ بیدل پرانی ہندوی نہ جانتے ہوں اور آخری

---

[1] 'بہار اور اردو' ندیم' بہار نمبر ۱۹۴۰ء [2] 'بہار اور اُردو شاعری' معین الدین دردائی ص ۲۹
[3] ' جلوۂ خضر' جلد اوّل، ص ۹۷

دور کی بہاری آپ بھرنش سے تھوڑا بہت آگاہ ہوں اور سر را ہے پوربی بھاشا میں ایک پنکتی کہہ گئے ہوں۔

سیّد عماد الدّین عماد پھلواروی

(۱۰۶۵ھ تا ۱۱۲۴ھ)

سیّد عماد الدین قلندر پھلواروی[1] ۱۰۶۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی۔ پھلواری شریف کا مرکز فیض حضرت منہاج راستی کا قائم کردہ ہے۔ آپ حضرت مخدوم بہار کے خلفاء میں سے تھے۔ پھلواری کا مرکز آٹھویں صدی ہجری مطابق چودھویں صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ حضرت عماد قلندر پھلواروی اسی سلسلہ کے صوفیا میں تھے (حکیم محمد شعیب صاحب مرحوم کے گھر میں اس خاندان اصفیا کے ملفوظات و مخطوطات کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے۔ میں نے مرحوم سے استفادہ کیا تھا) نمونۂ کلام ملاحظہ ہو[2] ؎

بیچ نظر کے ایدھر اودھر ہر دم آوے جاوے ہے
بل بے ظالم تس پر ٹک دیکھے کو ترساوے ہے

۱؎ قلمی نسخہ "تجلیات الانوار" "تذکرۂ شیوخ بہار" حصہ اول۔ مؤلفہ۔ حکیم محمد شعیب قادری پھلواروی۔ حکیم صاحب مرحوم پھلواری صوفیاء کے خاندان سے تھے۔ آپ کا انتقال ستمبر ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ ۲؎ "بہار اور اردو شاعری" پرافسر معین الدین دردائی، ص ۱۶ دردائی نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میرے خیال میں پھلواری شریف کے کسی مخطوطہ سے حضرت عماد کا کلام حاصل ہوا ہے۔

جب سنی چھوڑس کھانا پینا تیرا دوانہ اُلفت میں
خون جگر کا پیوے ہے اور غم غصّہ کو کھاوے ہے
آوے اپنے ہاتھ وہ مورکھ نہیں عمادؔ اب اس کی آس
اس کے کارن کون جتن ہم کیا جو نہیں آوے ہے

دیگر[1] ؎ جب بیچ چمن کے فصلِ بہار آوے ہے
تب جوش جنون تلوا مرا کُھجلا وے ہے

رُباعی ؎ یارب نگہہ عنایت ایدھر کر دو
کانٹا ہے عمادؔ تم گل تر کر دو
ہے رنگ گنہ سیتی رخ اس کا کالا
تم غازۂ عفو سیں منور کر دو

(رسالہ معیار، پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء ص ۶۷ مخطوطہ کتب خانۂ خانقاہ عمادیہ'
منگل تالاب، پٹنہ)

---

[1] بہار اور اُردو شاعری : دردائی ص۷ حاشیہ۔

ملّا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی

(سنہ ۱۰۷۰ھ تا سنہ ۱۱۶۲ھ)

میر محمد علیم تحقیق خلف میر بدیع الدین سمرقندی عرف میر مبیتن[1] سنہ ۱۰۷۰ھ میں پیدا ہوئے۔ بانوے[۹۲] برس کی عمر میں سنہ ۱۱۶۲ھ میں انتقال کیا[2]۔ ان کے شاگرد لالہ اجاگر چند الفت نے تاریخ وفات کہی۔ ع

فرمود کہ تحقیق شدہ واصل حق
۱۱۶۲ھ

پروفیسر دردائی تحقیق کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"بعض[3] مورخین نے مرزا بیدل کے سر پر اولیت کا تاج رکھا ہے، لیکن ملا محمد علیم تحقیق عظیم آبادی بیدل سے پہلے گذرے ہیں ...... یہ عالمگیر کے عہد میں تھے، اور شاہجہاں کا آخری زمانہ بھی انہوں نے دیکھا تھا"

لیکن پروفیسر مذکور نے نہ تو تحقیق کا سنہ پیدائش دیا اور نہ سنہ وفات۔ انہوں نے تحقیق کو بلا حوالہ و دلیل بہار میں اردو کا سب سے پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔ اس کے برخلاف عزیز الدین بلخی نے تحقیق کی پیدائش اور

۱؎ پٹنہ کا محلہ مبیتن گھاٹ غالباً انہیں کے نام سے موسوم ہے۔

۲؎ تاریخ شعرائے بہار، بلخی ص۸ و ندیم بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء ص۱۵۷، حاشیہ۔

۳؎ بہار اور اردو شاعری، معین الدین دردائی، ص۱۲

وفات کے سنہ دیئے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بیدلؔ، عمادؔ و تحقیقؔ ہم عصر شعراء ہیں۔ مگر بیدلؔ، عمادؔ سے گیارہ[11] سال اور تحقیقؔ سے سولہ[16] سال بڑے تھے۔ مرزا کا انتقال حضرت عمادؔ کی وفات کے نو[9] سال بعد ہوا، اور تحقیقؔ کے انتقال سے انتیس[29] سال پہلے۔ تحقیقؔ نے لانبی عمر پائی۔ بہرحال بیدلؔ کو اولیت حاصل ہے۔ ہاں یہ ثابت نہیں کہ اُردو شاعری کی طرف پہلے بیدلؔ، یا عمادؔ یا تحقیقؔ نے توجہ کی۔ فارسی کا ایک ضخیم دیوان تحقیقؔ نے یادگار چھوڑا ہے۔ غرض یہ کہ وہ بھی بیدلؔ کی طرح فارسی کے مفتون تھے۔ دردائیؔ شاہ عمادؔ کو تحقیقؔ کا ہمعصر مانتے ہیں:

"ملّا محمدؐ علیم تحقیقؔ ہی کے ہم عصر سیّد عماد الدین عمادؔ (۱۰۶۵ھ تا ۱۱۲۴ھ) اور غلام نقشبند سجادؔ (۱۱۱۶ھ تا ۱۱۷۳ھ) ہیں۔"

(بہار اور اُردو شاعری، ص۱۵)

ممکن ہے شاہ عمادؔ کے سنہ وفات سے دردائیؔ کو دھوکا لگا ہو۔ اور چونکہ بیدلؔ کی وفات ۱۱۳۳ھ میں ہوئی۔ دردائیؔ نے بیدلؔ کو عمادؔ کے بعد کا شاعر سمجھ لیا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ بیدلؔ مذکورۂ صدر شعراء میں سب سے بڑے تھے۔

ملّا محمد علیم تحقیقؔ کو مرزا معز موسوی خان فطرتؔ[1] سے تلمذ تھا۔ فطرتؔ ۱۰۸۲ھ میں ایران سے ہندوستان آئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا۔

---

[1] 'تاریخ شعرائے بہار' عزیز الدین بلخی ص۹ و 'بہار اور اُردو' از حمید عظیم آبادی۔ ندیم 'بہار نمبر' سنہ ۱۹۴۰ء ص۱۵۶

عظیم آباد میں دیوانی پر معمور ہوئے۔ تحقیق نے بھی مرزا موسوی کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ فطرت کے پٹنہ آنے سے پہلے بیدل دلّی جا چکے تھے۔ اور اس وقت تحقیق کا عنفوانِ شباب بھی شروع نہیں ہوا تھا۔

تحقیق کو سیاحت کا بھی شوق تھا۔ دِلّی اور بنگال کا سفر اختیار کیا۔ پھر اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ زین الدین خاں، ہیبت جنگ کو اِن سے بہت عقیدت تھی۔ عظیم آباد کے اُمرار و حکّام مُلّا صاحب کو بہ عزت اپنے ساتھ مسند پر بٹھاتے تھے۔[۱]

تحقیق عالم تھے، معقولات و منقولات سے آگاہ۔ فنِ موسیقی کے ماہر تھے اور تیر اندازی میں کامل۔ پیراکی میں مہارت تھی۔ مُرغ، بٹیریں اور مینڈھے لڑانے کا شوق تھا۔ صاحب سیر المتاخرین ان کی نسبت لکھتے ہیں:

"میر محمد علیم کہ از مشاہیر و مشائخ عظیم آباد از جملہ شاگردان مرزا معز موسوی خان فطرت تخلص بود۔ شہرت علمش بسیار و شاعریش ہم اشتہار دارد"

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے[۲]:

ے سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دہا ہے
دیکھا ہوں جو تجھ مکھ کون نینا میرے چندھرا ہے

۱؎ "نوائے وطن، شاد عظیم آبادی۔ نوٹ:۔ "ملّا تحقیق کا مولد محلہ مغلپورہ، عظیم آباد تھا" ندیم' بہار نمبر ۱۹۴۰ء ص۱۵۷۔ حاشیہ۔ ۲؎ 'بہار اور اُردو شاعری، ندوائی ص۱۵۱ بلا حوالہ۔

دیگر ؎ جھگڑا باندھ دلموں سماجا
سلونورے ایدھر کون آجا

حمید عظیم آبادی نے اشعار کو یوں نقل کیا ہے[1] :

؎ جھگڑا باندھ کر دل موں سماجا ؛ سلونو سانورے ایدھر کو آجا

دیگر ؎ سرجن تیرے مکھڑے میں سورج کی کرن دیا ہے
دیکھوں ہوں جو تجھ کھ کون نیبنا میرے چندھرا ے

تجمبق، دِلّی بھی گئے تھے۔ وہاں کے اہل کمال سے ملتے اور شعروشاعری کی محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ اُن کے ہندوستان بھر میں صدہا شاگرد تھے۔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ فارسی کا ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا۔

قاضی عبدالغفار غفا

حضرت عماد کے بیٹے " شاہ سجاد کے ہمعصر[2] " ایک شاعر قاضی عبدالغفار غفا گذرے ہیں۔ یہ پٹنہ ضلع کی ایک بستی رہوکی کے رہنے والے تھے۔ اِن کی تصنیف جواہرالاسرار کا ایک قلمی نسخہ پرافسر دردائی کو ملا ہے۔ دردائی

---

[1] 'بہار اور اُردو' 'ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء'، صہ ۱۵۶، بلا حوالہ۔ [2] 'بہار اور اُردو شاعری'، دردائی، ص۱۷۱

صاحب نے اپنے مقدّمہ کے ساتھ اسے ۱۹۳۷ء میں شائع کر دیا تھا۔ جواہر الاسرار تصوّف کی ایک منظوم کتاب ہے جو ۱۱۱۶ھ میں لکھی گئی۔ اگر صوفی شاعر غفا نے ۱۱۱۶ھ میں کتاب تصنیف کر لی تھی تو وہ سجّاد سے یقیناً بڑے تھے۔ کیونکہ یہی سجّاد کا سنہ پیدائش ہے (۱۱۱۶ھ)۔ گویا غفا نے عمّاد اور تحقیق کے دَور کا بھی اچھا خاصا حصّہ پایا۔ میرے خیال میں غفا کو سجّاد کا ہم عصر کہنا مناسب نہیں۔ انہیں تحقیق کا ہم عصر زیادہ صحیح طور پر کہا جا سکتا ہے۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ؎

ظاہر دھوئے پاک نہ ہوئے   پاک ہوئے جب باطن دھوئے
جہین معراج نمازی سوئے   بن معراج نماز نہ ہوئے

کہے غفا، سنسار مون دیس بدیس   سائیں آپے آپ کو سوائے مانگ بھیس

آگ پڑے نن پیم کے جل بل بوجھا جیو   کہے غفا تم آگ مون دے جیو پایا پیو

کہے غفا سُن کان دے ایسے آیا ہاتھ   مورت صورت رنگ کا لے گیا سائیں ساتھ

کہے غفا سبھ خوب ہے جگ مون ایہی پاپ   پرگھٹ ہوا پیو اور کچھ لوگ کہاویں آپ

غفا سمندر پیم کا دیکھا غوطہ مار   جو تھے موتی بھید کے آئے ہمارے ہاتھ

کہے غفا جنھ دیکھا دوئی   پیم پنتھ مون مشرک ہوئے

کہے غفا جنھ آپ بھلایا   تن سائین کا درشن پایا

بھیجا پوتھی پریم کی نانوں دھرا قرآن   مانک مانھ سمائے کے آپی مانجے آن

اُٹھ پردیسی کیا سوائین پیم جن دھوئے   دُور گیے سبھ سنگ کے تون رہا اکیلا ہوئے

تن کا تانبا آگ مون پانی کرے جو کوئے   ڈارے بوٹی پریم کی تب جائے کنچن ہوئے

آئے کیتی بار مل سودا کینھ ہاٹ   کوئی سودا لے پھرا کوئی بھولا باٹ

پیم پنتھ مون ایک ہے سُن مسجد اور دیر   جب دیکھا تب پیا کون نین نہ آیا غیر

سائیں کا کوئی اور نہ پاوے   پل پل لاکھ بھیس دکھلاوے

باسن مانٹی کہے نہ کوئے   آخر باسن مانٹی ہوئے

لوگ باورے پیہ کون ڈھونڈیں دیس بدیس   پیہ پرگھٹ جگ ماتھ ہے آپلے مانک بھیس

اُللہ اللہ من جپے جیون کوئی دن رین   جہت اللہ سنسار مون اور نہ آوے نین

(بہار اور اُردو شاعری ، درّانی صفحہ ۱۸ تا صفحہ ۲۰)

غفا کے کلام میں صوفیانہ خیالات اور ہند کی بھگتی تحریک کا اثر نمایاں ہے۔ زبان[۱] و بیان کے لحاظ سے ایسی فضا بندھتی ہے کہ ہم عالم تخیل میں میرا، نام دیو ، نانک اور کبیر کی دُنیائے جذبات میں پہنچ جاتے ہیں۔ درّانی لکھتے ہیں :

"اس کی زبان خاصی صاف ہے۔ البتہ سجّاد وغیرہ کی طرح

---

۱ مون = میں + سائیں = پروردگار، مالک + مانک = مانش، انسان، منشیہ + پیم = پریم۔ محبت + جیو = جی + پیو = پی + سبھ = سب + پرگھٹ = پرگٹ ، ظاہر + جھ = جس نے + پتھ = راستہ + تن = اُسی نے + پوتھی = کتاب + مانھ = میں + آپی = آپ ہی + سنگ = ساتھ + کوئے = کوئی + جائے = جاکر + کنچن = سونا + کیتی = کتنی + بیہنھ = خریدنے + ہاٹ = بازار + باٹ = راہ + پنتھ = مذہب + کون = کو + اور = انتہا ، حد + پَل پَل = لمحہ لمحہ + باسن = برتن + مانٹی = مٹی + باورئے = باورے ، پاگل + پیہ = پی ، محبوب ، خدا + جگ = دنیا + آپلے = آپ ہی + بھیس = صورت +

اِس میں مگدھی زبان کا عنصر بہت زیادہ شامل ہے ...۔"

(بہار اور اُردو شاعری ص۱۰۱)

مجھے زبان کے سلسلہ میں مذکورہ بالا بیان سے اختلاف ہے۔ میرے خیال میں غفا کی زبان ملی جُلی زبان ہے ۔ اس پر کھڑی بولی، اودھی اور برج بھاشا کا اثر بھی ہے، صرف مگدھی کا اثر نہیں ۔ خود کبیر کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ اُس عہد کی صوفیانہ بھگتی شاعری میں ایک ایسی ملوان زبان مروّج ہو چلی تھی جو کم وبیش مُلکِ ہند کے بہت بڑے علاقے میں سمجھ لی جاتی تھی ۔ ہندوستان میں ایک ہمہ گیر اَدبی زبان کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ غفا کے کلام میں مگدھی عنصر نسبتاً کم ہے ۔ اَپ بھرنش ہی کے آخری دَور میں مگدھی یا مگھی بھاشا کا زوال ہو چکا تھا ۔ اُس کی اَدبی حیثیت گویا نہیں رہی تھی ۔ مگہہ کے لوک گیت تو تھے ۔لیکن اس دیار میں اعلیٰ قسم کی شاعری نہیں ہو رہی تھی ۔ گریرسن کا بھی یہی خیال ہے ۔ اِسی عہد کے مابعد اُردو زبان و ادب کا ارتقا ہوتا ہے۔ بہار کی قدیم اُردو شاعری میں لسانی اعتبار سے مگھی بولی کا عنصر کم شامل ہوا ہے ۔ میں ذیل میں غفا کے کلام کا تجزیہ پیش کرتا ہوں :۔

"بچیو" ۔ "پیو" ۔ "مانٹی" ۔ اِن الفاظ کی ساخت برج بھاشا کی ہے ۔
افعال کی ساخت بیشتر کھڑی بولی کی ہے ، مثلاً "پایا" ۔ "آیا" ۔ "لے گیا" ۔ "دیکھا" ۔ "آئے" ۔ "دیکھا" ۔ "بُھلایا" ۔ "دھرا" ۔ "بھیجا" ۔ "رہا" ۔ ذرا مندرجہ ذیل جملوں اور فقروں کی ترکیب دیکھئے :

"کہے غفا سُن کان دے اَبسے آیا ہاتھ"۔ "لے گیا سائیں ساتھ"۔ "دیکھا غوطہ مار"۔"آئے ہمارے ہاتھ"۔"سائین کا درشن پایا"۔" بھیجا پوتھی پریم کی"۔"ناؤں دھرا قران"۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب جملے اور فقرے کھڑی بولی کے ہیں۔ اسی طرح الفاظ، جملوں اور افعال کی ترکیب و ساخت پر اودھی یا عام پوربی رنگ بھی ہے۔ مثلاً "موں"۔"کا"۔"توں"۔"ہوئے"۔"وھوئے"۔"جائے"۔ میری رائے میں کمّی اور بہاری اثرات صرف لفظوں کی ساخت میں ہیں۔ مثلاً۔"مانک"۔ "پیم"۔ "سبھ"۔ 'ابھی'۔'جھ'۔'تن'۔'دکیھ'۔'پیہ' الفاظ میں 'ھ' کی آواز کا اضافہ بہاری بولی کی خصوصیت بتائی جاتی ہے۔ مگر 'ھ' کی آواز پرتاکید مشرقی ہندی اور ایک حد تک مغربی ہندی کی خصوصیّت بھی ہے۔ ہاں پنجابی، راجستھانی، بنگالی وغیرہ زبانوں میں 'ھ' کی آواز گرتی ہے۔ 'مانک' اور 'پیم' کے الفاظ کمی، میتھلی اور بنگالی میں مروّج ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر میں یہی سمجھتا ہوں کہ غفا کی زبان پر مغربی ہندی یا کھڑی بولی کا اثر نمایاں رنگ میں غالب ہے مثلاً ع

کوئی سودا لے پھرا کوئی بھولا باٹ

مسئلہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اشعار ریختہ میں ہیں، یعنی 'کھڑی بولی'، اودھی، برج اور مگدھی زمین میں فارسی اور عربی الفاظ کے بیج بھی بوئے گئے ہیں۔ مثلاً:۔ ظاہر، پاک، باطن، معراج، نمازی، صورت، سمندر، غوطہ، مشرک قرآن، دور، مسجد، دیر، غیر، اللہ اور ساتھ ہی ساتھ نئی مند آریائی بولیوں

کے اندر سنسکرت کے تتسم شبدوں کا استعمال بھی ہوا ہے۔ مثلاً: سنسار، جگ، پاپ، پرگٹ (کا) درشن، پنتھ۔

غفاؔ کی زبان اُردوئے قدیم کے دورِ وُسطیٰ کا نمونہ ہے۔

غلام نقشبند سجّاد

(۱۰۷۳ھ تا ۱۱۲۶ھ)

آپ کا نام محمدؐ سجّاد اور عرف غلام نقشبند تھا۔ خواجہ عمادؔ الدین قلندر پھلواروی کے صاحبزادے اور حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے داماد تھے۔ مولد و مسکن قصبہ پھُلواری، متصل عظیم آباد۔ ۱۰۷۳ھ عہد عالمگیری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۲۶ھ سال جلوس شاہ عالم میں وفات پائی۔ حضرت شاہ مجیبؔ اللہ پھُلواروی اور خواجہ عمادؔ الدین پھُلواروی، ممیرے، پھُپھیرے بھائی تھے۔ اوّل الذکر، ثانی الذکر کے مُرید بھی تھے اور اُن کے خلیفہ بھی۔ شاہ عمادؔ کے انتقال کے وقت جناب سجّاد کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ جب بڑے ہوئے تو آپ کی شادی شاہ مجیب اللہ کی لڑکی سے ہوئی۔ حضرت سجّاد کی طرح حضرت شاہ آیت اللہ جوہرؔی بھی شاہ مجیب اللہ کے داماد تھے۔ اِن کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ شاہ مجیب اللہ پھُلواروی کا مزار اور محفوظ مقبرہ پھُلواریؔ شریف میں اب تک مرجعِ خاص و عام ہے۔

حضرت سجّاد پھلواروی نے فارسی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کی۔ ریختہ کا کلام قدامت کے لحاظ سے بہت اہمیّت رکھتا ہے۔ آپ کا کلام جناب محی الدین تمنّا عمادی پھلواروی کے ذریعہ حاصل ہوا اور رسالہ 'معاصر' پٹنہ میں چھپا ہے۔ عزیزالدین احمد بلخی زارؔ عظیم آبادی مؤلف تاریخ شعرائے بہار نے مندرجہ ذیل کلام نقل کیا ہے۔

صدقے ترے ساقیا آج لگا دے سبیل
وارد میخانہ ہے زاہد پرہیزگار
آپ الگ ہیں خفا دل ہے جُدا بے کہا
آپ ہی ٹک سوچئے کیا کرے سجّاد زار

(تاریخ شعرائے بہار بلخی ص۲۲)

رسالہ معاصر، پٹنہ، ماہ نومبر ۱۹۴۱ء میں حضرت سجّاد کا جتنا کلام شائع ہوا تھا وہ درج ذیل ہے:-

(۱)
ہائے زمین سخت ہے، دور ہے آسمان بھی — دم بھی گھوٹے ہے غم ستی نکلے نہیں ہے جان بھی
ایسے ہی غیروں کو تئیں کھدیو اپنے جان نثار — لاؤ گے قتلگہ کے بیچ، لیو گے امتحان بھی
بیچ تمہاری جمع ہے، رنگ جلال و ہم جمال — آنکھ ستی ستم شعار، دل ستی مہربان بھی
ہووے جو اختتام وہ، جب کہیں ہووے یہ بھی ختم — قصّہ عمر پر رہا، ہجر کا داستان بھی
آج وہ اپنے گھر ستی، نکلے ہیں فاتحہ پڑھے — جبکہ نہ میری قبر کا باقی رہا نشان بھی
ہووے ہزار جی پہ غم شرط وفا یہ ہے مگر — آنکھیں بھی خشک ہی رہیں بند رہے زبان بھی

تم ہی تو ہو ہماری جاں، تم ہی ستی تو ہی جہاں — کیونکہ نہ ہم منا دیں خبر، جان ہے تو جہان بھی
جی کے تئیں دبا کے واں جاویں کسو طرح سے پر — منہ ستی اون کے روبرو ہو سکے ٹک بیان بھی
سجدہ گزارِ آستاں تیرا غلام نقشبند
رحم کا خواستگار ہے، رحم ہی تیری شان بھی

بیداد کون جانے ہے، بیداد کے تئیں (۲) صیاد مت کہو مرے صیاد کے تئیں
گلچیں سے بڑھ کے جانے نہ صیاد کو تئیں — اتنا جتا دو مرغ چمن زاد کے تئیں
جنت ہی کی ہوس نہ تھی آخر وہ شیخ جی — دوزخ میں جو کہ لے گئی شداد کے تئیں
آساں نہیں تجھ ایسے کی تصویر کھینچنی — آئینہ کر نہ دیوے یہ بہزاد کے تئیں
غم خوش رہے کہ ایک یہی تو فراق میں — رکھے ہے شاد خاطرِ ناشاد کے تئیں
کیسے ہو آج کوئی مسلمان دیندار — جب لوگ دین سمجھے ہیں الحاد کے تئیں
ہیں طفل اشک مردمِ دیدہ کے نورِ چشم — ٹپکے ہے کون خاک پہ اولاد کے تئیں
عارض گلاب، زلف ہی سنبل، تو نرگس آنکھ — گلشن ہی ہم تو پاویں ہیں صیاد کے تئیں
طوفان اشک اور جوانی کی ناؤ، ہائے!
سمجھا دو ٹک کوئی مرے سجاد کے تئیں

جب موسمِ گل آن کے تائید کرے ہے (۳) تب جوشِ جنوں عقل کی تردید کرے ہے
پرویز و نل، و کوہکن و وامق و مجنوں — جو ہے وہ مری بات کی تقلید کرے ہے
اُٹھے گا یہاں پھر نہ کبھی شورِ تمنا — دل بیچ یہی یاس اب امید کرے ہے
جو بیچ محبت کے فنا ہووے ہے اے دل — حاصل وہی تو ہستیِ جاوید کرے ہے

جس روز کہ پہونچے ہے نئی کوئی مصیبت — اُس روز ترا خوگرِ غم عید کرے ہے

رکھے ہے جبیں در پہ ترے گنبدِ گرداں — سجدہ ترے دروازے پہ خورشید کرے ہے

گردِ سُمِ رہوار ترا پہونچے ہے جس جا — ہیبت سے وہاں خنگِ قمر لید کرے ہے

قاصد کے تئیں چاہیئے کہدے جو کہن ہیں — کیوں اپنی طرف سے کوئی تمہید کرے ہے

سجّاد، جو سمجھا ہے خود اپنے تئیں موجود
وہ فہم نہیں، معنیٔ توحید کرے ہے

ہجر کی رات بہت بھاری ہے (۴) عشق کی بات بہت بھاری ہے

بھیج دیویں نہ کلیجا اپنا — یہ ہی سوغات بہت بھاری ہے

اُلٹی جاوے ہے بساطِ دل اب — ایسی تو مات بہت بھاری ہے

نامۂ شوق کا آیا یہ جواب — اب ملاقات بہت بھاری ہے

نفی کے بعد ہے اثبات صحیح — خالی اثبات بہت بھاری ہے

کل جو بُوجھا تھا بہت ہی ہلکا — آج ہیہات بہت بھاری ہے

خوگرِ غم کے تئیں بھی سجّاد
غمِ مافات بہت بھاری ہے

جو گھڑی جاوے گذر دورِ مے و جام کے بیچ (۵) ہے بہ از عمرِ خضر گردشِ ایّام کے بیچ

خوگرِ غم کے تئیں یاد بہت آوے ہے — لحظۂ رنج جو تھا مدّتِ آرام کے بیچ

بیچ اون انکھڑیوں کے اُبلے ہے ایسی مستی — موجِ مے جوش کرے جیسے کبھو جام کے بیچ

مجھ ستی سُن لے ارے نام و نشاں کے طالب — بے نشانی ہی رہے ہے ہوس نام کے بیچ

کوئی حسرت جو رہی ٹک دلِ ناکام کے بیچ — یاس کی بیچ وہ گھُل مِل کے ہوئی یاس کے رنگ
عالم جلوہ فروزی میں سرِ بام کے بیچ — دل ہی جانے ہے جو ہووے ہے ادا خاص اُن کی

جب ستی اوس بتِ خود کام ستی کام پڑا
جی نہیں بہلے ہے سجّاد کسو کام کے بیچ

(۶)

جب خود کو یا خودی کو کھوئے — میاں خدا کو پاوے کوئے
ہوش و خرد رکھّے جو کوئے — تجھ مکھڑے پر عاشق ہوئے
جی جو نہ دُکھّے کاہے کوئے — بیٹھا بیٹھا سسکے، روئے
دُنیا ہے عقبیٰ کا کھیت — وہ کاٹے دہقاں جو بوئے
خاک آوے عاشق کے نیند — دل تڑپھے تو کیسے سوئے
ہم تو کیا جو کرے کو تھا — اَب صاحب جو ہوئے سو ہوئے
تمرے تئیں بھی ہووے عشق — تب تبلاؤ کیسا ہوئے

قطعہ

پڑھے عاشق جب کہ نماز — دیر طرف مُنہ اوس کا ہوئے
بیچ وضو کے جی ستی ہاتھ — آنسو ستی وہ مُنہ کو دھوئے

نالہ تم کھینچو سجّاد
اب چاہے کچھ ہوئے نہوئے

(۷)

مری حسرتیں دل میں گھبرانتیاں ہیں — نکلنے کی راہیں نہیں پاتیاں ہیں
تری مست آنکھوں کی یہ پُتلیاں تو — تماشا قیامت کا دکھلاتیاں ہیں

اُدھر بدلیاں ہیں، اِدھر میری آنکھیں — وہ پانی تو یہ اشک برساتیاں ہیں
صلاح اپنی آنکھوں کی اے دل سیتیں کیا — کوئی کام کی بات بتلاتیاں ہیں
خدارا بتادیں تو ٹک ہم کو سانسیں — کہاں آتیاں ہیں، کہاں جاتیاں ہیں
ارے یاس یہ حسرتیں ہیں جو میری — ترا نام سُن سُن کے گھبراتیاں ہیں
بنیں جو کہ تیرِ بلا کا نشانہ — فقط اہلِ دل ہی کی وہ چھاتیاں ہیں
سرِ بزم دکھلاویں ہیں بسکہ شوخی — وہ آنکھیں جو خلوت میں شرماتیاں ہیں
اُمیدیں جو مہمان ہیں میرے دل میں — لہو پیتیاں ہیں، جگر کھاتیاں ہیں
سُنا ہوں کہ اکثر نگاہیں تمہاری — مرے قتل کے بعد پچھتاتیاں ہیں

مُوا جائے سجّاد ہے جن کے غم میں
وہ شکلیں نگاہوں میں کیوں آتیاں ہیں

بھٹی کو چلا گیا ہوتے سحر پوچھو تو کوئی سجّاد ستی (۸)

تھا رات تلک تو کام اوس کو اشغال ستی اَوراد ستی

ٹک میری طرف سے بادِ صبا جاکر کہہ صیّاد ستی

اب جان لبوں پر بلبل کے پہونچی ہے تری بیداد ستی

تنہائی فرقت میں کیا کیا اپنا نہ یہ دل گھبراوے ہے

بہلے ہے جو ٹک یہ ناشد نی تو صرف تمہاری یاد ستی

جب آگ دھندھکتی ہو اس پر مت چھینٹو تیل خدارا تم

کیا دل کی خوشی کو پوچھو ہو لے یارو، اک ناشاد ستی

اے بادِ سحر اے موج صبا، لے جلد ہماری آکے خبر
نکلا ہے ہمارا کام سدا تیری ہی فقط امداد ستی
سُن پایا ہے اوس نے، دل میرا کعبہ ہے، گھر اللہ کا ہے
اب کھود کے اُوس کو پھکوا دے وہ بت نہ کہیں بُنیاد ستی
جو دیکھ کے ہمکو ہاتھ ملے، پچھتا وے اور افسوس کرے
بتلا دو کوئی کریں شکوہ کیا ایسے ستم ایجاد ستی
ٹھانا تو بہت، اب جاویں گے، ہرگز نہ کسو کے کوچے میں
ہر بار مگر مجبور رہے ہم اپنے دل ناشاد ستی
توڑا ہے وہ کب کا تقویٰ کو بھٹّی میں تو اوسکی گزرے ہے
سجّادہ و مسجد کی بابت مت پوچھو کچھ سجّاد ستی

سمجھاؤں ہوں یہی دلِ ناکام کے تئیں (۹) آغاز بیچ سوچ لے انجام کے تئیں

چرخِ بریں فرود ہے زینے ستی ترے
بولیں ہیں عرش لوگ ترے بام کے تئیں

کیا جاویگا بگڑ کہیں قدرت کا ہاتھ ٹک
دیوے پلٹ جو گردشِ ایّام کے تئیں

سودا کرے ہے غم کا جو بازارِ عشق بیچ
سو دُکھ کے بھاؤ بیچے ہے آرام کے تئیں

واعظ سُنا دے سدرۂ طوبیٰ کی گفتگو
ہم چاہیں اپنے سرو گل اندام کے تئیں

بولے ہے شیخ مجھ ستی ساقی کو کہدو تم
ایدھر کو بھی بڑھاوے کسو جام کے تئیں

زاہد کرے ہے کعبۂ میخانہ کا جو حج
رنگے ہے مئے میں جامۂ احرام کے تئیں

بھاوے نہیں ہے شیخ کی صحبت یہ میکشو
بیٹھا دو ساتھ مت کسو بدنام کے تئیں

سجّاد کا ہے کھنچے ہے تو آہ نارسا
توڑے ہے کوئی بھی ثمرِ خام کے تئیں

جب چال چلے انڈلاوے ہے (۱۰) جب بولے تب اتراوے ہے

ہیں دل کو یوں سمجھاؤوں یوں گھبراوے مَت، وہ آوے ہے
اندھیارے ہیں جگ مگ جگ مگ کچھ دور ستی دکھلاوے ہے
جی دیوے کا ہے بھوک ستی عاشق بیٹھا غم کھاوے ہے
اک دم پیلا، ہڈی ہڈی پہچان بھی کوئی پاوے ہے
فرقت بھی ترے دیکھا دیکھی اب میرے تئیں تڑپھاوے ہے
بن بن جو پھرے مارا مارا
سجّاد وہی کہلاوے ہے

یہ بولے کیا کہ ہے گھر میں بھی کوئی کہ نہیں (۱۱) ملے حضور سے اب در میں بھی کوئی کہ نہیں

جنون عام ہے ایسا بہار سے پوچھو کہ رہنے پاویگا اب گھر میں بھی کوئی کہ نہیں
تھی اوسکے نوج بھی، نوکر بھی اور چاکر بھی گیا مزارِ سکندر میں بھی کوئی کہ نہیں
سُنا تو وامق و فرہاد و قیس کے قصّے مُوا ہے عشق پیمبر میں بھی کوئی کہ نہیں
اُڑے جہان میں لاکھوں کے مُرغ جاں لیکن ہے دامِ زلفِ معنبر میں بھی کوئی کہ نہیں
غریب جان کے سجّاد کو جو مارے ہو
تو تم سے پوچھے گا محشر میں بھی کوئی کہ نہیں

زہد ریا سے زاہد توبہ نہیں کرے ہے (۱۲) نادان اپنے حق میں اچھا نہیں کرے ہے

کچھ بن کہیں پڑے ہو، دل کی ہوس کو آگے   اپنے تو جانتے یہ کیا کیا نہیں کرے ہے

یوں ڈوبتا جو ہووے دریا کے بیچ کوئی   تیراک بیٹھا بیٹھا دیکھا نہیں کرے ہے

ہو جاوے ہو محبت خود اپنے آپ ناصح   کوشش ستی تو کوئی پیدا نہیں کرے ہے

سجّاد یاد آیا تو بیٹھے بیٹھے بولے
اب کوئی در پہ آکے رویا نہیں کرے ہو

رسالہ نگار، لکھنؤ، بابت ماہ جنوری ۱۹۳۵ء کے حوالہ سے پرافسر معین الدین دردائی نے اپنی کتاب ' بہار اور اُردو شاعری' کے صفحہ ۱۶ و ۱۷ پر سجّاد کی وہ غزل درج کی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

بھٹّی کو چلا ہوتے ہی سحر، پوچھو تو کوئی سجّاد ستی
تھا رات تلک تو کام اُس کو اشغال ستی اوراد ستی

یہ غزل معاصرین بھی شایع ہوئی ہے۔ اشعار کی تعداد برابر ہے مگر شعروں میں خفیف اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعض افراد سجّاد اور عماد کے کلام کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔ لیکن میرے نزدیک وہ سب اصلی ہیں۔ حکیم شعیب صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ حضرت نور الحق تپاں پھلواروی نے حضرت سجّاد کے کلام کی نقل کی تھی۔ تپاں شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے پوتے اور حضرت سجّاد کے داماد تھے۔ نور الحق تپاں کی تحریریں خاندانی دستاویزات میں ملتی ہیں اور پھلواری کے شاہ صاحبان میں معروف ہیں۔ میں نے اور پرافسر حسن عسکری

صاحب نے بھی نپاںؔ کی تحریریں حکیم شعیب صاحب مرحوم کے پاس دیکھی ہیں۔
نپاںؔ کے بہت سے خود نوشت مرثیئے پھلواری میں موجود ہیں اور ہم
نے دیکھے ہیں۔ پُھلواری کے صوفیاء کے کلام ہرگز الحاقی نہیں۔ اگر تذکروں
میں ان میں سے بیشتر کا ذکر نہیں، تو یہ تذکرہ نگاروں کی نارسائی ہے۔ اب
جو مخطوطات و مسوّدات ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ تو حقائق پر سے پردے
اُٹھ رہے ہیں۔ داخلی شہادت بھی کوئی ایسی نہیں جس کی وجہ سے ہم انہیں
جعلی یا الحاقی سمجھیں۔ بزرگوں کے کلام کو شاہ نعمت اللہ (۱۱۶۰ھ تا ۱۲۴۵ھ)
پُھلواروی نے بھی مرتّب کیا ہے۔ قدیم منقولات بھی موجود ہیں اور بعد
میں ان قدیم منقولات سے نقلیں ہوئی ہیں۔ حکیم شعیب صاحب مرحوم نے
شواہد کے ساتھ میرے اور پرافسر حسنؔ عسکری صاحب کے سامنے اس مسئلہ
پر تشفی بخش روشنی ڈالی تھی اور ہم مطمئن ہو گئے تھے۔ حضرت عمادؔ اور حضرت
سجّادؔ کے کلام کے مخطوطات یا منقولات پھلواری سے باہر اب تک دستیاب
نہیں ہوئے۔

حضرت بی بی ولیہ متوفی ۱۱۳۹ھ

حضرت بی بی ولیہ بنت سیّد شاہ عزیز الدین اجہری شاہ آیت اللہ
شورشؔ (جوہریؔ و مذاقیؔ) کی والدہ ماجدہ تھیں۔ شاہ محمد مخدوم کی پہلی

شادی بی بی ولیہ سے ہوئی تھی جس سے صرف ایک صاحبزادے شاہ آیت اللہ ہوئے۔ ۱۹ر جمادی الاولی ۱۱۳۹ھ کو آپ کا وصال ہوا۔ بڑی زاہدہ و مرتاض تھیں اور علم تصوف میں دستگاہ رکھتی تھیں " اُن کے معلومات و مکاشفات اُن کے وقت ہی میں بہت شہرت پا چکے تھے۔ جن کے متعدد مجموعے پھلواری کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ عربی کی تھوڑی اور فارسی کی بہت معقول لیاقت رکھتی تھیں۔ حضرت مولانا محمد وارث رسول نما بنارسی قدس سرہٗ کی شان میں اُن کا ایک مشہور قصیدہ ہے، جس کا مطلع ہے :-

ندانم کہ در روز محشر چہ باشد
کہ جرم و گناہم گذشت است از حد

اُردو میں دوہوں کے وزن پر اُن کے بعض اشعار بہت مشہور ہیں :-

کون سنے تدبیر بتاوین — اون اپنے کن ہمکو بلاوین
حضرت کی ڈیوڑھی جو پاوین — سیر جھکا کے آنکھ لگاوین"

ندیم، بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں " شاعرات بہار " ایک گرانقدر مقالہ سید بہاء الدین احمد فیض بنیانوی سابق مدیر رسالہ 'موج نسیم'، پٹنہ (حال سب جج) کا شائع ہوا تھا۔ پرافسر درد آئی نے اپنی کتاب کے لئے اس مقالہ سے بھی مواد لیا ہے۔

(بہار نمبر ۳۵ء۔ ص۳۰۲ و بہار و اُردو شاعری ص۸۰)

لالہ اُجاگر چند اُلفت

لالہ اُجاگر چند اُلفت، پسر مہابلی۔ متوطن عظیم آباد۔ قوم کائستھ ماتھر۔ عزیزالدین بلخی کہتے ہیں کہ پہلے غربت تخلص کرتے تھے۔ پرافسر حسن عسکری اُلفت اور غریب تخلص لکھتے ہیں۔ ممکن ہے املا کی مشابہت کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہوا ہو۔ میر محمد علیم تحقیق کے شاگرد تھے[1]۔ فارسی و اُردو دونوں میں کہتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب 'ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ' میں بھی اُلفت کا مختصر تذکرہ درج ہے۔ اُن کی ایک اُردو غزل پرافسر عسکری صاحب کی تلاش وجستجو سے ملی ہے۔ ورنہ اُردو کلام مستور ہے۔ یہ غزل کسی شخص کو خط کے ساتھ بہ نظر اصلاح بھیجی گئی تھی۔ خط اُن کے مجموعۂ مکاتیب[2] میں ہے، جس کے کچھ منتشر اوراق ملے ہیں۔ اس کا زمانۂ کتابت معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن ایک خط جو اس کے قریب ہے فخرالدولہ ناظم بہار کے نام ہے اور اس کی تاریخ کتابت ۲۵ شعبان..... مطابق ۱۱۴۳ھ درج ہے۔ نواب فخرالدولہ کا عہد حکومت ۱۱۳۷ - ۴۲ھ / ۱۷۲۵ - ۳۰ء ہے۔ یہ نواب صوبہ بہار میں سلاطین مغلیہ کا آخری صوبہ دار تھا۔ ۱۱۴۲ھ / ۱۷۳۰ء میں معزول ہوا۔ بہار، بنگالہ میں شامل کر دیا گیا اور مشرقی صوبہ داروں کی منصوبہ بازیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ سلطنتِ مغلیہ میں بھی اتنا دم نہ تھا کہ ناظموں کی خودسری کی

---

[1] تذکرۂ قلمی بندرابن داس خوشگو۔ [2] 'انشائے غریب'، رسالہ معاصر، پٹنہ ص ۱۳۰-۱۲۹۔ حصہ ۳۔ دسمبر ۱۹۵۳ء۔ وصدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء۔ اُجاگر چند اُلفت، از پرافسر عسکری، ص ۴۴-۳۵

روک تھام کر سکے۔ بعد از آں فتنۂ فرنگ نے عظیم آباد کو شہر "فتنہ" (پٹنہ) بنا دیا۔

اُلفتؔ کا نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

خلوت نشینِ غم کون تماشا سین کام کیا
مخمور جام عشق کو صہبا سین کام کیا

دیوانۂ محبتِ بے اختیار کون
تکلیف حال صحبت دانا سین کام کیا

مستِ مئے الست کو ہے تشنۂ دگر
جام شراب کہنہ و مینا سین کام کیا

آباد باد ملک قناعت و مردمی
ویرانۂ خرابیِ دُنیا سین کام کیا

.. ..
.. ..

پروردہ آفتاب محبت کون روز حشر
باغ نعیم و سایۂ طوبیٰ سین کام کیا

جس کو ہے داغ سینہ و آتش تمام دل
سیر گل و تفرج لالہ سین کام کیا

لیا متاع دل کا کف اختیار سون
سودائے عشق ہے سر و سودا سین کام کیا

.. ..
.. ..

.. ..
.. ..

یارب غریب ملک معانی کو رہ نما
شکل حبیب و صورت زیبا سین کام کیا

رسالہ معاصر میں پندرہ اشعار شائع ہوئے ہیں۔ میں نے آٹھ اشعار نقل کئے ہیں۔ اس غزل میں فارسیّت کا غلبہ ہے۔ بعض مصرعوں میں کاتب کا تصرف معلوم ہوتا ہے۔ اور اس وجہ سے ناموزونیت جا بجا ملتی ہے۔ مکتوبات کا کوئی دوسرا

نسخہ نہیں کہ مقابلہ کر کے تصحیح کی جا سکے ۔ پرافسر عسکری صاحب کو "چند منتشر اوراق جو اُلفت کے چند ابتدائی خطوط اور ایک نادر غزل ریختہ پر مشتمل ہیں، ملے ہیں اور ایک دوسرا مجموعۂ مکاتیب یعنی انشائے اُلفت (فارسی) جس میں ۱۱۷۶ھ تک کے خطوط شامل ہیں اور اُلفت کے ایک ناقص دیوان فارسی کا قلمی نسخہ" دستیاب ہوا ہے۔

نوٹ:۔ آغا حسین قلی خان عاشقی تذکرۂ نشتر عشق میں لکھتے ہیں کہ اُلفت "از سکنۂ عظیم آباد بود" لیکن سفینۂ خوشگو میں ہے کہ "از مدتے در عظیم آباد ماند"۔ غالباً وہ اوائل عمر میں اپنے والد کے ساتھ دہلی سے پٹنہ آئے ۔ ان کے بھائی حکیم چند دلی ہی میں رہے ۔

ایک اور اُلفت تھے ۔ منشی منگل سین ۔ باشندہ عظیم آباد ۔ قوم کائستھ شاگرد جرأت ۔ دوسرے تھے 'اُلفتی' راجہ پیارے لال ۔ دہلی سے عظیم آباد آئے ۔ منگل سین کا شعر ہے ۔ ؎

ہر قدم پر یاں تلک آنے میں سو سو ناز ہیں
کیونکہ گھر جانے لگے شام و سحر دو چار کے

(تاریخ شعرائے بہار ص۶۶)

———o———

مہاراجہ رام نرائن موزوں (متوفی ۱۱۷۷ھ)

مہاراجہ[1] رام نرائن دیوان رنگ لال کے بیٹے اور قوم کائستھ سری واستو سے تھے۔ اُن کا آبائی وطن سہسرام ضلع میں کشن پور موضع تھا۔ تاریخ ہند میں ان کی شہرت ہے۔ مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد صوبۂ بہار کے نائب ناظم ہو گئے تھے اور عظیم آباد و بہار پر فرماں روائی کرتے تھے۔ ان کی صوبہ داری ۱۱۶۶ھ تا ۱۱۷۶ھ (مطابق ۶۳-۱۷۵۳ء) رہی۔ رنگ لال نواب محمد علی وردی خاں مہابت جنگ (۵۳-۱۱۴۳ھ / ۴۴-۱۷۳۰ء) کے متوسلین میں تھے اور رام نرائن لال تو مہابت جنگ کے پروردہ تھے۔ وہ اپنے والد کی جگہ دیوان بھی رہ چکے تھے۔ لالہ جانکی رام نائب صوبہ دار عظیم آباد کے مرنے کے بعد مہابت جنگ نے ان کو یہاں[2] کا صوبہ دار مقرر کیا۔ نواب کے جیتے جی مہاراجہ کی صوبہ داری میں کوئی خرخشہ واقع نہ ہوا۔ نواب مذکور کے بعد اُن کا نواسہ سراج الدولہ حکمرانِ بنگال و بہار و اڑیسہ ہوا۔ (۷۰-۱۱۶۹ھ / ۵۷-۱۷۵۶ء)۔ نواب سراج الدولہ کے مختصر عہد میں دربار اور قلمرو کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ہر طرف تعیّش، افترا پردازی اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ کلائیو، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے فریب، جعل سازی، دجل و مکر میں لگا ہوا تھا۔ سلطنت دہلی کمزور ہو کر شکست و ریخت اور بغاوتوں کا شکار ہو رہی تھی۔ انگریز ہر طرف لوٹ مچا رہے تھے۔ اور سلطنت

---

[1] سفینۂ خوشگو، تذکرہ مہاراجہ رام نرائن موزوں۔ از بندرابن داس خوشگو۔ تاریخ شعرائے بہار کلمی ص۵۸

[2] سیر المتاخرین جلد ۲ ص ۲۳۶۔

پر قبضہ کرنے کی تاک میں لگے ہوئے تھے۔

جب سراج الدولہ نے والئ پورنیہ، شوکت جنگ کے خلاف چڑھائی کی تو راجہ رام نرائن لال نے عظیم آباد کی فوج کے ساتھ نواب کی مدد کی۔ نواب سراج الدولہ کامیاب ہوئے[1]۔ اس سے پہلے سراج الدولہ کلکتے کی طرف متوجہ ہوئے تاکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی شرارتوں کا قلع قمع کریں۔ انہوں نے انگریزوں کو شکست فاش دے کر فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔

کرنل کلایو نے مدراس سے آ کر کلکتہ کی شکست کا بدلہ لیا۔ جنوری ۱۷۵۷ء میں کلکتہ پر پھر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ سراج الدولہ نے تاوان دینا قبول کر لیا۔ لیکن کلایو سے پرخاش جاری رہی۔ اس زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی بھی برسرِ جنگ تھے۔ نواب کے پاس چندر نگر کے شکست خوردہ فرانسیسی افسر پناہ گزیں تھے۔ کلایو نے اعتراض کیا تو جین لا فرانسیسی کو اپنی جماعت کے ساتھ عظیم آباد روانہ کر دیا گیا۔

اُدھر یہ حال تھا کہ میر جعفر کو نواب سراج الدولہ نے فوج کی بخشی گری سے نکال دیا تھا۔ اور دوسرے اہلِ اقتدار بھی سراج سے بیزار تھے۔ کلایو تو نواب کے استیصال کی فکر میں تھا۔ سب نے مل کر سراج کے خلاف دجّالی منصوبہ باندھا۔ کلایو مختصر سی فوج لے کر پلاسی چلا آیا۔ نواب کے لشکر کے مقابلہ میں اس کے مخالفوں کا گروہ بہت ہی حقیر تھا۔ لیکن نواب کی فوج اور عہدہ دار میر جعفر کی سازش میں تھے۔ کلایو نہایت آسانی سے کامیاب ہوا۔ (۲۳ جون ۱۷۵۷ء)

---

[1] ۲۰ جون ۱۹۵۶ء۔ تاریخ مگدھ، فصیح الدین بلخی بحوالۂ سیر المتاخرین۔ و ریاض السلاطین +

نواب سراج الدولہ پلاسی سے نکل کر عظیم آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ راہ میں ایک مکّار پیر داناشاہ نے انہیں مہمان رکھ کر بھی میر جعفر کے داماد میر قاسم کے حوالے کر دیا۔ میر قاسم نے نواب کو میرن پسر میر جعفر کے پاس مرشد آباد بھجوا دیا، جہاں نواب سراج الدولہ، بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ میرن نے نواب کی ماں، خالہ، بھائی اور معصوم بچّے کو بھی قتل کر دیا۔ (۴ جولائی ۱۷۵۷ء[1])۔ راجہ رام نرائن سراج کی بالکل مدد نہ کر سکے۔ اور جلد ہی انگریزی فوج عظیم آباد میں متعیّن کر دی گئی۔

پلاسی کے بعد میر جعفر نواب بن بیٹھا۔ کلایو نے خوب خوب رشوت لے کر میر جعفر کی مدد کی۔ علّامہ اقبال نے اسی جعفر کے متعلق کہا ہے۔ ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ ملّت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

بنگالے میں حکومت قائم ہو جانے کے بعد میر جعفر نے راجہ رام نرائن کو مطیع کرنے کے لئے عظیم آباد دلجوئی کے خطوط لکھے۔ یہاں راجہ سُندر سنگھ (ٹکاری) اور دوسرے اُمرار و رُؤسا، نواب سراج الدولہ کے خون کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر حالات اتنے غیر یقینی تھے کہ راجہ موصوف نے کوئی کارروائی نہ کی اور اپنے حفظ و بقا کے لئے ساز باز کرتے رہے۔

میر جعفر ۱۷۵۸ء میں عظیم آباد آیا اور چند دن عیش و عشرت میں بسر کئے۔ اُس نے راجہ رام نرائن سے صوبے کے مداخل کا محاسبہ کیا۔ مگر راجہ نے برطرفی

---

[1] تاریخ مگدھ: فصیح بلخی صفحہ ۳۳۵۔ بحوالہ سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۲۸۶ تا صفحہ ۲۹۸ و ریاض السلاطین صفحہ ۲۷

کے ڈر سے پہلے ہی کلایو کی مدد حاصل کر لی تھی، لہٰذا بچ گئے۔

۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء میں شاہزادہ عالی گوہر (جو بعد کو شاہ عالم بادشاہ ہوا) نے عظیم آباد پر حملہ کیا۔ شہزادے کے آنے سے راجہ رام نرائن بہت گھبرائے۔ وہ شکنجے میں گرفتار تھے۔ ایک طرف میر جعفر اور انگریز تھے۔ دوسری جانب شاہزادہ عالی گوہر ولیعہد سلطنت۔ اُنہوں نے انگریزی فوج متعینہ عظیم آباد کے افسر میجر کوٹ سے بھی مشورہ کیا۔ اور شہزادے کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ اُس طرف میر جعفر اور کلایو کی فوج راجہ رام نرائن کی کمک کو آ رہی تھی۔ یہ معلوم کر کے راجہ رام نرائن قلعہ بند ہوئے۔ اور لڑنا شروع کیا۔ شہزادے کی مدد میں محمد قلی خاں صوبہ دار الٰہ آباد تھے۔ اُن کی غیبت میں شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ نے قلعہ الٰہ آباد پر قبضہ کر لیا اور اس گھبراہٹ میں محمد قلی خاں عین دورانِ جنگِ عظیم آباد، الٰہ آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور شہزادہ عالی گوہر نے لڑائی ملتوی کر دی۔

شہزادہ عالی گوہر عالمگیر ثانی کے بعد شاہ عالم کے لقب سے بادشاہ ہندوستان ہوئے۔ لوگ میر جعفر اور اُس کے بیٹے میرن کی حرکات سے بیزار تھے، انہوں نے بادشاہ کو دوبارہ حملہ پر اُبھارا۔ راجہ رام نرائن سے دوبارہ لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کپتان کا کرین راجہ کی مدد کر رہا تھا۔ اس لڑائی میں کامگار خان نے راجہ کے ہاتھی سے اپنا گھوڑا ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ راجہ کو اپنی دانست میں مار ڈالا۔ لیکن راجہ رام نرائن نے زخمی ہو کر ہودج کے اندر اپنی جان بچائی۔ اس جنگ میں انگریزوں اور

راجہ کو شکست فاش ہوئی۔ مگر بادشاہ نے گرفتاروں کو از راہِ نوازش معاف کر دیا۔ بعد ازآں بادشاہ نے بنگالہ کا رُخ کیا۔ شاہ عالم بادشاہ تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ میرن اور انگریزوں کی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ انگریزی فوج نے شاہی فوج کو توپ خانہ سے پسپا کیا۔ بادشاہ عظیم آباد کی طرف واپس ہوگئے۔ یہاں کا رنگ پھر دگرگوں ہو چکا تھا۔ راجہ رام نرائن اور راجہ شتاب رائے انگریزوں سے مِل گئے تھے۔ قلعہ عظیم آباد کا پھر محاصرہ ہوا اور شہر فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ انگریزوں کی کمک پہنچی۔ شاہی فوج پیچھے ہٹ گئی[۱]۔ (۲۹ر اپریل ۱۷۶۰ء)۔ لیکن جب خادم حسین خاں فوجدار پورنیہ عظیم آباد کے سامنے گنگا کے اُس پار آپہنچے تو راجہ رام نرائن کھُل کر جنگ کرنے سے گریز کرتے رہے۔ اُنھوں راجہ شتاب رائے کو بھی کپتان ناکس کا ساتھ دینے سے منع کیا۔ تاہم شتاب رائے نے کپتان مذکور کا ساتھ دیا، دریا پار جا کر جنگ کی اور کامیاب ہوئے۔

میر جعفر کی معزولی کے بعد میر قاسم کو انگریزوں نے بنگال، بہار و اُڑیسہ کی مسندِ نظامت پر بٹھایا۔ (۱۱۷۴ھ - ۱۷۶۱ء) ۔اس زمانہ میں انگریزوں نے شاہ عالم بادشاہ سے صلح کی۔ مہاراج شتاب رائے بیچ میں پڑے اور بادشاہ بہ نفس نفیس شہر عظیم آباد تشریف لائے اور انگریزی کوٹھی میں تخت نشینی کا انتظام ہوا[۲]۔ میر قاسم ناظم بنگالہ نے بھی حاضر ہو کر نذریں گذاریں۔ راجہ رام نرائن بھی شرف یاب ہوئے۔

ع[۱] سیر المتاخرین جلد ۲ ص ۳۶۳ ع[۲] گلزار باغ۔ اس عمارت میں فی الحال سرکاری چھاپہ خانہ اور سروے آفس ہے۔ جلوس ۱۲ر مارچ ۱۷۶۱ء۔

بادشاہ کے تشریف لے جانے پر میر قاسم نے راجہ رام نرائن سے صوبے کے محاصل کی حساب طلبی شروع کی۔ بعض خیانتوں کا پتہ چلا۔ راجہ صاحب قید کر دیئے گئے۔ سات لاکھ روپے اور جنس گھر سے برآمد ہوئی۔ دوسرے مجرمین بھی محبوس ہوئے۔ راجہ شتاب رائے بھی لپیٹ میں آئے۔ وہ بے قصور تو ثابت ہوئے مگر انگریزی کونسل نے انہیں میر قاسم کی حکومت سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ میر قاسم نے ان سے عظیم آباد کی دیوانی اور رہتاس کی قلعہ داری لے لی۔[۱]

تھوڑے ہی دنوں میں نواب میر قاسم عالی جاہ کی انگریزوں سے بگڑ گئی۔ وہ انگریزوں کی دخل اندازی، بے عنوانی، بد دیانتی، غارتگری اور غداری کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ لیکن خود ہندوستانی اُمراء انگریزوں سے سازش کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میر قاسم کی مقصد برآری نہ ہو سکی اور وہ نامراد و پریشاں حال و تباہ ہوئے۔

نواب عالی جاہ نے راجہ رام نرائن وغیرہ کو پہلے سے قید کر رکھا تھا۔ انگریزوں سے سخت لڑائی ہو جانے اور پیچیدگی و سازش بڑھ جانے سے حالات خراب تر ہو گئے۔ میر قاسم عالی جاہ مونگیر سے عظیم آباد کی طرف فرار کرتے ہوئے آ رہے تھے اُنھوں نے باڑھ کے قریب پہنچ کر محبوسین کو غرق دریا، یا قتل کرا دیا۔ راجہ رام نرائن کے گلے میں ریت سے بھرا گھڑا باندھ کر انہیں گنگا میں ڈبا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ[۲]

۱۔ تاریخ مگدھ، فصیح الدین بلخی ص۳۵۸ بحوالہ سیر المتاخرین جلد ۲ ص۳۹۴ + ۲۔ سیر المتاخرین جلد ۲ ص۴۲۴، و ریاض السلاطین ص۳۸۵ +

۱۱۷۷ھ/۱۷۶۳ء میں گذرا +

راجہ رام نرائن فارسی میں خوب کہتے تھے ۔ ان کا مطبوعہ دیوان فارسی میں موجود ہے ۔ شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے ۔ حزیں ۱۱۰۳ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے ۱۱۴۷ھ میں دھلی آئے اور ۱۱۸۰ھ میں بنارس میں انتقال کیا ۔ راجہ صاحب اُن کی مدد بھی کیا کرتے تھے ۔ راجہ رام نرائن ریختہ بھی بہت صفائی سے کہتے تھے ۔ لیکن اس زبان میں انہوں نے بہت کم شعر لکھے ہیں ۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے سراج الدولہ کے قتل پر صرف ایک شعر اُردو میں کہا تھا اور بس ۔ لیکن اور تذکروں میں دوسرے اشعار بھی ملتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں :۔

ؔ غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانا مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری (گذرا ؟)

(تذکرۂ میر حسن)

ؔ کچھ گرانی نہیں مجھ کو وہ ستم گار کے ساتھ
دِل نکل ہی پڑا اشک سُبک بار کے ساتھ

(چمنستانِ شعراء)

ؔ اَبر ہوگا تو خجالت سیتی پانی پانی
مَت مقابل ہو مرے دِیدۂ خونبار کے ساتھ

(تذکرۂ گلزار ابراہیم)

تاریخ شعرائے بہار، بلخی میں آخری شعر کو یوں لکھا ہے :

ابر تو خود ہی خجالت سے ہے پانی پانی
کب مقابل ہو مرے دیدۂ خونبار کے ساتھ

معلوم ہوتا ہے کہ "کے ساتھ" کی ردیف اور 'ستمگار'، 'سیلاب بار'، 'خونبار'
وغیرہ قوافی میں پوری غزل موزوںؔ نے لکھی تھی۔

ایک اور شعر موزوںؔ کا ہے ؎

بھولی نہیں ہے مجکو بتوں کی ادا ہنوز
دل کے نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز

(تاریخ شعرائے بہار، ص ۶)

پروفیسر حسنؔ عسکری صاحب کو پٹنہ سیٹی کی ایک قلمی بیاض سے موزوںؔ کا
مندرجہ ذیل دوہہ ملا ہے۔

جب میر قاسم راجہ رام نرائن کے باغ میں خیمہ زن ہوئے، اور اُن کے
فوجیوں نے باغ کے درختوں کو نقصان پہنچانا شروع کیا، تو موزوںؔ نے
برجستہ ایک ہندی دوہہ کہا ؎

آمبا امرت پھل دیت ہیں سدا رہت ہیں مون
ناہرتے ناہر ملے باگ بیرتے کون

جس وقت راجہ رام نرائن موزوںؔ کو گنگا میں غرق کرنے کے لئے
کشتی پر بٹھا کر لے جانے لگے، تو انہوں نے مندرجۂ ذیل اشعار
پڑھے :۔

موذیوں کے قول پر ہرگز نہ کیجے اعتبار
جونک اگر مٹی ملے تو بھی لہو پیتی رہے

چادرِ تقدیر کی ہرگز رفو ہوتی نہیں
تاقیامت سوزنِ تدبیر گر سیتی رہے

بلبلِ بے درد کو مطلب ہے کیا پروانے سے
وصل میں مرجائے یہ، وہ ہجر میں جیتی رہے

یہ اشعار بھی پروفیسر حسن عسکری صاحب کو مذکورہ بالا بیاض میں منقول ملے ہیں۔ غالباً یہ اشعار موزوں کے نہیں سودا کے ہیں، جو موزوں کے حسب حال ہو گئے تھے۔

شاہ آیت اللہ جوہری و مذاقی

(سنہ ۱۱۲۶ھ تا سنہ ۱۲۱۰ھ)

حضرت غلام سرور، المعروف بہ شاہ آیت اللہ پھلواروی اردو اور فارسی دونوں زبان میں شاعری کرتے تھے۔ اِن کا فارسی میں "شورش" تخلّص تھا۔ گارساں دتاسی غالباً غلطی سے "سوزش" لکھتا ہے۔ آپ مولانا شاہ محمد مخدوم کے بیٹے اور جانشین تھے۔ سنہ ۱۱۷۳ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد سجّادہ نشیں ہوئے۔

---

[1] "تاریخ شعرائے بہار"، بلخی صـ۲۴ و صـ۶۳ +

صاحبِ دیوان فارسی تھے۔" جوہری[1] پھلواروی کا مختصر حال و کلام شورش و عشقی کے تذکروں میں ہے۔ لیکن مفصل حال اور وافر کلام حکیم محمد شعیب صاحب نے اپنے تذکرے[2] میں دیا ہے۔" جوہری کا اُردو کلام جو اَب دستیاب ہوتا ہے۔ اس میں مثنوی، مرثیہ، منقبت، شہر آشوب، اور قصیدہ ہے۔ مثنوی میں جوہری تخلّص برتا ہے۔ اور مرثیہ میں مذاقی۔ فارسی دیوان، جس میں تخلّص شورش ہے، کلکتہ امپیریل لائبریری میں موجود ہے۔ ؎

گردشِ چشمِ بتان گردش جام ست اینجا
غیر ازیں بادہ دگر بادہ حرام ست اینجا

گر نید ملایک ہمہ بر حالتِ شورش ؛ گر نیم شبے آہ بہ گردون رود از دل

شاہ آیت اللہ حضرت شاہ مجیب اللہ پھلواروی کے داماد تھے۔ اس طرح اوّل الذکر شاہ سجّاد پُھلواروی کے ہم زُلف ہوئے۔ پُھلواری شریف کے شعراء کا ایک 'سلکِ مروارید' ہے۔ یہ سب ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ رُوحانی تعلق کے علاوہ ان کے جسمانی رشتے بھی ہیں۔ کبھی کبھی ان کے درمیان چشمکیں بھی چلتی تھیں۔ مثلاً :-

شاہ نُورالحق تپاں، جو شاہ سجّاد کے داماد تھے، اور غلام مخدوم ثروت، جو شاہ آیت اللہ کے شاگرد اور خلیفہ تھے، ان دونوں کے درمیان چشمک

---

[1] 'بہار کی اُردو شاعری' : قاضی عبدالودود، صدائے عام۔ عید نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۱۸ +
[2] تجلّیات الانوار، تذکرۂ شیوخ بہار +

چلتی تھی - ملاحظہ ہو ذیل کا سلسلہ :

شاہ ظہور اللہ
↓
شاہ مجیب اللہ ⟵⟶ میرے پھوپھیرے بھائی ⟵⟶ شاہ قلندر عماد ①
(شاہ عمادؒ کے مرید اور خلیفہ)

شاہ قلندر عماد کی اولاد:
- شاہ سجاد ② (شاہ عماد کے انتقال کے وقت آٹھ سال کی عمر) — شادی: لڑکی (بنت شاہ مجیب اللہ)
- انعام الدین (دو سال کی عمر میں فوت ہوئے)

شاہ مجیب اللہ کی اولاد:
- شاہ عبدالحق ← شاہ نورالحق تپاں ④
- لڑکی (شادی شاہ آیت اللہ جوہری ③ سے) ← شاہ شبلی
- لڑکی ← بی بی واجدہ، بی بی طیبہ

شاہ نورالحق تپاں ⟵⟶ بی بی واجدہ (بی بی واجدہ سے شادی ہوئی)
↓
⑤ شاہ ظہور الحق ظہور

شاہ نُورالحق تپاں بھی اپنے پھوپھا شاہ آیت اللہ جوہری سے فارسی میں اصلاح لیتے تھے اور اُن کے شاگرد تھے۔

پروفیسر حسن عسکری صاحب، صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج نے شاہ آیت اللہ جوہری کی "مثنوی گوہر" کا انکشاف کیا اور رسالہ اُردو، دھلی، اپریل ۱۹۴۰ء میں ایک تفصیلی مضمون مثنوی کے متعلق سپردِ قلم فرمایا۔ مثنویِ گوہر جوہری کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر موصوف کو اپنے ایک ہندو شاگرد کے ذریعہ حاجی پور کے علاقہ سے ملا تھا۔ پھلواری شریف

یں کوئی نسخہ ابتک غالباً نہیں ملا۔ ۱۹۵۴ء مئی میں پرافسر عسکری صاحب نے اور میں نے ایک نامکمل نسخہ قلمی 'مثنوی گوہر جوہری' کا شاہ مجتبیٰ حسن صاحب کے کتب خانہ بہار شریف میں دیکھا تھا۔ عسکری صاحب کا نسخہ فی الحال پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، شعبۂ مخطوطات کی ملکیت ہے۔ ۱۹۴۰ء میں عسکری صاحب کا یہ خیال تھا کہ بجز دیوان فارسی اور مثنوی گوہر کے شاہ آیت اللہ کا کلام مفقود ہے۔ لیکن اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مجھے اور پرافسر عسکری صاحب کو پھلواری شریف کے متعدد قدیم مراثی[1] ملے جس میں شاہ آیت اللہ کے مراثی بھی ہیں۔ بعد ازآں حکیم شعیب صاحب مرحوم سے مجھے شاہ آیت اللہ کی 'شہر آشوب' کی نقل بھی ملی۔

شاہ آیت اللہ بقول صاحب تذکرۃ الصالحین، شوال ۱۱۲۶ھ کو پیدا ہوئے۔ قصبۂ بہن میں زندگی کے ابتدائی ایام گزارے، بنارس بھی گئے۔ سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ حضرت شاہ مخدوم کے سجادہ نشیں ہوئے۔ چوراسی (۸۴) برس کی عمر میں بتاریخ یکم رجب روز سہ شنبہ ۱۲۱۰ھ کو انتقال فرمایا[2]۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے شاہ شبلی سجادہ نشیں ہوئے۔ تذکرۂ[3] شورش (میر غلام حسین شورش عظیم آبادی) میں لکھا ہے:

"مولوی آیت اللہ، جوہری تخلص۔ متوطن پھلواری۔ شاعر فارسی

---

[1] ملاحظہ ہو "بہار کے اردو مراثی"، از اختر اورینوی: سالنامہ ساقی، کراچی، ۱۹۵۲ء

[2] صاحب تذکرۃ الصالحین اور حکیم شعیب صاحب مرحوم نے مندرجہ بالا تاریخیں ہی درج کی ہیں +

[3] برٹش میوزیم، فولیو ۳۵۔ اس تذکرہ کا فوٹواسٹیٹ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں آگیا ہے۔

است - صاحبِ علم و فضل - درویشِ کمّل - مزاجِ عالیش سوئے ریختہ میل تمام دارد - ازوست :

لگایا عشق نے آ مجھ دلِ بیتاب میں آتش
کہ دے ہی جون مھوّس . بو نتۂ بیماب میں آتش

تذکرۂ عشقیؔ عظیم آبادی (شیخ محمد وجیہہ الدین) میں درج ہے کہ :
"جوہریؔ تخلص ، اسمش مولوی آیت اللہ - مردے فاضل از بزرگان قصبۂ پُھلواری ست - بیشتر فکر مرثیہ و سلام ہندی می کرد - و در مقطع مرثیہ مذاقیؔ و در غزل فارسی شورشؔ تخلّص می آورد - گاہ گاہ بہ نظم پردازی ریختہ نیز جوہر طبع خود بہ عنوان فاضلان آشکارا می ساخت .. .."

عشقیؔ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آیت اللہ نے پہلے مرثیہ و سلام میں طبع آزمائی کی ہے - لہٰذا میں مراثی کی مثالیں پہلے پیش کروں گا - اور بعد ازاں مثنوی سے حوالے درج کروں گا - میں قاضی عبدالودود صاحب کی اس رائے سے متفق ہوں کہ : "اُردو غزلیں اُنہوں نے غالباً بہت کم لکھیں" فارسی غزلوں میں تو وہ صاحب دیوان تھے +

ہمیں خانقاہ سلیمانیہ (چھوٹی خانقاہ) سے مراثی کی ایک قلمی کتاب ملی - یہ کتاب مجلّد ہے اور اس میں صوفیائے پُھلواری شریف کے مرثیے درج ہیں - شاہ آیت اللہ کا حسب ذیل مرثیہ اسی مخطوطہ سے لیا گیا ہے :

مرثیہ بُرہان قدیم از اُستادِ کل حضرت شاہ محمد آیت اللہ قدس سرہ متخلص بہ مذاقی

(۱)

آلِ نبی نہیں جینے پایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی
کٹّا بتولؔ و علیؔ کا جایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی
تیغ ستم کو تن پر کھایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی
خنجر سے گردن کٹوایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۲)

تن کو سر سے ہے نہ پھر اوا سر اوس تن سے دور ہو دور
سر نیزہ پر جھوم رہا ہے تن ماٹی میں گھاؤ سے چور
ہائے نبی کا خاصہ نواسا وائے بتول علی کا پور
کیا کیا ظلم نہ اوس پر آیا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۳)

بعد شہید ہونے سرور کے خیمہ بیچ در آیا قاتل
لوہو بھرا وو خنجر بُران کف میں لے چمکایا قاتل
گھر میں اسا سا جو کچھ پایا پیا دوں سے لٹوایا قاتل
سب نسوات سے نالہ بر آیا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۴)

قتل کیتیں عابد کے ہے ہے جب قاتل نے ارادہ کیا
اوس بیمار کے سر کٹنے کو جب کہ تعین پیادہ کیا
خواہی نخواہی غصہ ہو کر قتل پہ زور زیادہ کیا
پھوپھی نے اوسکو روک بچایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۵)

اہل حرم کے مقتل اوپر جس دم ہائے سواری آئی
لاش کے پاس آئی سب بی بی رونے غم کی ماری آئی
خاص کہ دو بہنیں سرور کی کرتی نالہ و زاری آئی
بے بانو کو غم نے رولایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۶)

بہن حُسین کی روے زینب بی بی زہرا جی کی جائی
آنکھ سے بوندیں ٹپک گرت ہے مانو ساون کہیں برسائی
لاش کے نال کھڑی وہ روئے ہائے لے بھائی ہائے لے بھائی
مٹا بہن کے سر کا سایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۷)

اور کلثوم حُسین کی خواہر روے کاندے پیٹے پچھڑے
کوئی نہ بیکس کا حامی ہے کون کرے مظلوم کی پچھ رے

کوئی شامی کٹھن کٹھور رہے کہاں ایہوں کو دَیا اور چھہ رے
کب نرمو ہیے کو موہ اور مایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۸)

روئے بانو شاہ کی بی بی ہائے رے سئیاں ہائے رے سئیان
تو جیتیا اور میں مرجاتی رہتی جگ میں تیری نئیان
ہون قربان اور صدقے واری چھڑی مڑی تو پر گیان
آیہہ بن میں سیس کٹایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۹)

رَن ہے ڈرونا بَن ہے بھَونا کوئی نہیں ہے ہیت اور سنگی
دُرجن کی سینا ہے بھاری چار و دِس سب فوج ہے جنگی
بچے پیاسے بھوک مَرت ہیں پانی کا ٹکڑا دانے کی تنگی
یہاں میں اپنا مول گنوایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۰)

کون سُنے ہے بتھا ہمارو کا سے کہیُوں دُکھ کی کہانی
اے میرو کنت اور اے میرو بالم توری صورت خاک سمانی
اے میرو جانی اے میرو جانی اے میرو جانی اے میرو جانی
دُرجن موسے توہ چھوڑایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۱)

ہوں میں اپنے نصیب کی کھونٹی پھوٹی کیا کہوں میں قسمت کی خوبی
جی جینے سے ناک پر آیا گل میں سانس رو کی بین او بی
جہہ مورت سے چاند لجاتا سو صورت لوہو میں ڈوبی
کاٹ گلا لوہو سے نہلایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۱۲)

مجکو کس پر چھوڑ گئے ہو تم ہوئے جا فردوس کے باسی
حور نے تمکو پلایا پیالا میں رہی ویسیہی بہو کی پیاسی
تم بن کون کہیر یا لیوے تو میر اوالی میں تیری داسی
خلد برین میں جا گھر چھایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۱۳)

رہا نہ والی کوئی سر پر ہم بیکس کا حال بتر ہے
دیکھین آگے کیا پیش آوے دشمن کا اب خوف وخطر ہے
لاش پڑی ہے خاک کے اوپر کفن جدا لوہو سے تر ہے
غسل شہید نے خون سے پایا ہائے حسین بیدیسی پنتھی

(۱۴)

کاسے کہئے کون سُنے ہے کوئی غمخوار نظر نہیں آوے
اے میرے سیئیاں تیرا جنازہ کون مدینہ لے پہونچاوے
گور کہندا کر لحد بنا کر جد کے روضہ پاس گڑا وے

یہاں ہے دُشمن کا ہمسایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۵)

ٹپک ٹپک کر گرتے آنسو لاش کے جانی واری پھیری
تو میرا مولا تو میرا خاوند میں تیری باندی میں تیری چیری
کیا کروں بس ہوُ سائی نہ اپنا ہوں بے بس میں دُکھ کی گھیری
درد نے مجکو آ گھیرایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۶)

دیکھہ آ اپنا نور دو دیدہ جس کو کچھہ نہیں تاب تواں ہے
گل میں اوس کی طوق پڑی ہے دو تو پاؤں میں بند گراں ہے
حفظ خدا ھی اوس کو بچاوے بچنے کی اُمید کہاں ہے
بچّی کو تیری کلپایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۷)

قتل کو اوس کے کوئی دہراوے غضب سے دیکھے آنکھ نکالے
تیغ علم کئے ہے کوئی کوئی کف میں تولے بھالے
ہائے یہ پیارا بیٹا تیرا پڑا ہے کس ظالم کے پالے
کس شدّت میں ہے تیرا جایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۸)

لاش شہید کے گرد بگرد آسب بی بی دُکھیاری روئی

امّاں اور پھوپھیاں کو روتے دیکھ سکینہ باری روئی
ہائے یتیم وہ بھو کی لڑکی شاہ کی بیٹی پیاری روئی
چُپ نہ ہوئی وہ گو بہلایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۱۹)

کہتی اماں مت رو بیٹی تجھ یتیمی کا دن آیا
اس بچپن میں تیرے سر سے مِٹ گیا باباجی کا سایا
بالی لڑکی دولاری کو اب کیوں کر پاؤں[1] یا رخدایا
جس کے باپ نے سر کٹوایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۲۰)

رونے سے وہ چُپ نہیں ہوتی جس رونے سے تڑکے سینا
جب جب سبکو روتے دیکھے روئے پوکار پوکار سکینا
اور غذا کچھ بھی نہیں حاضر خون جگر تھا کھانا پینا
تیرا غم کس طرح سے کھایا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

(۲۱)

جاگ پڑی وہ خواب سے جس دم بابا بابا کہکر روئی
نالہ کری با دیدۂ پُرنم بابا بابا کہکر روئی
تازہ ہوا زنداں میں پھر غم بابا بابا کہکر روئی
ہوگیا نالہ بلند و بُکا یا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

---

[1] [illegible] غالباً نسخہ میں کتابت کی غلطی ہے۔

(۲۲)

روۓ سے خاموش نہ ہوتی شام تلک وہ روتی جاوے

ڈھونڈھے ہے باباجی کو نہ پاوے آپ روۓ امّاں کو رلاوے

دیکھی باباجی کی صورت ایک شب اوس کو خواب جو آوے

خواب میں اُوس کو آبہلایا ہاۓ حُسین بیدیسی پنتھی

(۲۳)

تھا وہ نالہ ایسا بھاری۔ جس کے سُنتے پھٹے کلیجا

پر بیدرد کی سنگ تھی چھاتی کچھ نہیں سینا اوسکا پسیجا

اوس دختر کے کھانے کے لیۓ سر کو طبق میں دہر کے بھیجا

تیرا سر کھانے کو آیا ہاۓ حسین بیدیسی پنتھی

(۲۴)

کر کے نظر باباکے سر کو مر گئی ہاۓ بیچاری سکینہ

بھوکی تھی دیدار پدر کی سیر ہوئی ہاۓ دولاری سکینہ

امّاں روئی امّاں پیٹی ہاۓ رے ہاۓ ہماری سکینہ

غم کے اوپر پھر غم آیا ہاۓ حُسین بیدیسی پنتھی

(۲۵)

قصہ غم کا دور دراز ہے کہہ مت آگے اس کے مذاقی

قلم کا دل رقت میں آیا بہُت رہا لکھنے کو باقی

روز جزا میں پانی پلانا اے کوثر کے حوض کے ساقی
نالہ و آہ سے دل بھر آیا ہائے حُسین بیدیسی پنتھی

شاہ آیت اللہ مذاقی کا دوسرا مرثیہ حسب ذیل ہے :-

۱ے جس کا پدر کٹا ہو نہ روئے تو کیا کرے
تن خاک میں پڑا ہو نہ روئے تو کیا کرے
مقتل میں خون بہا ہو نہ روئے تو کیا کرے
نیزہ پہ سر چڑھا ہو نہ روئے تو کیا کرے
جس کا بابا مرگیا چھوری کو کھائے حسین
تسکا بیٹا عابدین رُوت ہے دن رین

۲ے امّاں یتیم خستہ کی بانو شکستہ دل
مرنے سے شاہدین کے گئی خاک بیچ مل
کیونکر نہ روئے چھاتی پہ غم کی دھری ہو سِل
جس پر کے دُکھ پڑا ہو نروئے تو کیا کرے
نینان مون انجھوان بھرے بکھرے سیس کے بال
رُوت پی پیارے اُوپر مُکھ پر انچرا ڈال

۳ے روتی تھی شہربانوئے ناچار ہائے ہائے
کرتی تھی آہ و نالہ جرس وار ہائے ہائے

کہتی تہی رو بدیدہ خونبار ہائے ہائے
دیدہ میں خون بہرا ہو نہ روئے تو کیا کرے

جیسے بَن کا پپیہرا رٹت رہے پی پی
ویسے میں پی پی رٹوں جو لہہ گھٹ میں جی

۴ تہی حضرت امام کی دو محترم حرم
بانوستم رسیدہ کو کیا کیا نہ تھا اَلم
اوڑتا تھا مرغ نالہ کا سینہ سے دمبدم
جس کا کہ شو کٹا ہو نروئے تو کیا کرے

آگ لگے جہہ سیں مون کیسے کل ہو واہ
جیسے تڑپہت لاش ہے ویسے تڑپہت یاہ

(صفحہ ۸ مجلّد مخطوطات پھلواری)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ نامکّل ہے۔ کیونکہ ناقل نے چار صفحات (۹-تا ۱۲) سادہ چھوڑے ہیں۔ کسی وجہ سے مرثیہ مندرجہ بالا کی پُوری نقل نہ ہوسکی۔ یہ مرثیہ خاصہ بڑا ہوگا۔ کم ازکم سولہہ ۱۶ بند اورنقل ہونے سے رہ گئے۔

شاہ آیت اللہ کا تیسرا مرثیہ حسب ذیل ہے:-

لوٹ لیو بنجارا بَن میں ٹانڈ لدا ہوا سارا بَن میں
ہائے حُسینؑ بچارا بَن میں بیکس کر کے مارا بَن میں

بَن میں کھڑی بنجاری رووے　　گھر جو لُٹا گھر باری رووے
بانو دُکھیا بچاری رووے　　راول جس کا مارا بَن میں

بٹماروں نے بَن میں گھیرا　　لُوٹ لیا سب خیمہ ڈیرا
ہائے حسینا راول میرا　　سیس بدن سے اتارا تن میں

جوجھا سارا کمبارن میں　　لوتھ پڑی ہے کالے بَن میں
جیسے برسے مینہہ ساون میں　　اُڑنت لہو کا پھارا بَن میں

بانو دکھیا کوکے دُکھ سے　　اکبر کاہے سوئے ہو سُکھ سے
بیٹھے بچن کچھ بولو مُکھ سے　　جاگو سانجھ سکارا بَن میں

اکبر ہمرا راج دلارا　　اکبر ہمرے نینوں کا تارا
ہائے رے ہمرا اکبر پیارا　　تو ہے کس نے مارا بَن میں

زینب دُکھیا سوگ کی ماری　　لوتھ پہ بھائی کی کرے ہے زاری
بھائی تم پر زینب واری　　اَب رہا کون سہارا بَن میں

سوگ نیحن کا کو ہے سنوّیا ‏ ‏ رکت سے بھر گئی تال تلیا
یہ لوتھ پڑی ہے بھیّا ‏ ‏ بہا سوندی دھارا تن بین

بیری لوگ نے بَن مین گھیرا ‏ ‏ اجڑا دیس مدینہ میرا

.. ..

{ عطیہ جناب حکیم محمد شعیب صاحب پھلواروی
مطبوعہ معاصر، پٹنہ - حصّہ ۳، دسمبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۴۴ }

پہلے مرثیہ کے اختتام پر قلمی نسخہ مین یوں لکھا ہے :

" تمت المرثیہ من تصانیف مولی الموالی استاد کل ادانی و اعالی حضرت نداقی الملقب بشاہ محمد آیت اللہ قدس اللہ تعالیٰ سرہٗ العزیز کتبھا محمد عالم عفے عنہ ذنوبہ و اینمرثیہ در سنہ ۱۲۰۶ھ یک ہزار و دو صد و شش ھجری در تعزیہ خانہ سیّد فیض علی صاحب علیہ الرحمۃ خواندہ شد وشنیدم کہ در خواندن اینمرثیہ آثار قبول از گریہ و زاری عام و خاص چنان بظہور رسیدہ بود کہ عالمی از اندوہ و غم تازی شد تا آنکہ مستمعان از غایت حزن بیہوش و حواس بودند "

(مجلد قلمی نسخہ پھلواری ص ۷)

ہوسکتا ہے کہ یہ مرثیہ اور قبل کا لکھا ہوا ہو اور سنہ ۱۲۰۶ھ میں بھی

اسے پڑھا گیا ہو۔ اگر یہ مرثیہ ۱۲۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے تو 'مثنوی گوہر' کے بہت بعد کا ہے (۱۱۶۱ھ)۔ مگر عشقی لکھتے ہیں کہ "پیشتر فکر مرثیہ وسلام ہندی می کرد"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آیت اللہ نے ۱۲۰۶ھ سے بہت پہلے بھی مرثیے اور سلام کہے تھے۔ کیونکہ ۱۲۱۰ھ میں تو اُن کا وصال ہوتا ہے۔

اب میں 'مثنوی گوہر جوہری' کا جائزہ پیش کرتا ہوں:۔
مثنوی مذکور ۱۱۶۱ھ مطابق ۱۷۴۸ء کی لکھی ہوئی ہے۔ جوہری کہتے ہیں:

کہا ریختہ بیچ یہ مثنوی رکھا نام میں گوہر جوہری،
کرے جس کی تاریخ کا گر خیال رتن جوت منکا، سین تو 'جو' نکال

پرافسر عسکری صاحب کے حاصل کئے ہوئے قلمی[1] نسخے ۱۱۶۱ھ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:۔

توہی آپ کر میری ساقی گری کہ مخمور مدّت کا ہے جوہری

اس مثنوی میں جا بجا نااہل کاتب کی وجہ سے اِملا کی غلطیاں ملتی ہیں۔ حروف ایک حدتک پختہ و صاف خط شکستہ میں ہیں۔ اَروَلی کاغذ کی چھوٹی تقطیع کے ایک سو اَڑتالیس صفحے موجود ہیں۔ ہر صفحہ ۱۸ انچ لمبا اور ۴½ انچ چوڑا ہے۔ عموماً ہر صفحہ میں ۱۶ سطریں ہیں۔ اوّل و آخر کے ورق غائب ہیں۔ کاتب کا نام اور کتابت کی تاریخ معلوم نہ ہوسکی۔ مثنوی میں جو اشعار موجود ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۳۰۱

---

[1] شعبۂ مخطوطات، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

(دو ہزار تین سو ایک) ہے فصیح الدین بلخیؔ صاحب کا قیاس ہے کہ اوّل ورق میں چھ شعر ہونگے۔ اور آخر ورق میں چار شعر۔ پوری مثنوی میں دو بحریں ترتیب وار استعمال کی گئی ہیں۔ بحر متقارب مثمن محذوف الآخر (فعولن فعولن فعولن فعل) اور بحر ہزج مسدّس مقصور العروض والضرب یا محذوف الاخر (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن یا فعولن)۔

جوہریؔ نے اپنی زبان کو ہندوی اور ریختہ سے موسوم کیا ہے ؎

ہمن کی بات سُن خاموش مَت رہ
زبانِ ہندوی میں مثنوی کہہ

اور ؎
کہا ریختہ ریج یہ مثنوی
رکھا نام میں گوہرِ جوہری

حضرت جوہریؔ کے ہم وطن معاصرین میں خواجہ امین الدین امینؔ نے ایک مثنوی لکھی جس کے اُنیس۱۹ شعر مرزا علی لطفؔ نے 'گلشنِ ہند' میں نقل کئے ہیں۔ اسی طرح 'گلزار ابراہیم' اور 'گلشنِ ہند' میں محمد سلیم سلیمؔ عظیم آبادی کا "مثنوی در ریختہ مشتمل بر سانحۂ عجیب واقعہ ناصیۂ عظیم آباد" لکھنا درج ہے۔ بعد میں راسخؔ عظیم آبادی نے مثنویاں لکھیں جو بقول حسرتؔ موہانی بالکل میرؔ کے انداز کی ہیں۔ اس کے بعد چودھویں صدی ہجری کے وسط تک شعرائے بہارؔ نے متعدد مثنویاں لکھیں۔

مثنوی گوہرؔ بارہویں صدی عیسوی کے وسط کی مروّجہ زبان کا صحیح اور مکمل نمونہ ہے۔ یہ ایک عہد کی لسانی تکمیل کو آشکار کرتی ہے۔ اس مثنوی کا کوئی نسخہ پھلواریؔ شریف کے کتب خانوں میں نہیں۔ اس کے انکشاف کا فخر پرافسر حسن عسکریؔ صاحب

کو حاصل ہوا۔ اِن کے ایک عزیز شاگرد رائے شیونندر بہادر ام۔ اے رئیس و زمیندار قصبہ بھکرا ضلع مظفرپور نے اپنے بزرگوں کے قیمتی کتب خانہ کا ذکر کیا۔ اور دو تین بستوں میں متعدد کتابیں پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں بھجوا دیں۔ انہیں خستہ کتابوں میں مثنوی گوہر جوہری دستیاب ہوئی۔

میں نے شاہ مجتبےٰ صاحب بہار شریف کے کتب خانہ میں "مثنوی گوہر جوہری" کا ایک نامکمّل قلمی نسخہ دیکھا ہے۔ اِس نسخہ میں بارہ ماسہ کا حصّہ موجود ہے۔

مثنوی گوہر جوہری، مختلف داستانوں پر مشتمل ہے۔ پیش رو داستان کے آخری اشعار بعد میں آنے والی ملحق داستان کی طرف بلیغ و واضح اشارہ کرتے ہیں۔ مثنوی کی کہانی روایتی رنگ کی ہے۔ آخری داستان اکبرآباد کے رام راجہ اور کنول دی کی رودادِ عشق ہے۔ پریشانیوں اور دِقّتوں کے بعد دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ شادی کے بعد فراق کا دَور آتا ہے۔ اساڑھ سے جیٹھ تک کنول دی برہ کی آگ میں تڑپتی رہتی ہے۔ بارہ ماسہ کنول دی کی زبانی پیش ہوا ہے۔ وصلِ مکرّر کے بعد کنول دی بیمار پڑتی اور مر جاتی ہے۔ کنول دی کی چِتا کی راکھ سے پھر شعلۂ عشق بلند ہوتا ہے۔ اور 'رام راجہ! رام راجہ' کی صدا آتی ہے۔ رام راجہ اس شعلۂ محبت کی طرف بیتابانہ جاتا ہے اور اس سے ہم آغوش ہو کر بھسم ہو جاتا ہے۔ مثنوی کے آخر میں صوفیانہ کیف و حال پیدا ہوتا ہے۔ اور محض روایتی رنگ کی جگہ تخلیقی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ ؎

دکھو کثرت میں وحدت کا تماشا　　　دو شعلے جون ہوا اِک شعلہ پیدا

کنول دی بارہ ماسہ میں مختلف پرندوں کو اپنا پیامبر بناتی ہے۔ مثلاً:
بھنگم، کوکلا، کنجن، سبزک، سرخاب، سارس، کبوتر، بسنتا، بلبل، کاگ اور
طوطا۔ آخرش طوطا کامیاب قاصد بنتا ہے۔ ؎

اساڑھ آیا لگا بادل گرجنے — اندھیری رات میں بجلی چمکنے
گگن پر برق نیئن ہے گا چمکتا — مرا شوقون سیتیں ہے دل پھڑکتا

گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم — مرے جی بیچ برہا آکرے دھوم
زمین کون ہے قبائے سبزدربر — سمیں ایسے میں پیو میرے ہیں باہر

....

پیا بن ہے ہماری سیج سونی — ہوئے رہ رہ مجھے دکھ درد دونی
پیا کے وصل کی ہوں ایسی بھوکی — کہ جوں سورج کے پچھون سورج موکھی
کنول ہوں میں کنول دی ہے مرا نام — مجھے جل بیچ بن سورج نہ آرام
نہ سورج بن ہوں میں آرام و کل میں — کھڑی جلتی ہوں نت آنسو کے جل میں
اکارت جائے ہے میری جوانی — پیا پردیس کیا یہ زندگانی

ارے کاتک کے ایسی دودھ کی رات — میں کہوا روکے کنجن سن مری بات
میں بے پر ہوں گی بے بس تو ہے پردار — مرا قاصد تو ہین تجھ پر مرا بھار

....

دکھاون تجھکون دل کی آگ کیوں کر کرون میں آہ تو تیرا جلے پر

گیا پھاگن چڑھا اب چیت سرپر جلی ہولی ہماری آگ لے کر

....

رہا ہے پھول سُنبل آج بن میں لگی ٹیسو کے دیکھے آگ تن میں

....

پھری پھرتی ہوں اس گل بن ڈنوا ڈول کروں کیا لیکے غنچہ کیا کروں پھول
مرے غم سین کوئی گُل چاک دامان مری حسرت ستیں غنچہ ہے حیران

....

تجھے تو گرمیٔ بازار ہے گُل مری آنکھوں میں آتش زار ہے گُل
جلے گا گُل لگے گی باغ میں آگ ارے بلبل شتابی بھاگ تو بھاگ

ستارے ہو گئے جلکر کے اخگر نکلتا ہر سحر خورشید جل کر
بگولہ جیٹھ کا آتش فشاں ہے غبار خاطر سرگشتگان ہے

لکھوں اس بے وفا کوں کیوں کہ پاتی بھر آتی آنکھ اور پھٹتی ہے چھاتی
لکھوں تو جل کے کاغذ خاک ہوئے قلم غم سُن کے سینناں چاک ہوئے

طوطا کی زبانی کنول دی کو رام راجہ کے آنے کی خبر ملتی ہے سے

مُشاطہ مجھکون آرائش ہے درکار — ہمارا آج کلہہ گھر آ چلا یار
شتابی کرمری زُلفوں کو شانان — کہ آتا ہے چلا میرا دیوانان
جب آویگا میں دیونگی اسکوں زنجیر — نکر تو شانہ کرنیں میں ذرا دیر

آخر کار رام راجہ آن ملا سے

سکھی جس وقت میرا یار آیا — اری مُردے نین پھر کر جان پایا
سکھی میں کیا کہوں سُکھ کی کہانی — پڑا موئے دھنوں میں جا کے پانی

اب کنول دی کی بیماری کا حال سُنئے سے

گئی وہ اس قدر نازک بدن ہو — کہ یک گلبرگ کا سو پیرھن ہو
نہ چُن سکتی زرُخ زُلفوں کا دامن — گلے میں ہو گئے چوں طوق آھن
ایتی نازک ہوئی اور ناتواں حال — نظر آتی نہ آئینے میں تمثال
نہ آتا لب تلک بھی شعلۂ آہ — نفس کیتی تھی چوں شمع سحرگاہ

کنول دی کی علالت کے غم سے رام راجہ کا حالِ زار سُنئے۔ سے

پریشان خاطر و آشفتہ اطوار — گیا ہو مُضطرب چوں نبضِ بیمار

.. ..

سراسیمہ ہوا اور اشک ریزاں — گیا بستر تلک اُفتاں وخیزاں
دم آخر وہ شوریدہ تصویر — ہوا معشوق سے جاکر بغل گیر
لگی کہنے کہ اے دیوانہ میرا — میں تیری شمع تو پروانہ میرا
کوئی ساعت میں آوے گی قیامت — میں جاتی ہوں سدا تو رہ سلامت
ترے تئیں دیکھ کر آتی روائی — کہ دیگی اب اَجل داغِ جدائی
ہوا اس فکر میں میرا جگر آب — کہ دوری کی تجھے کیوں کرکے ہو تاب

آخرکار کنول دی کی رُوح پرواز کرگئی ؂

اُڑی بو اور گیا بے آب ہو گُل — پری سا اُڑ گیا شیشے ستیں مُل

مثنوی گوہر کا بیشتر حصّہ 'بحر ہزج' میں ہے۔ 'بحر متقارب' کا بھی استعمال ہوا ہے۔ مثنوی میں شاعرانہ محاسن قدم قدم پر ہیں۔ منظر نگاری، جذبات نگاری، سوز و درد، محاکات، تخیّل، نادر، موزوں اور نفیس تشبیہات، اور استعارات کا استعمال یہ سب مثنوی کو پُرتاثیر بناتے ہیں۔

چند پُرتاثیر و نادر تشبیہیں دیکھئے: ؂

مرے جی بیچ کیا کیا درد بانٹا — کسی کا لے گلے کا ہے خرانٹا

بھنواں خمدار تیری اے پیارے — لگے ہے ناؤ دریا کے کنارے

تری یو مست ہیں آنکھیں گلابی شرابی ہیں، شرابی ہیں، شرابی

پو نوبت وصل کی اس مہ کے آئی دیا دل کا نگینا اں منہہ دکھائی

واردات اور کوائف کا لطیف بیان ملاحظہ ہو ؎

ترے آنسو کے تئیں دامن ہے منزل میرا آنسو گرے بر دامن دل

کرے ہے تو گریباں درد سے چاک میں جی ہی بیچ جل کر کے ہوئی خاک

مرد اور عورت پر غم عشق کا اثر جدا جدا حال پیدا کرتا ہے۔ اس نفسیاتی فرق کو کتنے لطیف و نفیس انداز میں پیش کیا ہے +

"قاضی عبدالودود صاحب کا یہ خیال صحیح ہے کہ " اس میں افضل کی بکٹ کہانی کے رنگ کے اشعار بکثرت موجود ہیں" پرافسر حسن عسکری صاحب نے بھی اس مشابہت کو نوٹ کیا ہے۔ یہ مشابہت بارہ ماسہ کے حصہ میں ہے۔ مگر افضل جھنجھانوی کا بارہ ماسہ مکمل دستیاب نہیں ہوتا۔ پرافسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں افضل کے بارہ ماسہ میں سے کچھ حصے نقل کئے ہیں:۔

افضل	جوہری
گھٹا کاری امڈ چھاتی سون آہی	گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم
برہون کی فوج نے کینی چڑاہی	مرے جی بیچ برہا آکرے دھوم

افضل	جوہری
پھبیٔ جل تھل پھبیا سر سبز عالم	زمیں کون ہے قبائے سبز دربر
نہیں جُز وصل کا سوکھا نہالم	سَبھیں ایسے میں پیو میرے ہیں باہر
ھندولی جھولتی سبھ نار پہ سنگ	سکھی سب جھولتے پیو سنگ جھولا
حسد کی آگ نی جارا مرا رنگ	جھولا تا چرخ مجھ کون چرخ ہنڈولا
اندھیری رین جگنوں جگ مگاتا	ارے جگنوں کا ایسا جگمگانا
اری جلنی اوپر تیں کیا جلاتا	ہوائیں اس سمئے میں پیو کا آناں
.. ..	نہ جگنوں میرے اس دردوں کے مارے
.. ..	فلک سے آئے ٹوٹے ہیں ستارے

جوہرؔی کے ہم عصر سجّاؔد پُھلواروی، تپاںؔ پُھلواروی، راجہ رام نرائن موزوںؔ، وغیرہ تھے۔ شیخ محمد روشن جوششؔ، شیخ محمد عابد دلؔ، خواجہ امین الدین امینؔ، شیخ غلام علی حضورؔ، میر غلام حسین شورشؔ، شاہ رُکن الدین عشقؔ وغیرہ بھی جوہرؔی کے ہمعصر یا قریب قریب ہمعصر تھے۔

اُس دَور میں بہارؔ کی اَدبی زبان بہت شُستہ و صاف ہو چکی تھی۔ لیکن اس

کے باوجود شاہ آیت اللہ کی مثنوی کی زبان پر افضل جھنجھانوی کی زبان کا اثر ہے۔
بھاشا کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے اور ساتھ ساتھ فارسی ترکیبیں بھی اُسی
انداز کی ہیں۔ مثنوی کی زبان فضا، مزاج اور اسلوب قدیم (ARCHAIC)
ہے۔ اس کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ کہ صوفیوں نے مزاجِ ھندی کا بڑا پاس کیا
ہے۔ کنول دی اور رام راجہ کے قصہ کی مناسبت کے لحاظ سے بھی ہم آہنگ
فضا نگاری کی تکمیل کے لئے بھاشا کا خوب خوب استعمال ہوا ہے۔ یوں تو
اُردو کا قدیم نام ھندی ہی ہے۔ خود جوہری کہتے ہیں۔ ع

بھرا ہوں درد شعر ھندوی موں

جوہری کے مرثیوں کی زبان بھی بھاشا آمیز ہے۔ وہ اُن میں سوز و درد،
غم و الم، رقت وُیکا نرم وگداز ہندی لفظوں کی مدد سے ہی پیدا کرتے ہیں۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آیت اللہ کو بھاشا کے عام پسند لفظوں سے ہم آہنگی
محسوس ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ فارسی ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں۔ بلکہ فارسی ترکیبوں
کے خوبصورت استعمال سے بھی وہ اپنے کلام کو رنگ اور آہنگ عطا کرتے ہیں۔
قدامت کا رنگ غالباً افضل کی پیروی کا نتیجہ ہو۔ یا ممکن ہے قدیم رنگ اور
روپ مثنویوں کا خاص ذریعۂ اظہار بن گیا ہو۔ لسانی خصوصیات کا مختصر تجزیہ
حسب ذیل ہے:-

نئی، نئیں = نہیں + سیں = سے + کون = کو + موں = میں +
کیّا = کیا + لیّا = لیا + کدھوں، کدھیں = کہیں، کبھی + تدھیں = تبھی +

جدہیں = جب بھی، یا جب کبھی + دوکھ = دُکھ + لاؤنا = لانا + پاؤنا = پانا + آؤنا = آنا + یو = یہ + نین = سے + گگن = آسمان + پچھوں = پیچھے + مروں ہوں = مرتا ہوں، مرتی ہوں + جیونکر، جیونکہ = جس طرح + کرناں = کرنا + وغیرہ وغیرہ نیز:۔ کیف سے کیفوں، خمار سے خماروں، درد سے دردوں، جمع بنا لیتے ہیں۔ 'بہنویں' اور 'بہنواں'، یہ دونوں جمع آتی ہیں۔ کلمہ کی جگہ کلمان بہ قافیہ مسلمان بھی لکھتے ہیں۔ 'ر' اور 'ڑ' 'اوتار' اور 'پہاڑ'۔ 'دوڑ' اور 'چوڑ'۔ 'نوڑی' اور 'چوری' کو ہم قافیہ لاتے ہیں۔ ھائے ہوز جا بجا تقطیع میں گرتی ہے۔ جا بجا فارسی فقرے اور مصرعے کے مصرعے ملتے ہیں۔ 'ہوتا ہے' کی جگہ 'ہو ہے'۔ 'کھاتا ہے' کی بجائے 'کھا ہے' مستعمل ہیں۔ غالبًا یہ بہاری بولی کا مقامی رنگ ہے۔ آج تک بہار میں یوں ہی بولتے ہیں۔ فارسی اضافت کے ساتھ ساتھ 'کا' اور 'کی' کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ گویا دُہری اضافت لگتی ہے۔

اِتے = اتنے۔ باورا = باؤلا۔ منرل = مندر

مغربی پراکرتوں میں جہاں 'ر' کی آواز ہوتی ہے وہ مشرقی پراکرتوں میں آکر 'ل' کی آواز سے بدل جاتی ہے۔ جیسے تَر ← تَل، تَرے ← تلے، مندر ← مندل، باورا ← باؤلا، بادَر ← بادل، جراؤ ← جلاؤ، کاری ← کالی، کر ← کَل (پہلو) وغیرہ وغیرہ۔ اندھلا = اندھا، سُوا = سُگّا (طوطا)۔ فارسی 'ان' سے جمع کی مثالیں زیادہ ملتی ہیں اور پنجابی

اثر کے تحت " ان " سے جمع کی مثالیں نسبتاً کم۔ یعنی اسم ھندی اور فعل ھندی کی جمع ' ان ' سے کم ملتی ہے۔ مگر ' ن ' کا اضافہ کثرت سے ملتا ہے۔ بھنواں = بھنویں، یاتان = یاتیں + کون = کو ، سین = سے +

' روپ '۔ ' سندر '۔ ' سلونا '۔ ' پیو '۔ ' پیا '۔ کنت '

کنگن وغیرہ الفاظ کا استعمال عام ہے۔

اب میں مرثیوں کا لسانی جائزہ لیتا ہوں :۔

مثنوی کی بُنیادی لسانی ساخت کھڑی بولی کی ہے۔ اس پر صرف قدامت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ مگر مرثیوں کی زبان ملوان ہے۔ اس کا لسانی ڈھانچہ بیشک کھڑی بولی کا ہی ہے۔ لیکن بیچ بیچ میں اور بولیوں کی لسانی ترکیب نظر آجاتی ہے۔ مثلاً :

' آل نبی نہیں جینے پایا '۔ ' سر نیزہ پر جھوم رہا ہے '۔ ' کوئی نہ بیکس کا حامی ہے '۔ ' آیہہ بَن میں سیس کٹایا '۔ ' رَن ہے ڈرونا بَن ہے بھونا ، کوئی نہیں ہے ھیبت اور سنگی '۔ ' کاٹ گلا لوہو سے نہلایا '۔ پہلے مرثیے میں کھڑی بولی کی اس دَھج کے ساتھ ' آنکھ سی بوندیں ٹپک گرت ہے مانو ساون کھس برساے ' کی ترکیب وساخت دیکھئے اُودھی بولی کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ نیز :

' بچے پیاسے بُھوک مَرت ہیں '۔ پنجابی اثرات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً : لاش کے نال (ساتھ) کھڑی وہ روئے ، ' کون کرے منظلوم کے پچھو رے '

وغیرہ ۔ زبان میں بھاشاؤں کے استعمال کے باوجود ریختہ پن موجود ہے ۔ عربی و فارسی الفاظ اور بھاشاؤں کے شبدوں کے استعمال میں توازن پیدا کیا گیا ہے ۔ مثلاً :

'تم بن کون کھبریا (خبر) لیوی....'

اب دوسرے مرثیہ کا لسانی تجزیہ کیجئے :۔

اس مرثیہ کی ترکیب مُسدّس کی ہے ۔ ہر بند کے پہلے چار مصرعے کھڑی بولی میں ہیں اور اس میں ریختہ پن نمایاں ہے ، چوتھے اور پانچویں مصرعے ملوان بولی میں ہیں اور ان میں بھاشاؤں کا رنگ گہرا ہے ۔ ان ٹیپوں کی زبان پر اودھی بولی کی چھاپ زیادہ ملتی ہے ۔ مثلاً :

جس کا پدر کٹا ہو نہ روئے تو کیا کرے
تن خاک میں پڑا ہو نہ روئے تو کیا کرے
مقتل پہ خوں بہا ہو نہ روئے تو کیا کرے
نیزہ پہ سر چڑھا ہو نہ روئے تو کیا کرے
جس کا بابا مر گیا چھوری کو کھائے حسین
تسکا بیٹا عابدین روُت ہے دن رین

امّاں یتیم خستہ کی بانو شکستہ دِل
مرنے سے شاہ دیں کے گئی خاک بیچ مِل
کیونکر نہ روئے چھاتی پہ غم کی دھری ہو سِل

جس پر کہ دُکھ پڑا ہو نہ روئے تو کیا کرے

نیناں مون انجھوان بھری بکھرے سیس کے بال
روُت پی پیاری او پرُمکھ پر انچرا ڈال

شاہ آیت اللہ کے علاوہ اور متعدّد صوفیائے پھُلواری شریف نے اُردو مرثیے لکھے۔ اِن کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ مرثیے دکنی مرثیوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ قماش بندی میں وُسعت و نُدرت پیدا کی گئی ہے۔ شاعرانہ معیار بھی بُلند تر ہے۔ واقعہ نگاری، محاکات، جذبات نگاری، پروازِ تخیّل، مصوّری، درد وسوز، سادگی، مقامی رنگ اور بھاشا کے برمحل و پُراثر استعمال سے یہ مراثی حُسن و تاثیر کے مخزن ہیں۔ زبان و بیان کی پختگی سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۰۶ھ سے بھی پہلے پھُلواری شریف میں مرثیہ نگاری ہوئی ہوگی۔ افسوس کہ مجھے اس سے قبل کی بیاض دیکھنے کی سعادت ابتک نصیب نہیں ہوئی۔

شاہ آیت اللہ کے تذکرہ کے اختتام پر میں ان کی ایک شہرآشوب درج ذیل کرتا ہوں۔ یہ نظم بھی مجھے پھُلواری شریف کے مخطوطات میں ملی۔ میں اس سِلسلہ میں حکیم شعیبؔ صاحب مرحوم کا ممنون کرم ہوں:۔

کہاں ہے دین کی شوکت، گئی کیدھر مُسلمانی
کیا ہے کفر نے اس دَور مون از بسکہ طغیانی

خراب ہیں مسجد محراب بنتے ہیں صنم خانہ
نہوئے ...... یہ ابلیس کو ہے میرسامانی
خدا کا گھر اندھیرا اور چراغِ دیر ہے روشن
رواجِ کفر پھیلا مضمحل ہے نورِایمانی
جیدھر دیکھو اودھر بتخانہ مو ناقوس بجتا ہے
سنی مسجد مون کم .... اب گلبانگ اذانی
برہمن قشقہ کش توقیر رکھتے ہیں ...... زاھد
رواج مالا اکثر ہے زرسم سبحہ گردانی
سواری لالہ و بابو کی کس بولش سبین جاتی ہے
کہ صوبہ دار ہندو اور ہے ہندو کو دیوانی
مُسلما کو نہیں توقیر کچھ ہی ان کی مجلس مون
سلام اس طور سبین لیں سرسین یون کرتے مگس رانی
دریغا پلہ کُفّار کا ہے اس قدر بھاری
کہ ہیں اب یہ مسلماں سب کم از پا سنگ میزانی
جمیّت دِین کی نہیں ہی ہے مُسلما نو کو عالم مون
زہے غیرت زہے عار و زہے ننگِ مُسلمانی
ہراک کافر کو ہے سرموانا الدجّال کا دعویٰ
نہ عیسیٰ چرخ سے اوترے مٹے جو کفر کے بانی

نہ مہدی آتے جو یہ کفر سب مسمار ہو جاوے
چراغِ کشتۂ اسلام ہر گھر ہوئے نُورانی
جہاں اب قاف سے ہے قاف تک ظلمت کدہ سارا
کہ دُودِ ظلم سے روز ہے شب دیجور ظُلمانی
مگر زلف پری رویان کو گھر سے خواب مون دیکھا
کہ کرتی ہے درو دیوار سے بارش پریشانی
رباب و چنگ سے جانسوز تر ہے آہ مظلوماں
ہوا بیشہ نیستان اور دلِ عالم نیستانی
رگیں نالاں تر ہیں تارِ رباب و چنگ بربت سے
کہ دست گوشمال چرخ سے عالم ہے افغانی
ہوا گوشِ فلک کا کر فغان داد خواہاں سے
نہ کھولے کان گُل کا نالۂ ہائے مُرغِ شبانی

.. ..

.. ..

جہاں سے اُٹھ گئی ہے اے عزیز و خیر و برکت سب
گئی مِہر و محبت اور بڑھی ہے حرص حیوانی
نہ شفقت باپ کو بیٹے سے نہ مادر کو دختر سے
حسد بھائی کو بھائی سے کہاں ہے درد اخوانی

قناعت ہے کہاں عالم موں اب عنقائے مغرب ہے
لجالجت اور سماجت کی پٹ ہے گرم دُکانی
دہانِ مردمِ دانا کھلا رہتا ہے فاقہ سے
جو ناداں ہیں اونھوں کی ہے کمر موں زرہمیانی
بجاہے صاحب معنی جو نا پرساں ہو عالم موں
کرے کیوں کر کے نادان مرد دانا کی قدردانی
نہیں پوچھے ہے کوئی پاکوں کو ہرگز اس زمانہ میں
موقر ہیں کلوخ و سنگ استنجائے شیطانی
کمینوں کی بنی ہے اور نجیباتوں پہ حالت ہے
زمانہ منقلب برعکس ہے تاثیر دورانی
چمن میں کیوں نہ نرگس سب کی مقبول طبائع ہو

....

میرؔ اور سوداؔ کی شہرآشوبوں کی طرح آیت اللہ کی شہرآشوب سے بھی اُس عہد کی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ عظیم آباد و بہار پر اس عبوری وطوفانی دَور میں کیا گذری اُس کا کسی قدر حال ہمیں مندرجہ بالا نظم میں ملتا ہے +

شاہ آیت اللہ کے مُرید اور شاگرد بہ کثرت تھے۔ چند کا نام حسب ذیل ہے :-

سید شاہ وارث علی، مفتی غلام مخدوم ثروتؔ، امان علی ترقیؔ، غلام شبلیؔ

وُسعت، غلام جیلانی مخزوؔن وغیرہ۔

نور محمدؒ دِلدآر

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں: "دلدآر کے حال یا کلام سے تذکرے خالی ہیں" (صدائے عام ص۱۸، عید نمبر ۵۳ء پٹنہ)۔ پرافسر سید حسن عسکری صاحب نے سب سے پہلے دلدآر کے کلام کو ڈھونڈ نکالا۔ اِن کے مختصر دیوان کا واحد نسخہ بہار ہسٹوریکل ریسرچ سوسائیٹی کی مِلک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاہ مجیب اللہ صاحب پُھلواروی کے مُرید تھے۔ لہٰذا دِلدآر شاہ سجّاد اور شاہ آیت اللہ کے ہمعصر ثابت ہوتے ہیں۔ اِن کا وطن آرہ تھا۔ ایک شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ستّر سال سے زیادہ عمر پائی۔ مجموعۂ کلام میں کم و بیش ۲۴۰ (دوسو چالیس) شعر ہیں۔ اور یہ سب مِلتے جلتے اوزان و بحور میں ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں: "دلدآر کے اشعار کی تقطیع عروض عربی و فارسی کی رو سے ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ بہتر ہوگا، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ عروض ہندی کے مطابق ہیں۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ ہندی عروض مقدّم الذکر سے متاثر ہوا ہے یا نہیں" دلدآر نے کسی زمین میں دو سے زیادہ شعر نہیں کہے۔ ہر مصرع میں قافیہ ہوتا ہے اور چاروں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ دِلدآر، صوفی شاعر تھے، ان کے اندر

آفاقی مذہبیت اور وسیع القلب روحانیت پائی جاتی ہے۔ دِلدار کی زبان پر بھاشاؤں کا رنگ غالب ہے۔ بہاریت اور مقامی رنگ کی جھلک زبان و بیان نیز تشبیہوں اور استعاروں میں ملتی ہے۔ اس لحاظ سے دِلدار کی شاعری کی بڑی اہمیت ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔ ؎

کھیت کو مَن کے پریم کے ہَل سے جوت کے چوکی درد کی کھینچ
گھاس دوئی کی کھود کے ساری کر وحدت کا کادو کھینچ
دانہ یاد کا بوکر اے دلدار فنا کا پانی سینچ
ہوگا حاصل بہتر اس کا خلل نہ ہوگا اس کو بیچ

جو صورت جدی جدی ہیں اک مائی کے جائے ہیں
کھانا دانہ ان سبھوں نے ایک خوان سے کھائے ہیں
کوئی مُسلماں، کوئی یہودی، کوئی ہنود کہائے ہیں
وحدت سے کثرت میں اور دلدار یہ سب .. ..

پہلے میا موہ کو چھوڑ کے ہرے مارے تن کو (کذا)
برہم کی آگ لگائے کے اے دلدار جلائے تن کو
یاد کی انجن سے پھر روشن دل کے کرے رتن رتن کو
ایسے جتن سے دیکھے تو تب اپنے مدن موہن کو

جس میں ہووے سکھی بھلا سو کر لے اے مدھ ماتا
کہنا میرا دل میں تیرے کچھ بھی نہیں سماتا
وقت پڑے پر بھائی بیٹا کوئی کام نہیں آتا
ہوگا اے دلدار انھوں سے جینے جی کا ناتا

انہیں چوپائی یا قطعہ یا رُباعی کہہ لیجئے - بہرحال کلام منظم، مربوط سادہ، پُر اخلاص اور پُر اثر ہے -

---

میر وارث[1] علی نالاں متوفی سنہ ۱۱۹۹ھ

علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں - "نالاں عظیم آبادی، میر وارث علی خلف میر اندازانی، موطنش قصبۂ بہار ست، اما سکنے درعظیم آباد اختیار کردہ بہ سرداری شیشہ گران اعتبار دارد - جوان سنجیدہ اطوار از تربیت یافتگان مرزا اشرف علی خاں فغاں ست ..... سال وفات سنہ ۱۱۹۹ھ ہے ۔

جوشش اس کے وفات کی تاریخ ؎ 'میر وارث علی نالاں' ہے
مطبوعہ[2] گلزار ابراہیم میں' نالاں کے اشعار نہیں -لیکن جس قلمی نسخہ سے انجمن ترقی اُردو کا شائع کردہ تذکرہ مرتب ہوا ہے اُس میں حسب اطلاع مرتب

---

[1] 'معاصر' پٹنہ، اگست سنہ ۱۹۴۱ء ص ۳۸، ۳۷ + [2] یہ تذکرہ "مسخ شدہ شکل میں انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوا ہے - دو قلمی نسخے پٹنہ میں ہیں +

پچیس[25] اشعار نالاںؔ کے موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار کتب خانۂ مشرقیہ کے قلمی نسخہ سے نقل کئے گئے ہیں :-

زُلفوں میں جب میں تیری گرفتار ہوگیا　　آزادگی کے نام سے بیزار ہوگیا

نالاںؔ اسیرِ زُلف کو آزادگی کہاں　　اس پیچ میں پڑا سو گرفتار ہی رہا

آغازِ محبّت میں اگر جان نہ دیتے　　یہ کام کسی طرح سے انجام نہ ہوتا

پوجا کرے ہے جو کوئی دل کی کنشت کا　　اے شیخ معتقد نہیں وہ سنگ و خشت کا

یک بہ یک شام کو وہ یار جو گھر سے نکلا　　لوگ حیراں ہوئے یہ چاند کدھر سے نکلا

قتل کو تیرا ہی مزاج نہیں　　ورنہ میں کب کہا کہ آج نہیں

اے چشم رازِ عشق کو افشا نہ کیجیو　　ناحق کسی غریب کو رُسوا نہ کیجیو

چین سے بیٹھنے کہیں نہ دیا　　مجھ کو میری ہی بدگمانی نے

آنکھیں پُرآب، خاک بسر، جیب چاک ہے ۔۔۔ نالاںؔ یہ کیا ہوا، تری صورت بدل گئی

کل سے کچھ ہو رہے ہو برہم سے ۔۔۔ ایسی تقصیر کیا ہوئی ہم سے

کس روز میری خاک پہ تو نے گزر کیا ۔۔۔ آلودہ کب ہوا ترا دامن غبار سے[1]

غلام جیلانی محزوںؔ پھلواروی

۱۱۳۸ھ تا ۱۲۰۲ھ

غلام جیلانی نام۔ تخلص محزوںؔ۔ پیدائش ۱۱۳۸ھ[2]۔ وفات ۱۲۰۲ھ۔ غزلیات فارسی میں سرشارؔ تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں صاحب دیوان۔ حضرت آیت اللہ کے شاگرد۔ مجھے خانقاہ سلیمانیہ سے جو مجلد مخطوطات ملے تھے اُن کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

نمبر ۱۲۶۶ مجید عالم[3]

"فہرست مراثے مندرجہ و مرقومہ این کتاب بقید اعداد صفحات و نام مصنف آں بنظر برو آوردن ہر مرثیہ خواستہ باشند بسہولت وآسانے بر وفق عدد صفحہ کہ بالائے آں

---

[1] 'معاصر' پٹنہ، اگست ۱۹۴۱ء۔ مرتبہ قاضی عبدالودود صاحب +

[2] ان تاریخوں کی اطلاع حکیم شعیب صاحب مرحوم کی مہربانی سے ہوئی +

[3] کاتب مجید عالم نامی کوئی صاحب تھے۔ مکتوب (م) ۱۲۶۶ھ کا ہے +

نوشتہ می آید"

فہرست مجلد قلمی نسخہ مراثی پھلواری شریف

(۱) شاہ محمد آیت اللہ مذاقؔ ص۱ ، ص۵ ایضاً منہ (مرثیہ ۱۲۰۶ھ)

(۲) مولوی غلام جیلانی محزونؔ ص۱۳ (غزل مرثیہ ۱۲۰۶ھ)

(۳) مولانا شاہ عبدالغنی مدظلہ، ص۱۵، ایضاً ص۱۷، ایضاً ص۱۹، ص۲۳، ص۲۵، ص۲۸ و ص۲۹
(مراثی ۱۲۲۱-۳۲ھ)۔

(۴) شاہ امان علی ترقیؔ۔ ص۳۱، ص۳۶، ص۳۹، ص۴۲ و ص۴۸ (مراثی ۱۲۲۵-۳۴ھ)

(۵) مفتی غلام مخدوم ثروتؔ، ص۵۱ (مرثیہ ۱۲۱۳ھ)

(۶) شاہ امان علی۔ ص۵۴، ص۵۷، ص۶۳ ص۶۵ و ص۶۷ (مراثی ۱۲۲۵-۳۴ھ)

(۷) مولوی احسان علی تودّدؔ۔ ص۶۹ (سلام ۱۲۳۵ھ)

(۸) شاہ امان علی ترقیؔ۔ ص۷۱

(۹) مولوی جواد علی صاحب۔ ص۷۶، ص۷۹ (مراثی ۱۲۲۶-۳۴ھ)

(۱۰) شاہ محمد حسن صاحب وحدتؔ۔ ص۸۱، ص۸۳ (مرثیہ ۱۲۴۴ھ)

(۱۱) مولوی علی وارثؔ۔ ص۸۵۔ (مرثیہ ۱۲۴۲ھ)

(۱۲) مولوی محمد وجیہہ۔ ص۸۷۔ (مرثیہ ۱۲۳۴ھ)

(۱۳) مولوی سید ابراہیم علی۔ ص۸۹ (مرثیہ ۱۲۳۶ھ)

(۱۴) مولوی قطب الاولیاء۔ ص۹۱ (مرثیہ ۱۲۶۱ھ)

(۱۵) مولوی کمال علی صاحب۔ ص۹۵ (مرثیہ ۱۲۳۴ھ)

(۱۶) مولوی رضی الدین احمد - ص۹۶ (مرثیہ ۱۲۲۰ھ)

(۱۷) مولوی محمد طالع مغموم - ص۹۹ و ص۱۰۱ (مرثیہ ۱۲۲۲ھ)

(۱۸) قاضی غلام حق - ص۱۰۳ (مرثیہ ۱۲۲۸ھ)

مندرجہ ذیل نام فہرست میں درج نہیں ہیں، نسخہ میں موجود ہیں۔

(۱۹) مرثیہ شاہ غلام شبلی وسعت - ص۱۰۷، ص۱۱۰، ص۱۱۲، ص۱۱۵ ص۱۱۷ (مراثی ۱۲۳۲ھ / ۱۲۰۶ھ)

(۲۰) مولوی سید واحد علی واحدؔ عرف محمد خیراتی، المعروف بہ خیرات علی - خلف قاضی مولوی غلام قادر - ص۱۱۹، (مرثیہ ۱۲۲۳ھ)

(۲۱) مولوی احسان علی توّد - ص۱۲۲، - دو اوراق سادہ، ایک ورق غائب۔

(۲۲) مولوی محمد علی سجّاد - ص۱۳۱ (مرثیہ ۱۲۳۹ھ)

(۲۳) مولوی محمد یونس، مرثیہ بہ اصلاح حضرت فردؔ مدظلہٗ العالی - ص۱۴۳ (مرثیہ ۱۲۳۶ھ)

(۲۴) مولوی جانعلی - ص۱۴۴

اکثر و بیشتر مرثیوں پر سنہ تصنیف یا سنہ خواندگی درج ہے۔

محزوںؔ پھلواروی کا نمونۂ کلام حسب ذیل ہے

غزل مرثیہ محزوںؔ

چلا خنجر کٹا جس دم گلا شبیر سرور کا [1] زمیں لرزی فلک کانپا اوٹھا تب شور محشر کا

---

[1] تمت المرثیہ از مولوی محمد یونس مرحوم برادر خورد مولوی نوازش علی صاحب علیہ رحمتہ در ۱۲۳۶ھ یک ہزار و دو صد و سی و شش ہجری بہ اصلاح استادی و مرشدی حضرت فردؔ مدظلہٗ العالی۔"

(ص۱۴۴ - مجلد نسخہ پھلواری)

۲۰ عزیزو قصۂ اندوہ وطومار جفا کوئی لکھے کیا، غم سے ہوتا ہے[1] گریباں چاک دفتر کا

۱۸ ہوا خورشید محشر کا جہاں میں ہر طرف روشن بدن سے کاٹ نیزہ پر رکھا جب سیس سرور کا

۲۴ اگرچہ دست کوتاہ ہوں میں یہ محزوںؔ بچارا ہی نہ چھوڑے گا قیامت بیچ دامن سبط سرور کا

تمام شد غزل مولوی غلام جیلانی صاحب علیہ رحمۃ متخلص بہ محزوںؔ و درغزلیات فارسی کہ دیوان مرتب شدہ ست تخلص ایشان سرشار بود فقط۔

(قلمی نسخہ مجلّد، پھلواری شریف، سنہ تصنیف ۱۲۰۶ھ)

شیخ غلام یحییٰ قدس سرہٗ حضور متوفی ۱۲۰۶ھ

جناب غلام یحییٰ[2] کا شمار عظیم آباد کے مشائخ میں تھا۔ مذہب حنفیہ، مشرب چشتیہ۔ طبابت میں بھی مہارت تھی۔ آپ کے مُرید و معتقد بہ کثرت تھے۔ آپ شاہ محمد مظہر بن شاہ محمد اطہر کے بیٹے تھے۔ تاریخ وفات ۸ جمادی الثانی روز جمعہ، ۱۲۰۶ھ۔ آپ نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ تجارت کرتے تھے۔ اُنہوں نے درگاہ شاہ ارزاںؒ کی توصیف میں ایک مثنوی[3] تقریباً ۱۱۹۰ھ میں لکھی تھی۔ چند شعر حسب ذیل ہیں ؎

مزار اوس کی پہ گنبد نہیں، ہے قبہ نور وہاں ہے جلوہ نما کچھ عجب طرح کا ظہور

۱۔ قلمی نسخہ میں "ہے" چھوٹ گیا ہے + ۲۔ "تذکرۃ الصالحین" مؤلفہ مولوی محمد حسیب اللہ۔ اور "تذکرۂ گلزارِ ابراہیم" + ۳۔ "تاریخ شعرائے بہار"، قلمی صفحہ ۱۴-۱۵ +

وہاں جو حوض نظر آتے ہیں وہ حوض نہیں — میں دیکھا چشم صداقت سے آج اوسکے تئیں
اور ایک طرف سین پری رو ہیں مایۂ تسخیر — لئے دلوں کو پھنسانے کو زلف کی زنجیر
عجب طرح کی ہے اون کی نگاہ کیا کہیئے — وہ کھب رہی ہے مرے دل میں آہ کیا کہیئے
جب اون کے چاہ ذقن کا خیال آتا ہے — تو کیا کہوں مراجی ڈوب ڈوب جاتا ہے

حضور کی غزلوں سے اشعار نقل کیے جاتے ہیں :-

(۱)

جو یوں آپ بیرونِ در جائیں گے — خدا جانے کس کس کے گھر جائیں گے

. . . . — . . . .

مسافر ہیں لیکن نہیں جانتے — کہاں سے ہم آئے کدھر جائیں گے
تمنا میں بوسہ کی کہتا ہے جی — بدن سے نکل بھی اگر جائیں گے
تو ہے ایک دم اور ہزاروں امید ق — لبوں پر کوئی دم ٹھہر جائیں گے

بہ حرمت نبھی اب تلک جس طرح
حضور اتنے دن بھی گذر جائیں گے

(۲)

آبرو الفت میں اگر چاہیئے — رکھیئے سدا چشم کو تر چاہیئے
دل تجھے دے ہی چکے، جان بھی — لیجیئے حاضر ہے اگر چاہیئے

. . . . — . . . .

دل بھی جواہر ہے ولیکن حضور — اس کے پرکھنے کو نظر چاہیئے

(۳)

منعم نہ ہو مغرور، سدا پاس کسو کے | سیم و زر و گوہر نہ رہا ہے نہ رہے گا
گر عیش میسّر ہو تو کر لیجے کم و بیش | سب وقت برابر نہ رہا ہے نہ رہے گا

(۴)

ہے[1] افسوس اے عمر جانے کا تیرے | کہ تو میرے پاس ایک مدّت رہی ہے
یہ طوفانِ اشک اس میں آنکھوں کی کشتی | تعجّب ہے کیونکر سلامت رہی ہے

خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ سیٹی کے سجادہ نشیں مولانا صبیح الحق صاحب کے پاس حضور کی چند مثنویاں ہیں۔ ایک کا عنوان "مثنوی در تعریف درگاہ شاہ ارزاں" ہے۔ اس کے ۸۴ اشعار محفوظ ہیں۔ چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں:-

خدا اگر مری آنکھوں کو دیوے بینائی | تو کیجئے عالم کثرت میں سیر یکتائی
گلِ ظہور سے اُس کے ہے یہ جہاں گلزار | جو چشم ہووے تو ٹک دیکھیئے یہ باغ وبہا
بلند ہی ہے کیا ہی نہ آسمان یہ صورت دہر | بسے ہیں صفحۂ روئے زمیں پہ کیا کیا شہر

رواں کروں ہوں میں اسکو سوئے عظیم آباد | کہ وہ بھی زور ہے بستی رکھے کریم آباد

جو لوگ بولتے ہیں صوبۂ بہار ہے یہ | بکسر بے غلط انعام ہے بہار ہے یہ

---

[1] معاصر، پٹنہ، دسمبر ۱۹۴۰ء۔ صفحہ ۶۸-۶۷

غرض جو ہے تو یہی ہے کہ اسکو لوگ پڑھیں　　گنا ہگار ہوں شاید دُعائے خیر کریں

حضورؔ کی دوسری مثنوی ہجو یہ ہے۔ یہ ناقص الاخر ہے۔ کُل ۳۱ اشعار ملے ہیں ؎

گر ولایت سے رزالا بھی یہاں آتا ہے　　اپنے تئیں عُمدہ و اشراف ہی کہلاتا ہے

وہاں کہ درزی کے کتر بیونت کی باتیں جو سنو　　اسکی قینچی سی زباں چلتے جو دیکھو تو کہو

ایسا کوئی صاحب تقریر نہ ہووے گا بشر　　جامۂ طرز سخن قطع ہوا ہے اُس پر

حضورؔ کی تیسری مثنوی ایک مہاجن کی ہجو میں ہے۔ اِس کے ۲۳ اشعار ملے ہیں۔ ؎

مہاجن ایک ہو گر ذکر اس کے نام کا کیجئے　　تو ساری عمر پھر کھانیسے اپنا ہاتھ دھو لیجئے

کسو کو وقت کھانے کے اگر اس کا خیال آوے　　تو ہر چاول کا دانہ پارۂ الماس ہو جاوے

اپنے گھر بیچ جو پالے ہے وہ مرغا مرغی　　دانہ کھانیکے تئیں پاتی ہے کچھ کیا مُرغی

ٹھو کتا جاہے زمیں پر کہ غذا ہو اُس کی　　صبح سے شام تلک ہینگی یہی خُو اُس کی

مُرغی اس وقت نہ ہو اور کھنکھار آجاوے　　جمع کر مُنہ میں لیئے رہتا ہے جبتک آوے

اصالتؔ خاں ثابتؔ متوفی سنہ ۱۲۰۸ھ ۱۰۸۰ء

اصالتؔ خاں، تخلص ثابتؔ، متوطن عظیم آباد۔ قوم افاغنہ میں سے تھے۔ سنجیدہ

۱؎ معاصر، پٹنہ، جولائی ۱۹۴۲ء۔ از قاضی عبدالودود۔ بحوالہ تذکرۂ عشقی +

وضع، خوش اخلاق، گرم جوش و ثابت قدم۔ او اخریں مرزا ...... فدوی ...... کے شاگرد ہوئے۔ ۱۲۰۰ھ میں وفات پائی۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔ ؎

روشن ہے میرے سینۂ سوزاں میں داغ ایک　　تاریک گھر میں جلتا ہو جیسے چراغ ایک

زلف و رُخ سے دُور پڑے ہیں، کہہ دل اب کیا کام کریں
شام سے رو رو صبح کریں، یا صبح سے رو رو شام کریں

اب پیار کر وہ ہمکو کیا ہے　　پیارے کہیں دل تو نہیں لگا ہے

ہیبت قُلی خاں حسرت متوفی سنہ ۱۲۱۰ھ

نام میر محمد حیات، عظیم آباد کے رہنے والے۔ مرزا مظہر جانجاناں دھلوی کے شاگرد۔ پہلے میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ ایک دیوان[1] ریختہ جس میں قریبًا دو[2] ہزار اشعار ہیں، ان کی یادگار رہے۔ فیلن صاحب کے بقول ایک قصّہ طوطی نامہ[3] بھی ان کا تصنیف کیا ہوا تھا۔ حسرت کا دیوان حسرت موہانی کے پاس تھا۔ اور انہوں نے اس کا انتخاب بھی شائع کیا ہے[2]۔

تاریخ شعرائے بہار میں بلخی صاحب ان کا لقب ہیبت قُلی خاں لکھتے ہیں۔

---

[1] "تاریخ شعرائے بہار" بلخی صہ ۱۲ + [2] "قاضی عبدالودود صاحب" صدائے عام" عید نمبر ۵۳ء صہ ۱۹
[3] مثنوی کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی ملکتہ میں محفوظ ہے

پرافسر دردائی اپنی کتاب 'بہار اور اُردو شاعری' میں لکھتے ہیں : "گلشن پنجاب میں بجائے بیعت قلی خاں کے ہیبت قلی خاں لکھا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ..." (ص۳۸)۔ پرافسر عطاء الرحمٰن کاکوی لکھتے ہیں "دردائی صاحب نے بامرار ان کا لقب بیعت قلی خاں لکھا ہے۔ یہ غلط ہے .... اور سب تذکرہ نگار متفق ہیں کہ یہ عظیم آبادی تھے" خود عطا صاحب لکھتے ہیں کہ "میر محمد حیات نام سبیت قلی خاں لقب، حسرت تخلص، خاص عظیم آباد کے رہنے والے تھے ......" (ساتھی، پٹنہ۔عید نمبر ۱۹۵۵ء ص۱۹)۔ قاضی عبدالودود صاحب ہیبت قلی خاں ہی لقب لکھتے ہیں۔ عجیب بات ہے دلیل نہ دردائی صاحب دیتے ہیں۔ اور نہ عطا صاحب۔ تذکرۂ شورش میں حسرت کے ۶۶ اشعار درج ہیں۔ گلشن ہند' میں ۱۴ شعر اور 'مسرت افزا' میں ۳ شعر۔ 'جواہر سخن' مرتبہ کیفی چریا کوٹی میں غزلوں کے ۴۹ شعر فرداً فرداً پیش ہوئے ہیں۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے اُدھر پہاڑ اِدھر ایک شیشۂ دل ہے

آپ ہی اپنے یار تھے۔ جانا نہیں غیر میں بھولے تھے پہچانا نہیں

ہم نہ ہوں تُو ہو تو سب چرچا کریں شمع ہے محفل میں پروانہ نہیں

کعبہ بھی ہم گئے نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

دیوان یقین [illegible]

لے اوڑا کام اپنا پروانہ ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے

شاہ کمال علی کمال متوفی سنہ ۱۲۱۵ھ

شاہ کمال علی[1] - تخلّص کمال - متوطن مان پور، ضلع گیا - سکونت دیورہ متصل بہار شریف - اُردو، فارسی دونوں میں کہتے تھے - ان کا دیوان قاضی عبدالودود صاحب نے بہ افساط معاصر، پٹنہ میں شائع کرایا ہے - "اُن کے دیوان اُردو سے کہیں زیادہ اہم ان کی مثنوی ہے" (ق - ع - و) مثنوی فلسفہ آمیز تصوّف سے بھری ہوئی ہے - کہیں کہیں عاشقانہ رنگ بھی ہے - ملاحظہ ہو ؎

بہار آئی ہے کس شوکت سے امسال بنفشہ پر ہوا سنبل جنور ڈھال
سماتا نہیں ہے اب گل پیرہن میں یہ کس کی بو صبا لائی چمن میں
یہ کس کے آنے کا مژدہ لے آئی یہ ایسی بو صبا نے کس سے پائی
عجب کیا ہے جو بلبل کی فغاں سے گرہ کھل جائے سوسن کی زباں سے
سبھی دستاں سرا کیا غنچہ کیا گل ڈریں ہیں باغ میں کیا غنچہ کیا گل

شیخ محمد عابد دل

شیخ محمد عابد نام - دل تخلّص - وطن عظیم آباد - شیخ محمد روشن جوشش

---

[1] تاریخ شعرائے بہار، بلخی صفحہ ۲۴ - وصدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۰

کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں بھائی جسونت رائے ناگر[1] کے بیٹے تھے۔ صاحبِ دل، مردِ کامل، بے ریا و بے ریا، عابد و عاشق مزاج، صاحبِ اخلاقِ حمیدہ، نواب علی ابراہیم خاں[2] خلیل لکھتے ہیں کہ ۱۱۹۳ھ ہجری میں عابد دل نے اپنا کلام مرشدآباد بھیجا۔ تاکہ تذکرۂ گلزار ابراہیم میں درج کیا جائے۔ غالباً شیخ محمد روشن جوشش نے بھی اپنا کلام وہاں روانہ کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ پرافسر سید حسن عسکری صاحب اور عزیزم پرافسر حسنین کو حال ہی میں مرشدآباد کے سرکاری کتب خانہ میں جوشش کا ایک اور دیوان ملا جس میں قاضی عبدالودود صاحب کے مرتب کردہ دیوان سے زیادہ غزلیں ملتی ہیں۔

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں "ان[3] کا دیوان سنا گیا ہے کہ پٹنہ میں ایک صاحب کے پاس ہے۔ انھوں نے اردو عروض پر عروض الہندی کے نام سے ۱۱۷۶ھ میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ جس کے دو نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔"

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

ے
بدنام ہوئے مفت میں، حاصل نہ ہوا کچھ
فریاد کی نسبت تو خموشی میں اثر تھا

---

[1] تذکرۂ مسرت افزا۔ نسخہ قلمی آکسفورڈ و معاصر، پٹنہ ۔ ۵۴ء و ۵۵ء۔ ابوالحسن امراللہ الہ آبادی۔ ملاحظہ ہو دیوان جوشش: قاضی عبدالودود ص ۱۷-۱۰۔ اور تذکروں میں بھی اس امر کا ذکر ہے + [2] تاریخ شعرائے بہار جلد ۱ ص ۱۹
[3] صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء: ص ۱۹۔ نوٹ:۔ عشق عظیم آبادی کے بیان سے دل کا دلی سے عظیم آباد آنا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کسی دوسرے تذکرے سے اسکی تائید نہیں ہوتی۔ مقدمہ دیوان جوشش از قاضی عبدالودود ص ۱۵۔

گریار نے آنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا　　ابتک دلِ مضطر نے کیا کیا نہ کیا ہوتا

مجھے تو حکمِ ضبطِ نالہ و فریاد ہوتا ہے
پر اس بیتاب دل کو حق میں کیا ارشاد ہوتا ہے

جوں آئینہ بہ ستم رسیدہ　　رہتا ہے مدام آب دیدہ

شعر جوشش کا ہے ملاحظہ ہو دیوان

شیخ محمد روشن جوشش

قریباً ۱۱۵۰ھ تا ۱۲۱۶ھ قریباً

محمد روشن نام ۔ جوشش تخلص ۔ شیخ محمد عابد دل کے چھوٹے بھائی ۔ نو مسلم ۔ جوشش کا سال ولادت و وفات معین نہیں ۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد تھے ۔ قاضی عبدالودود صاحب نے دیوان جوشش جناب عبدالرشید نبوی کے قلمی نسخہ سے مرتب کیا ہے ۔ اسے انجمن ترقی اُردو (ہند)، دہلی نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا ۔ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں "ان کے دیوان کا صرف ایک نسخہ قلمی باقی ہے" لیکن اب پرافسر حسن عسکری صاحب اور ڈاکٹر حسنین نے دیوان جوشش کا ایک اور قلمی نسخہ مرشدآباد کے سرکاری کتب خانہ میں دیکھا ہے ۔ دیوانِ مطبوعہ کے مقدمہ میں جوشش کے حالات، مرتب نے نہایت کاوش سے پیش کردیئے ہیں ۔

لکھتے ہیں :

"جوشش، عظیم آباد کے مایۂ ناز شاعروں میں ہیں۔ ہمعصر تذکرہ نگاران کی استادی کے قائل ہیں۔ اور شیفتہ سا مشکل پسند نقاد ان کی نغز گوئی کا معترف ہے"

(دیوان جوشش ص۳)

"جوشش کے واقعات زندگی تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں" اور دیوان بھی اس پر زیادہ روشنی ڈالنے سے قاصر ہے" (ص۴)

جوشش تذکروں میں

(۱) تذکرۂ میر حسن، طبع ثانی ص۴۳ :- "میاں محمد روشن، المتخلص بہ جوشش مردے ست ساکن عظیم آباد، خوش طینت و نیک اعتقاد۔ شاعر شیریں کلام، صاحب دیوان از خاصان آں دیارست۔ ۔ ۔ ۔"

(۲) تذکرۂ شورش۔ نسخہ قلمی آکسفورڈ :- "محمد روشن ...... از خاک عظیم آباد ...... در نظم و نثر صاحب استعداد۔ حسن معانی و شستگی الفاظ از کلامش ظاہر ...... غزل و قطعہ و رباعی و مخمس وغیرہ بہ فصاحت و بلاغت تمام بہ زبان قلم می آرد .... مذاق درویشانہ دارد ...... دیوانش قریب سہ ہزار شعر خواہد بود "

(۳) مسرت افزا، مرتبہ ابوالحسن امراللہ الہ آبادی، نسخہ قلمی آکسفورڈ یونیورسٹی :- "میاں محمد روشن جوشش برادر خرد محمد عابد دل، کہ ہر دو برادر از صلب جیونت رائے

۱۔ فوٹو اسٹیٹ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری + ۲۔ فوٹو اسٹیٹ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری" ابوالحسن ۱۱۹۲ھ میں عظیم آباد آئے اور کچھ دنوں یہاں مقیم رہے تھے ... " جوشش ۔

ناگرچون ابراہیم خلیل از آذر ظاہر شد .... دیوانِ اشعارِ وے مرتّب ست ۔"

(۴) گلشنِ سخن قلمی مرتبہ مردان علی خان مبتلا :۔" .... جوشش .... رفیقِ راجا رام نرائن ناظم عظیم آباد بود .... کلامش مرغوب طبعِ سخن سنجان و در نظم و نثر صاحب استعداد ۔ دیوانش دو ہزار بیت دیدہ شد ...."

(۵) تذکرۂ قدرت اللہ شوق وقدرت :۔"...... اشعار دال بر جوشش دلِ اوست ......"

(۶) گلزارِ ابراہیم :۔" جوشش .... از اہالی صوبۂ بہار ۔ .... ابیات منتخبۂ دیوان خود در سنہ ۱۱۹۴ ہجریہ بہ راقم آثم فرستادہ .... می توان گفت کہ شیوۂ خواجہ میر درد را بہ خوبی ورزیدہ ...."

(۷) تذکرۂ عشقی عظیم آبادی :۔" جوشش ، اسمش محمد روشن .... از ریختہ گویانِ با استعدادِ عظیم آباد ست ...."

(۸) تذکرۂ ہندی مصحفی صہ ۶ :۔" محمد عابد جوشش تخلّص ... " قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں :۔" نام کے متعلّق مصحفی کی غلط بیانی حیرت انگیز ہے ۔" (دیوان جوشش ط ۲۶)

(۹) ریاض الفصحا مصحفی صہ ۶۸ :۔ " میاں محمد روشن ، جوشش تخلّص ۔ از قدماست ۔"

(۱۰) گلشنِ ہند مرتبہ مرزا علی لطف ، طبع اوّل صہ ۶۷ ۔ گلزارِ ابراہیم کا ترجمہ ہے ۔ دو ایک تعریفی فقرے بڑھا دیئے ہیں ۔

(۱۱) گلشنِ بے خار ، مرتبہ شیفتہ دہلوی ۔ مطبوعہ مطبع اودھ اخبار سنہ ۱۹۱۰ء ۔ صہ ۵۱ :۔

" جوشش تخلص، شیخ محمد روشن، از تازہ خیالان عظیم آباد ست ..... فکرش دل پزیرو دل کش...... طرز پسندیدہ ...... در فن عروض بسیار مہارتِ دل خواہ دارد ....."

(۱۲) تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی مصنفہ دتاسی جلد ۲ طبع ثانی ص۱۰۹:۔

" جوشش ..... شیخ محمد روشن پٹنوی، پسر جسونت رائے ناگر د برادر محمد عابد دل فنّ بیان کے ایک ممتاز ماہر اور بڑے قابل ہندوستانی شاعر ہیں جن کے دیوان میں ۳۰ ہزار کے قریب شعر ہیں ......" قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ "تین کی جگہ تیس ہزار محض سہو قلم ہے"

حالاتِ زندگی :۔ جوشش کے والد جسونت رائے ناگر عہد علی وردی خاں کے ممتاز فوجی سرداروں میں سے تھے " ناگر گجراتی برہمنوں کی ایک شاخ ہے، جسے سیف و قلم دونوں سے لگاؤ رہا ہے[1]" محمد روشن ۱۱۵۰ھ کے قریب عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم و تربیت حاصل کی موسیقی کا شوق تھا۔ تیراندازی میں ماہر تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ مشرف بہ اسلام ہونا ہے" یہ واقعہ[2] ۱۱۷۰ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیان وقوع میں آیا ہوگا" جوشش نے شیخ علی حزیں سے فیض پایا تھا۔ ان کے نام شیخ کے دو خط دستیاب ہوئے ہیں[3]۔ جوشش ۱۲۱۶ھ تک زندہ تھے۔ محمد قلی خاں، مشتاق، میر منّو حیران عظیم آبادی، میر افضل علی بیتاؔ اور مرزا علی رضا تمنّا عظیم آبادی ان کے شاگردوں میں تھے۔ نظم میں دیوان اور نثر میں رسالۂ قافیہ یادگار ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔ سیر حاصل مطالعہ دیوان مطبوعہ

---

[1] و [2] و [3] دیوان جوشش، ق۔ع۔و، ص۱۹، ص۲۹، ص۳۰ +

سے ہو سکتا ہے۔ ؎

جو دل کے جلوہ گاہ ہوا اُس کے نُور کا — مُشتاق وہ نہیں ہے تجلّیِٔ طور کا

کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی

شمع کے سامنے کیا حال ہے پَروانے کا

ہر ایک خارِ بیاباں رکھے ہے نوکِ زباں — یہ ماجرا ہے ہماری برہنہ پائی کا

وہ زمانہ کیا ہوا جو مرے گریے میں اثر تھا

یہی چشمِ خوں فشاں تھی، یہی دل، یہی جگر تھا

غزلوں کے علاوہ رباعیّات، مخمّسات، مثنویّات، قطعات اور قصائد دیوانِ مطبوعہ میں موجود ہیں۔

میر محمد رضا رضاؔ ۱۱۶۳ھ تا ۱۲۱۶ھ[1]

میر محمد رضا ابن میر جمال الدین حسین جمالؔ(*)۔ تخلّص رضاؔ۔ یہ ضیا دہلوی کے شاگرد تھے۔ رضاؔ کا ذکر مختلف تذکروں میں ہے۔ مثلاً تذکرۂ شورش

---

[1] صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۰ ق۔ع۔و +

(*) جمال بھی شاعر تھے دیکھو تذکرۂ شورش

عظیم آبادی - قاضی عبدالودود صاحب کو ان کا دیوان ملا تھا - جو بہ افساط رسالہ معاصر[1] پٹنہ میں شائع ہوا تھا - بعد ازآں ایک سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ دیوان کو یکجا مربوط کر کے پیش کیا گیا - نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

مجھے آگے گرفتاری ہوئی تھی ۔۔۔ نہ اتنی زندگی بھاری ہوئی تھی
رضاؔ کا اب خدا حافظ ہے یارو ۔۔۔ یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

مجھ کو کچھ دل پہ اختیار نہیں ۔۔۔ تمہیں اس گھر کے اب تو سب کچھ ہو

ایک تو آپ ہی مروں ہوں میں ۔۔۔ درد جی کو کھپائے جاتا ہے
پوچھنا تس پہ دوست داروں کا ۔۔۔ اور بھی جان کھائے جاتا ہے

مُفتی غلام مخدوم ثروتؔ

سنہ ۱۱۴۵ھ تا سنہ ۱۲۱۹ھ

مفتی غلام مخدوم خلف مولوی جمال الدین پھلواروی - شاگرد[2] شاہ آیت اللہ شورشؔ ثم جوہری ثم مذاقی - پیدائش سنہ ۱۱۴۵ھ - وفات سنہ ۱۲۱۹ھ[3] - ابتدا میں مفلوک الحال تھے - آخر میں کسی مقدمہ متروکہ کی بدولت ثروتؔ کو سرکار ایسٹ

۱؎ سنہ ۱۹۴۳ء معاصر، دائرہ ادب، پٹنہ + ۲؎ تاریخ شعرائے بہار، بلخی ص۶۷ + ۳؎ بذریعہ حکیم شعیب صاحب

انڈیا کمپنی سے چالیس ہزار روپے ملے - غزل کا ایک شعر بلخی نے درج کیا ہے۔

شعر
آستیں جو ہوگئی دریا بداماں اشک سے
چشم یہ مجکو نہ تھی اے چشمِ گریاں اشک سے

مخطوطات پھلواری میں ثروت کا مرثیہ بھی ملتا ہے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :-

مرثیہ ثروت

جب خاک پہ شہ بیٹھے اوتر خانۂ زیں سے
سر کاٹ لیا شمر نے آ خنجر کیں سے
اوس سر کو جو رفعت تھی سرِ عرش بریں سے
نیزہ نے رکھا سر پہ اوٹھا اوسکو زمیں سے (۱)

بیٹھا جو اوتر گھوڑے سے وہ شاہ دلاور
تھے زخم لگے اوس تنِ نازک پہ بہتّر
جیونکر کے شفق میں ہو چھپا مہرِ منوّر
تھی چہرہ کی صورت بھی وہی خون جبیں سے (۲)

وہ صیدِ حرم ماندہ و مجروح تھا بیٹھا
تھے دام کے حلقہ کی طرح گرد سب اعدا
یوسف کا غرض دیکھ کے بگڑا ہوا سودا
دس تھو سگ گرگیں اوٹھے ایکبار کمیں سے (۳)

اون سب سگ ناپاک میں اک خوک شمر تھا
نہ شرم پیمبر اوسے نہ حق سے خطر تھا
دل اُس سگِ ناپاک کا سختی میں حجر تھا
اوس سگ کو عداوت تھی مرے شیر غریں سے (۴)

مرثیہ میں کل ۳۲ بند ہیں - آخری بند ملاحظہ ہو :-

میں دَر کا گدا ہوں تیرے اور تو میرا شاہ ہے
تجھ مولیٰ کے ہاتھوں سے غلاموں کی نباہ ہے
ثروت ترا بندہ ہے خدا اس کا گواہ ہے
واثق مجھے امید ہے تجھ حبل متیں سے (۳۲)

" تمت المرثیہ فی ۱۲۱۲ھ یکہزار و دوصد و دوازدہ ہجری از تصنیفات

مفتی غلام مخدوم صاحب علیہ رحمۃ متخلص بہ ثروت "

(مجلد قلمی نسخہ پھلواری شریف۔ ص ۵۳-۵۱)

خواجہ امین الدین امینؔ

خواجہ امین الدین نام۔ امینؔ تخلص۔ عظیم آباد کے رہنے والے۔ میر حسنؔ نے امینؔ کو مرشد آبادی لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ کچھ دنوں تک نواب ناظم مرشد آباد کے یہاں ملازم رہے تھے۔ نواب شیفتہؔ نے اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" ص ۱۲۶ پر میر حسنؔ کی تردید کی ہے۔ لکھا ہے:۔ (امینؔ) "از ارباب عظیم آباد ست" دوسرے تذکرے بھی امینؔ کو عظیم آبادی بتاتے ہیں۔

نواب مظفر جنگ میر محمد رضاؔ کی سرکار سے منسلک تھے۔ نجم الدولہ کی طرف سے میر محمد رضاؔ خاں مظفر جنگ نائب ناظم مقرر ہوا۔ صوبۂ بہار میں میر محمد کاظم خاں اور راجہ شتاب رائے حکومت نیابتی کرتے تھے۔ راجہ دھیرج نرائن برادر راجہ رام نرائن دیوان مقرر ہوا۔ جب دربار کا سلسلہ درہم برہم ہوا۔ اور نائبین عظیم آباد قید کر لئے گئے تو خواجہ امینؔ خانہ نشیں ہو گئے اور نہایت قناعت سے بقیہ زندگی گزار دی۔ ۱۲۴۰ھ تک زندہ تھے [۱] (بلخی)

---

[۱] سنہ وفات کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ خمخانۂ جاوید سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۰ء) تک زندہ تھے۔ (دردائی)

اِن سے اور نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ سے بھی ربط و تعلق تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔" دیوان[1] فارسی کا ایک نسخہ خانقاہ عمادیہ عظیم آباد محلہ منگل تالاب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ ریختہ کا دیوان اب نایاب ہے"۔ تذکروں میں زیادہ حال نہیں ملتا۔ گلزارِ ابراہیم میں ان کی تعریف و توصیف یوں ہے۔" شعر فہمی اور سخن رسی میں نادرِ روزگار ہیں۔ بلندی فکر اور استقامت ذہن ایسی رکھتے ہیں جو ان کے معاصرین میں کم تر پائی جاتی ہے" (ترجمہ)
نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

دُنیا میں جو آکر نہ کرے عشق بتاں کا　　نزدیک ہمارے نہ یہاں کا نہ وہاں کا

خورشید ترا دیکھ کے مُنہ کانپ کے نکلا　　مہ چادرِ مہتاب میں مُنہہ ڈھانپ کے نکلا

گر ارادہ نہیں ہے آنے کا　　فائدہ اس قدر بہانے کا

آئی بہار ہو گئے ہر خار راہ سبز　　لیکن ہوئے نہ آہ یہ بختِ سیاہ سبز

---

[1] تاریخ شعرائے بہار، عزیز بلخی ص۲ +

نوٹ:۔ خواجہ امین الدین کے ہمعصر ایک اور شاعر مولانا محمد امین اللہ، موضع نگرنہسہ ضلع عظیم آباد کے گزرے ہیں۔ وفات ۱۲۳۳ھ۔ فارسی میں 'قصیدۂ عظمیٰ' مشہور ہے +

کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں گالیاں کھاتا ہوں، غصّہ کو پئے جاتا ہوں

فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکرِ معاش غم کو کھاتے ہیں آبینؔ خون جگر پیتے ہیں

میں بوسہ جو مانگا تو جھنجھلا کہ وہ لگا کہنے کیا ہے۔ کہا کچھ نہیں

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت ہو تو کچھ پروا نہیں ہجر کی جب رات ایسی بے قراری میں کٹی
اس زمانے میں آبینؔ مت کر کسی سے دوستی شمع کی گردن نہ دیکھی دوستداری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے بلبل کو باندھئے تو رگِ گُل سے باندھئے

ایکدم ہوگئی گر اوس سے ملاقات تو کیا زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات کیجئے

دنیا میں کہنے کو سبھی کہلاتے ہیں بھلے پر ہے وہی بھلا جو کسی کا بھلا کرے

(تاریخ شعرائے بہار، بلخی ص۵)

خواجہ صاحب کے کلام میں شوخی، بے ساختگی اور لطیف ظرافت کے ساتھ رنگِ تصوّف بھی چمکتا ہے۔ زبان صاف اور رواں ہے۔ آبینؔ کی مثنوی کے

انیس[۱۹] شعر مرزا علی لطف نے گلشنِ ہند میں نقل کئے ہیں۔ [illegible]

شاہ نورالحق طپاںؔ پھلواروی

۱۱۵۶ھ تا ۱۲۳۳ھ

شاہ نورالحق بن شاہ عبدالحق ابدال بن حضرت پیر مجیب اللہ پھلواروی[۱] پیدائش ۱۱۵۶ھ (جمادی الاولی)۔ بیعت اور اجازت خلافت حضرت پیر سے ۱۱۷۳ھ میں حاصل کی۔ اپنے پھوپھا حضرت سجادؔ کی بڑی لڑکی سے بیاہے گئے۔ حضرت سجادؔ کے بعد اُن کی جانشینی بھی قبول کی۔ ۱۲۰۰ھ میں شاہ نورالحق نے اپنے لڑکے حافظ شاہ ظہورالحق کو اپنی زندگی میں خلافت عطا کردی اور خود گوشہ نشین ہوگئے۔ آپ کا انتقال ۴ شعبان ۱۲۳۳ھ کو پٹنہ میں ہوا۔ لاش پھلواری شریف لائی گئی۔ وہیں مدفون ہیں۔

"اوراد و وظائف کے مختلف رسائل کے ماسوا فارسی کے دو کلیات ضخیم آپ کی تصانیف سے ہیں۔ ایک بیاض ضخیم اُردو مراثی کی ہے" (بلخیؔ)۔ مراثی کی ایک بیاض میری نظر سے گذری ہے۔ یہ مجھے خانقاہ سلیمانیہ پھلواری سے حاصل ہوئی تھی۔ اس بیاض میں شاہ ظہورالحق کے مرثیے بھی ہیں۔ حکیم شعیب صاحب مرحوم

---

[۱] حکیم شعیب صاحب مرحوم کے رکارڈوں سے ان تاریخوں کا پتہ چلتا ہے۔ بلخیؔ اور مولوی تمناؔ پھلواروی نے بھی یہی تاریخیں لکھی ہیں۔ (تاریخ شعرائے بہار، ص۲۹ اور معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۴۲ء ص۳۰)

کا یہ قول ہے کہ بیاض میں خود نوشتہ مرثیے ہیں۔ طپاںؔ اور ظہورؔ کی شان تحریر مرحوم بخوبی پہچانتے تھے۔ طپاںؔ کے مرثیوں کی ایک دوسری قلمی بیاض پٹنہ سیٹی کی خانقاہ میں ہے۔ پرافسر ذکی الحق صاحب سلمہ بی۔ اِن کالج نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں دوسری بیاض کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ میں نے جو قلمی بیاض دیکھی ہے اُس کے مرثیوں کے اختتام پر تاریخ تصنیف یوں درج ہوتی ہے: "غمناک شد فی سنہ فلاں یا "المناک شد فی سنہ" فلاں یا "خونبار شد فی سنہ" فلاں۔

جناب محی الدین تمناؔ پھلواروی نے طپاںؔ کی اکیس[۲۱] غزلیں قلمی بیاضوں سے نقل کر کے رسالہ معاصر[۱]، پٹنہ میں شائع کروائی تھیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

جو کام تیرا ہے سو کر، رٹ یعنی نام اللہ کا
کرلیوے گا اللہ جو ہووے گا کام اللہ کا

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا[۲]

عقل کو چھوڑ دیا تو نے تو ہشیاری کی
پڑ گیا نام تپاںؔ کیونکہ دوانہ تیرا

ناشاد نہیں بلبل ناشاد کے ایسا
پھر بھی وہ نہیں اس دل برباد کے ایسا

ایمان کی یہ بات تپاںؔ ہم تو کہیں گے
اُستاد نہیں حضرت سجادؔ کے ایسا

---

[۱] معاصر، جنوری ۱۹۴۲ء۔ ص ۳۵-۳۱ اور معاصر، فروری ۱۹۴۲ء ص ۴۲-۴۰+

[۲] تاریخ شعرائے بہار، بلخی میں صرف یہی شعر درج ہے اور یوں ہے سہ (ص ۲۹)
عقل والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا ❊ بیٹھ پھیرے ہوئے ہنستا ہے دوانہ تیرا

عزم آنے کا جو وہ اے دل بیتاب کریں   فرش ہم راہ میں جا دیدۂ بیخواب کریں
لے لیا ہے تو کریں قدر بھی میرے دل کی   آپ برباد نہ یہ گوہر نایاب کریں

بیچ دیویں گوہر دل کیوں نہ اوس دلبر کی ہاتھ   قدر جوہر ہے لگے گر صاحب جوہر کے ہاتھ
جھک نہ آوی دست بوسی کے لئے پیر فلک   لو نہ انگڑائی خدارا دونوں اوپر کر کے ہاتھ

ہوش بھی کوئی شے ہے رکھے کی   عقل سے کچھ تو کام کوئی لے
دیوے پر جب نہ چشم ساقی گر   کیوں بڑھا ہاتھ جام کوئی لے

مارتے ہیں نظر کے بھالے سے   اور دیکھے ہیں بھولے بھالے سے
چارہ گر اٹک سمجھ سے بھی لے کام   موت ٹلتی نہیں ہے ٹالے سے
مونہہ سے خم ہی لگا دے اے ساقی   کون پیتا رہے گا پیالے سے
اپنی کملی ہی میں مگن ہے تپاں   کام کیا شال سے دوشالے سے

پانی کی جگہ مئے تھی تو مٹی کی جگہ درد   سرمست ازل سے ہے مری آب بھی گل بھی
ہم جان رہے تھے کہ فقط زلف ہے آفت   واللہ غضب ہے ترے رخسار کا تل بھی

اک خواب سے بڑھکر نہیں یہ ہستی موہوم   وہ خواب جو شرمندہ ہے تعبیر کے آگے

جی تو چاہے ہے بہت قاتل! مگر — ہائے کب جی بھر کے تڑپھا جائے ہے
تیرے عاشق، تیرے شیدا کا یہ حال — ہائے کیسے تجھ سے دیکھا جائے ہے
لگ گئی ہے آگ سی سینے کے بیچ — اور دل کمبخت بجھتا جائے ہے
کب مٹے ہے دل سے یادِ روئے یار — سر سے کب زلفوں کا سودا جائے ہے
منزلِ مقصود پاوے ہے وہی — جو ترے رستہ میں کھویا جائے ہے
اُٹھ رہا ہے درد دل جب بار بار — دل سے پوچھو کا ہے بیٹھا جائے ہے
اَب بُلاوا آ رہا ہے یار کا — دو قدم بھی جب نہ جایا جائے ہے

دل کو سمجھا ویں ہیں یہ کہہ کہہ کے ہم — یار بس اَب آئے ہے اب آئے ہے

اللہ رے اُمیدیں کوئی آوے ہے نہ جاوے — ہے در کی طرف آنکھ کہ شاید کوئی آوے

دِل مرا، میری نہیں کہتا، تو پھر میرا نہیں — جب تمہارا ہی یہ گاتا ہے، تمہارا ہو گیا

لگا دی اپنی آنکھوں سے جھڑی خود آخرش ہم نے — کہ رستہ کبتلک اے ابر رحمت دیکھتے رہتے
بڑھایا حضرت واعظ نے آخر ہاتھ ساغر پر — فقط بیٹھے ہوئے حضرت سلامت دیکھتے رہتے

بتکدے میں تم پہ کیا گذری نیاز بتلاؤ تو — بیٹھکر مسجد میں کیوں یادِ خدا کرنے لگے

مرثیہ کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

(۱)

کوفی کی مکر چالی، ہے ہے یہ کیا بلا ہے
روباہی یاشغالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے
قتل حسین عالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے
اس مونہہ پہ خوں کی لالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۲)

کیا کہیئے ہائے دل میں جز آہ کچھ نہ آوے
پانی کا ایک قطرہ آل نبی نہ پاوے
بڑھتا ہی لحظ لحظ دشمن کا فوج جاوے[۱]
اور قتل ہوں موالی، ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۳)

پانی ملے کسی کو ہے ہے کہو کدھر سے
ظالم نے راہ[۲] روکا شمشیر سے سپر سے
مقتل پہ تشنگاں کی زہرا کی چشم تر سے
آنسو کی برشگالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۵)

تھی کربلا کے بن میں قاسم بنے کی شادی
شادی نہ کہیئے اوس کو کیا کہیئے نامرادی
اے دوستاں ستم ہے ظالم کی بدنہادی
دولہ کی تنگ حالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۶)

کس چاؤ سے بنے نے خلعت زری کا پہرا
باندھا چچا نے تیپر ہاتھوں سے اپنے سہرا
تر ہوگیا لوہو سے دو ایک پل میں چہرا
تن ہوگیا گلابی، ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۸)

یہ دن دکھایو مت کسہو کو حق تعالےٰ
دلہن کے پاس روئیں عورات کرکے نالا
دولہ بنے کا ڈوبا لوہو میں سر و بالا
اور یہ بنی ہے بالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

---

[۱] فوج کو مذکر باندھا ہے۔ نسخہ میں یونہی درج ہے + [۲] 'راہ' کو مذکر باندھا ہے +

(۱۱)

اکبر علی کی رن میں پھر جب گئی سواری
بابا کی چشم تر سے خوناب دل تھا جاری
کیا کہئے اے محباں بانو کی بے قراری
اوراوسکی نونہالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۲)

وو دوحۂ جوانی باروئے ارغوانی
انگشتری کو چاہے ٹپاوے نہیں جو پانی
کٹ کر گرا زمین پر جیون سرو بوستانی
کہا تیغ پُرتگالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۳)

وو باغِ مصطفٰے کا شیریں مقال طوطی
دلبند مرتضیٰ کا اور فاطمہ کا پوتا
ثنایاں تھا جس کے اُوپر عالم نثار ہوتا
اوسکی شکستہ حالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۴)

کیا کہئیے تشنگی سے اصغر علی کا روناں
آغوش میں پدر کے پُچکے شہید ہوناں
پھر گرد زندگی کو لوہو سے سر کے دہوناں
اوراُوسکی خُردسالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۱۵)

اصغر کی لاش لے کر رَن سے پھرے جو سَرور
لوہو سے نابدامن جیب اور کنار سب تر
گودی میں شہربانو کی ہائے ہائے لیکر
لاش اوس بچے کی ڈالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۲۶)

...... کا پھرا وترناں روغہ میں مُصطفٰے کے
شپیر کے لوہو میں بازو کتیں ڈوبا کے
پر مارناں زمیں پہ روناں فغاں اوٹھا کے
اوراوسکی سرخ بالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے

(۲۷)

آنسو سے خشک کب ہیں آنکھیں کہو کسو کی
یہ نالۂ طپاں ہے یہ نیت آرزو کی
رونے کو مومنوں کے یہ طرز گفتگو کی
گو سب سے ہے نرالی ہے ہے یہ کیا بلا ہے
غمناکؔ شد فی سنہ ۱۲ سنہ ہجری

(غیر مجلد قلمی نسخہ پھلواری شریف خانقاہ سلیمانیہ)

ایک اور مرثیہ حسب ذیل ہے :-

(۱)

کسی سے غم کی خبر کہئے ہائے کیا کہئے
زباں ہے شعلہ اثر کہئے ہائے کیا کہئے
نہ کہئے کیونکی اگر کہئے ہائے کیا کہئے
کٹا حسینؑ کا سر کہئے ہائے کیا کہئے

(۲)

زماں زماں ہی تو بڑھ تا ہے اپنے دل کا محن
بدل ہو نالہ سے گر لائیے زباں پہ سخن
بھرا کے مثل شفق خون دیدہ سے دامن
بگوش شام وسحر کہئے ہائے کیا کہئے

(۴)

وو ما جرائے الم اب تلک ہے داغ جگر
جہاں تنور میں تھا حضرت شبیر کا سر
کھڑی جو روتی تھیں جنت سے بیبیاں آکر
اب اوسکو بار دگر کہیئے ہائے کیا کہئے

(۲۲)

وداعِ ہوش کیا سر نے تن نے تاب وتواں
گری وو خاک پہ بیہوش ہو کے نالہ کناں
فغاں سے حضرت زہرا کے یہ تو کیا ہے کہاں
پھٹا جہاں[۱] کا جگر کہئے ہائے کیا کہئے

(۲۷)

یہ سر ہے حضرت زہرا کے نور دیدہ کا
کہ جس پہ کرتی ہیں جنت سے آ کے حور بکا
کہ اے پلید اسے کس گناہ پر کاٹا
چلا ہے لیکے کدھر کہئے ہائے کیا کہئے

(۲۸)

تو دلبران پیمبر کیتن یتیم کیئے
تو دختران علی پر ستم عظیم کیئے
خراب خانۂ دیں اپناں اے لئیم کیئے
جگہ تری ہے سقر کہئے ہائے کیا کہئے

---

[۱] 'زمین' کاٹ کے 'جہاں' بنایا ہے +

(۳۰)

غم حسین میں اوٹھتا ہے آسماں سے خروش
ملِیاں زمیں کو بھی چشموں سے اشک کا ہے جوش
کہو تو جس کے بیاں میں ہو جبرئیل خموش
کہاں ہے حد بشر کہئے ہائے کیا کہئے

غمناک شد فی سنہ ۱۲۰۷ھ ہجری (قلمی نسخہ غیر مجلد پھلواری)

غلام علی راسخ

۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء متوفی ۱۲۳۸ھ

شیخ غلام علی نام ۔ راسخ تخلص ۔ شیخ محمد فیض کے بیٹے ۔ متاخرین تذکرہ نویس موضع سائیں[۱] کو راسخ کا مولد و وطن قرار دیتے ہیں ۔ سائیں پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ہے ۔ غالباً راسخ بچپن سے ہی عظیم آباد آکر رہ گئے تھے ۔ قریباً ۱۱۸۲ھ سے ۱۲۲۲ھ تک[۲] یہ عظیم آباد میں بہت کم رہے ۔ غالباً اسی وجہ سے راسخ جیسے جلیل القدر شاعر کا تذکرہ 'گلزار ابراہیم' میں نہیں ۔ راسخ نے لکھنو، دلی، مونگیر، بھاگلپور، مرشد آباد، کلکتہ وغیرہ کا سفر کیا تھا ۔ تذکرہ گارسان دتاسی' میں راسخ مذکور ہیں ۔

---

[۱] 'تذکرہ گل رعنا' عبدالحی ۔ "سوانح راسخ" انگریزی از خان بہادر سید ضمیر الدین مرحوم ۔ مقالہ بہار و اڑلیسہ ریسرچ سوسائٹی ۱۹۱۸ء مارچ + [۲] تاریخ شعرائے بہار' قلمی صـ ۶۹

سال ولادت ۱۱۶۲ھ۔ حمید عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ :

"راسخ مرحوم[1] کے سالِ ولادت میں کوئی اختلاف نہیں۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ آپ کی ولادت کا سال ۱۱۶۲ھ ہے۔ لیکن سالِ وفات میں اختلاف ہے۔"

پرافسر دردائی[2] تحریر کرتے ہیں :

"لیکن گلشنِ بے خار کے علاوہ جتنے اور معتبر تذکرے ہیں سب میں راسخ کا سال وفات ۱۲۳۸ھ بتایا گیا ہے۔"

میرے خیال میں راسخ کے شاگرد یاس آروی کا قول زیادہ معتبر ہے۔ وہ راسخ سے قریب ترین تھے۔ لکھتے ہیں :

"الحال[3] تاریخ رحلت شیخ غلام علی راسخ، بہ تلاش و تجسس کماینبغی بہ دریافت رسید کہ تاریخ بستم جمادی الاولی ۱۲۳۸ھ روز دوشنبہ بودہ است۔"

ظاہر ہے کہ یاس کو سالِ وفات کے بارے میں شبہ نہیں تھا، صرف تاریخ کے بارے میں انہیں تلاش و تجسس کرنا پڑا۔ راسخ کی قبر[4] ابتر حالت میں محلہ لودیکٹرہ میں موجود ہے۔

۱۔ راسخ از حمید عظیم آبادی ص۱۸ + ۲۔ بہار اور اردو شاعری : پرافسر دردائی، ص۵۳۔ نواب شیفتہ گلشنِ بے خار میں سال وفات ۱۲۴۰ھ بتاتے ہیں۔ اور گارساں دتاسی بھی + ۳۔ راسخ عظیم آبادی حمید عظیم آبادی ص۱۹ + ۴۔ بلخی، حمید، ضمیرالدین، دردائی +

راسخ عظیم آبادی کی شاگردی کا مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں :-

"راسخ بہ حیثیت مجموعی بہار کے قدیم شعرائے اُردو میں سب سے بڑے ہیں۔ یہ ابتدا میں فدوی شاگرد عشق دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے اور اس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے۔ قلمی دیوان میں جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے (کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) یہ شعر موجود ہے ؎

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار
راسخ ہوں ایک میں بھی ولے کس شمار میں

...... عشقی نے لکھا ہے کہ راسخ کو میر سے بڑی عقیدت تھی۔ اور ان کی کشش انہیں لکھنؤ لے گئی، جہاں وہ میر کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے[۱]"

دیوان راسخ میں بکثرت مقطعے ایسے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ راسخ کو میر کی شاگردی پر فخر تھا۔ فدوی کی شاگردی بھولی بسری بات تھی۔ ؎

راسخ کو ہے میر سے تلمذ   یہ فیض ہے اون کی تربیت کا

زندہ ہے نام میر راسخ سے   کون ہے شاعروں میں ایسا آج

۱۔ صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۲۱۔ و تذکرۂ سخن شعراء +

کتب خانہ مشرقی، خدا بخش خاں، پٹنہ میں جو راسخ کی خود نوشتہ بیاض ہے۔ اس میں متعدد ایسے اشعار بھی ہیں جو مطبوعہ دیوان میں نہیں پائے جاتے۔ ان اشعار پر خود راسخ نے "نباید نوشت" لکھ دیا ہے اور شائد اسی وجہ سے یہ اشعار مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں کئے گئے۔ انہیں اشعار میں وہ شعر بھی ہے جس میں فدوی کی شاگردی کا اعتراف پایا جاتا ہے۔ تین (؟) مثنویاں غیر مطبوعہ بھی ہیں۔

غالباً صرف فارسی[1] میں راسخ شاہ نور الحق تپاں پھلواروی سے اصلاح لیتے تھے۔ "الہاماتِ شاد" میں عبد المالک صاحب آروی مرحوم نے راسخ کو مستقلاً تپاں کا شاگرد بنایا ہے۔

۱۳۱۱ھ میں کلیات راسخ خیر المطابع عظیم آباد سے شائع ہو چکی ہے۔ لیکن مطبوعہ نسخہ جو زرد کاغذ پر چھپا تھا۔ اب بہت کمیاب ہے۔ کتب خانہ مشرقی پٹنہ میں تین قلمی نسخے میرے دیکھنے میں آئے۔ ایک تو وہ مشہور قلمی نسخہ ہے جسے راسخ نے خود لکھا، دوسرا ظفر نواب صاحب، گیا کے کتب خانہ سے آیا ہوا ہے اور ایک تیسرا نسخہ ہے۔ ایک نسخہ میں صرف غزلیں ہیں۔ چوتھا نسخہ راج برج راج صاحب پٹنہ سیٹی سے دستیاب ہوا ہے۔

مطبوعہ کلیات راسخ کے شروع میں دس قصیدے اور چند قطعات و

---

[1] راسخ، حمید عظیم آبادی بحوالہ "خاتم سلیمانی" مصنفہ شاہ غلام حسنین صاحب پھلواروی حصہ چہارم ص ۱۵۸، ملفوظات (۲۲۸) ...... "ہمارے ہاں بھی راسخ مرحوم کی تحریریں موجود ہیں، وہ اپنا فارسی کلام تو پھلواری کے ایک مشہور و معروف بزرگ حضرت تپاں قدس سرہٗ کو دکھاتے تھے۔"

رباعیاں ہیں۔ جن میں چند قصائد نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں ہیں۔ ان کے بعد غزلیں ہیں۔ آخر میں پندرہ مختلف مثنویاں ہیں[1]۔ قلمی نسخہ میں ان کے علاوہ اور تین مثنویاں بھی ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ مثنویاں ہزلیات پر مشتمل ہیں۔

راسخ کو میر کی ہمسری سے تسلی نہیں ہوئی۔ اُن کی نظر اور بلند ہے ؎

نظیری اور شفائی کا ہے بدل راسخ ٭ یہ ادس کا فخر نہیں گر نظیر میر ہوا

"ان کے کلام میں سوز و گداز کے ساتھ تصوف کا رنگ بہت نمایاں ہے" (بلخی)۔ بقول حسرت موہانی[2] مثنویوں کا انداز میر کی مثنویوں سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں میں تمیز بھی مشکل ہے۔ مثنویوں کے نام یہ ہیں : حسن و عشق، ناز و نیاز، نور الانظار، جذب عشق، مکتوب شوق، کشش عشق، گنجینۂ حسن، سبیل نجات، نیرنگ محبت، اعجاز عشق، مرأۃ الجمال، شرح حال، شہر آشوب، مثنوی مدحیہ۔ اکثر مثنویوں میں عشق کی داستانیں نظم کی گئی ہیں۔ صرف نور الانظار ایک اخلاقی مثنوی ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ "اور اصناف کے مقابلہ میں یہ غزل اور مثنوی میں زیادہ کامیاب ہوئے"۔ جناب قاضی صاحب کئی سال سے راسخ پر مزید تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ اور ادھر ڈو سال سے میرے ایک شاگرد پٹنہ یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اس مضمون کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب راسخ کے دیوان یا کلیات کو نئے سرے سے ایڈٹ کر کر شائع کرنا چاہتے ہیں۔

---

[1] بلخی نے پندرہ[15] کی تعداد لکھی ہے۔ اور حبیب عظیم آبادی نے چودہ[14] کی۔

[2] رسالہ اُردوئے معلّٰی، مئی سنہ ۱۹۰۷ء۔

راسخ کے چند تلامذہ[1] کے نام حسب ذیل ہیں :۔

انور علی یاس آروی، حکیم احمد حسین، خواجہ فیض اللہ معروف بہ شاہ غلام مخدوم عظیم آبادی، تخلص فرحت، خواجہ محمد محسن، مرزا مراد بخش مراد، نواب مہدی علی خاں

راسخ[2] کو شاعری، موسیقی اور تصوّف سے بڑی دلچسپی تھی۔ حضرت شاہ ابوالحسن فرد پھلواروی کے مرید تھے۔ راسخ نے اپنے پیر و مرشد کو جو خط لکھا ہے وہ اب تک بڑی خانقاہ پھلواری میں موجود ہے۔ حضرت فرد، راسخ سے عمر میں چھوٹے تھے۔ اسی اعتبار سے آپ کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔ راسخ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے　　پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

خاک ہوں پر طوطیا ہوں چشم مہر و ماہ کا　　آنکھ والا تب سمجھے مجھ غبارِ راہ کا

طالبانِ یار کی منزل تو غیر از دل نہیں　　کعبہ کہتے ہیں جسے سو راہ ہے منزل نہیں

مت پوچھئے مجھ سے حال میرا　　حیرت زدہ کیا بیان کرے گا

سارے خطِ شوق میں، میں نے یہی رو رو لکھا　　ملئے صاحب کیا کیا تم نے جدا تم یوں ہوئے

---

[1] راسخ : حمید عظیم آبادی صفحہ ۲۵-۲۶ + [2] راسخ از حمید عظیم آبادی صفحہ ۳۰ اور معین الدین احمد قیس مرحوم کا مضمون راسخ عظیم آبادی : بہار نمبر، ندیم گیا، ۱۹۳۳ء ملاحظہ ہوں +

بے مدّعا ہوں یہ بھی ہے اک مدّعائے دل اِس قیدِ مدّعا سے نہ کوئی رہا ہوا

ضبطِ گریہ تو ہی پر دل پہ جو ایک چوٹ سی ہے قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد، مجھے رشک ہے تو انہوں پہ ہے
جنہیں تیرے جلوہ کے سامنے مری طرح بے خبری رہی

کس قدر بوقلموں جلوہ ہے محبوب اپنا کوئی بھی اوس کی تجلّی نہیں تکرار کے ساتھ

برق سے پوچھا کہ شادی کتنی اس عالم کی ہے کچھ کہا اُس نے نہ لیکن اک تبسّم سا کیا

آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے جن سے ٹک آشنا ہوئے ہو تُم

خموشی کے پردہ میں ہے شور میرا مجھے چُپ نہ جا تو سراپا فغاں ہوں

عُذر خواہی کا اب دماغ نہیں خوش رہو گر خفا ہوئے ہو تُم

جُز داغ ہے کیا دلِ حزیں میں لالہ ہی اُگے ہے اس زمیں میں

دل کیوں نہ عزیز مجھکو ہووے ہے نام تمہارا اِس نگیں میں

اٹھا دیں کس روش اِس باغِ دل کش سے دل اپنا ہم
کہ ہر کانٹے سے یاں اُلجھا ہوا اپنا تو داماں ہے

مجھے تو رفتگی سی تھی بیں اس کو کیا جانوں تمہیں کہو کہ لیا تم نے کس اَدا سے دل

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے گو زمانہ کو انقلاب رہا

مرنا اُس بن کہ جیتے رہنا راسخ! کہو کیا قرار پایا

صُبح سے بیتابی ہے دل کو آہ نہیں کچھ بھاتا ہے
دیکھئے کیا ہو شام تلک جی آج بہت گھبراتا ہے

اب مثنویوں میں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

پہونچی ہے کارد استخواں تک بے مہریِ آسماں کہاں تک
جینا دشوار ہو گیا ہے میرا تو چھری تلے گلا ہے
کاہش ہے غموں کی یہ مجھے جہاں ہوں مانندِ ہلال ناتواں ہوں

کچھ حال نہیں ہے ہائے تن میں — ہوں تار کی طرح پیرہن میں
غم پر اک غم دیا فلک نے — تاراج مجھے کیا فلک نے
یغما سے اس کی کیا ہے باقی — یک تار نفس رہا ہے باقی
سو وہ بھی آمادۂ گسستن — یہ چرخ ہے میرے جی کا دشمن
آرام کا عرصہ بس کہ ہے تنگ — دل تنگی سے ہے عجب مرا رنگ
اس دائرۂ فلک میں مجبور — ہوں نقطے کی طرح آہ محصور
کیا کہئے خمیدہ آسماں کو — گر ہاتھ چلے تو اس کماں کو
یاں تک کھینچوں کہ ٹوٹ جائے — کب تک صدمے کوئی اٹھائے

(مثنوی حسن و عشق سے)

ایک اور نمونہ :-

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق — شمع ایوانِ کبریا ہے عشق
آب گوہر ہے اور آتشِ سنگ — ہر جگہ اس کا اِک نیا ہے رنگ
خون ہو برسا ابر مژگاں سے — ٹپکا آنسو ہو چشم گریاں سے
تپ غم ہو کے استخواں میں رہا — ضعف ہو جان ناتواں میں رہا
گاہ رسوا کہیں رہا اِک عمر — کہیں پردہ نشیں رہا اک عمر
گاہ محفل نشینِ ناز ہوا — کہیں سر نا قدم نیاز ہوا
کوچۂ نئے سے نالہ ہو نکلا — خاک گلشن سے لالہ ہو نکلا
روشن اس سے ہے جاں کا کاشانہ — ہے پتنگا اسی پہ پروانہ

بزمِ گیتی اسی سے ہے پُر نور
ذرّہ تا مہر ہے اسی کا ظہور

بلبلِ آشفتہ ہے سدا اس کی
ہے گلِ تازہ کو ہوا اس کی

سینے میں ہو کے دل دھڑک اٹھا
کہیں شعلہ ہوا بھڑک اُٹھا

(مثنوی جذبِ عشق سے)

شاہ امان علی ترقی ۱۱۸۰ھ تا ۱۲۵۵ھ

نام امان علی۔ تخلّص ترقی۔ شاگرد شاہ آیت اللہ مذاقی۔
وطن پھلواری۔ مرثیہ کا نمونہ حسبِ ذیل ہے:۔

شب عاشور جو کی شہ نے عبادت میں بسر
غمِ فرقت سے ہوئی چاک گریبان سحر

کہا سجاد کو تئیں سرورِ دیں نے رو کر (۱)
آج ہووے گا جدا تن سے ہمارا یہ سر

نقدِ جاں را بر رہِ دوست فدا خواہم کرد
سرِ خود گوئے بہ میدانِ رضا خواہم کرد

ہم نے شب خواب میں دیکھا ہے کہ مادرِ زہرا
ہوئیں اس دشتِ بلا خیز میں جلوہ فرما

اپنے گیسوئے سمن سائے کو جاروب بنا (۲)
خار و خاشاک کو اس دشت کی کرتی ہیں صفا

صاف میدان بلا ساختہ گیسوئے بتول
نور پیدا شدہ ہر گوشۂ از روئے بتول

داستانِ غمِ شبیر نہایت ہے دراز (۲۱)
جس کے یک حرف کو سننے سے جگر ہووے گداز

ہو نہیں سکتا قلم یک سر مو شرح طراز کر ترقیؔ شہِ کونین سے تو عرض نیاز

اے شہ از لطف وہی دولت دیدار مرا

کہ بود در دو جہاں با تو سرو کار مرا

تمت المرثیہ من ترقیؔ رحمۃ اللہ تعالیٰ فی ۱۲۲۷ھ یک ہزار و دو صد بست و ہفت ہجری۔ (مجلد قلمی نسخہ پھلواری ص ۳۶-۳۱)

شاہ ظہور الحق ظہورؔ پھلواروی ۱۱۸۵ھ تا ۱۲۳۴ھ

شاہ ظہور الحق، شاہ نور الحق طپاںؔ کے بیٹے تھے۔ تخلص ظہورؔ۔ پیدائش[1] ۱۱۸۵ھ، وفات ۱۲۳۴ھ۔ وطن پھلواری شریف، ضلع پٹنہ۔ شاہ نور الحق طپاںؔ نے اپنی زندگی میں ہی شاہ ظہور الحق کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا تھا۔ اس طرح شاہ ظہورؔ خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشیں ہوئے (۱۲۰۰ھ)۔

مولانا محی الدین تمناؔ پھلواروی رسالہ معاصر[2] میں لکھتے ہیں :-

"۱۲۳۰ھ میں بعض اقارب کالعقارب کی طویل اور مسلسل ستم کیشیوں سے تنگ آکر حضرت مولانا ظہور الحق محدثؒ کو اچانک شب کے وقت گھر چھوڑ کر پٹنہ سیٹی چلا آنا پڑا۔ اور ہجرت کے وقت کچھ ضروری

---

[1] پیدائش و وفات کی تاریخیں حکیم شعیب صاحب مرحوم سے معلوم ہوئیں۔ خاندانی کاغذات میں درج نہیں۔ [2] معاصر، پٹنہ، جنوری ۱۹۴۲ء

تبرکات اور کتب ضروریہ کے سوا کچھ سامان ساتھ نہ لے جا سکے۔ جب پٹنہ میں قیام کا انتظام قابل اطمینان ہوگیا تو تیسرے دن کچھ لوگوں کو پھلواری روانہ کیا تاکہ باقی کتابیں اور سامان وہاں سے لے آئیں۔ مگر آنے والوں نے مکان کو بالکل جلا ہوا ایک تودۂ خاک پایا۔ اور کوئی چیز لانے کے قابل نظر نہ آئی۔ وہ مولانا کے پاس ناکام واپس آئے اور حالت بیان کی۔ مولانا نے فرمایا ع ' خوب شد، اسباب خودبینی شکست' اور کہا 'الحمد اللہ علے کل حال'۔

" حضرت پلپاآں اور حضرت سجّاد کے اور خود حضرت مولانا ظہور الحق رح۔(کے)۔ دواوین فارسی و ذخیرۂ کلام اُردو اور اکثر تصنیفات، تالیفات اور نیز بعض بزرگان پیشین کی بعض اہم تصنیفیں اسی سلسلے میں ضائع ہوگئیں۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض گھروں پر اس وقت تک بعض چیزیں ان میں کی موجود ہیں۔ مگر وہ لوگ دکھاتے تک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کے کلام کے بیشتر اجزاء اِدھر اُدھر سے کسی طرح مجتمع کئے جا سکتے ہیں۔ وہ بھی بمشکل تمام۔ بعض حصّہ کلام تو محض بوسیدہ مسودات پر ہے جس سے بمشکل نقل کیا۔ اور پھر مسوّدات اس قابل بھی نہ رہے کہ محفوظ رکھے جا سکیں۔ کیونکہ اوراق کے جس حصّہ پر بھی انگلی پڑی وہ وہیں سے

سفوف ہوگیا"

مجلّد مخطوطات کے علاوہ مجھے مخطوطات کا ایک دوسرا پلندہ خانقاہ سلیمانیہ[۱] پھلواری شریف سے ملا تھا۔ ان مخطوطات کو جناب پرافسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی اور پرافسر سیّد حسن عسکری صاحب صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج نے بھی ملاحظہ فرمایا ہے۔ میں ان پر ایک مقالہ بھی لکھ چکا ہوں جو رسالہ ساقی، کراچی (سالنامہ ۱۹۵۲ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

دوسرے پلندہ میں شاہ نورالحق طپاںؔ اور شاہ ظہورالحق ظہورؔ کے بہت سے مرثیے مکتوب ہیں۔ ایک مرثیہ کے آخر میں سُرخ روشنائی سے حسبِ ذیل عبارت لکھی ہوئی ہے:-

"ہرچند کہ اینجا جوہر و آن ہم چون جواہر مرآت ست۔ جوہرِ خط راکہ می پرسد۔ لکن چون جوہر در جوہریت مجبور و عرض در عرضیت معذور است ناچار بدست مؤلف ترقیم یافت۔ وانا الفقیر المدعو بظہورالحق المطلق ......" (آگے کاغذ کرم خوردہ ہے)

مذکورہ بیاض میں شاہ نورالحق طپاںؔ اور شاہ ظہورالحق ظہورؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مراثی ہیں جن کے وہ خود مصنّف ہیں۔ اب تک مجھے ظہورؔ کی کسی غزل یا کسی دوسری صنف شاعری کا نمونہ سوائے مراثی کے نہیں ملا۔ مرثیہ کا

---

[۱] میں اس سلسلہ میں اپنے عزیز شاگرد علی اکبر قاصدؔ کے عمِ محترم جناب شاہ حسینی صاحب پھلواروی، بن مولانا شاہ سلیمان صاحب مرحوم پھلواروی کا بے حد ممنون کرم ہوں۔ (اختر اورینوی)

نمونہ حسب ذیل ہے :۔

(۱)

کہیں سکینہ ہائے رے بابل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو
دیس برانا ہو اور جنگل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو
تج دیونگری اپنو رکھوال گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو
بابل[۱] مورا جوگے راول گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۶)

اپنی بپتا میں کا سے کہوں اب جیرا نکسے نہ موہے چینا ں
آٹھ پہر موہے کل نہ پڑت ہے نیند نہ آوے دن نہ رتیاں
آنسوَن کے تو جھڑی لگایو رکتُ ہے روت مورے نیناں
دیکھو نہ بابل انوکھا یہ بادل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۷)

نگر براناں لوگ بگانا ٹھاڑے ہے رُوؤں ہوں اکیلی بَن میں
سُوُن دیکھاوے جی ڈرپاوے لوتھ پہ لوتھ نہاروں رَن میں
لوہو آگ لگایو بن میں سلگت آ مورے تن مَن میں
بابل نگرا کے ہمرا سوپل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۳)

کا کے میں ہاتھ پٹھاروں سندیسا کا کروں گن سن مورے دیا

۱- (نثر) انگریزی بابل بیٹا بابل۔

کہت رہوں میں لکھیاں نہ پتیاں عابد مورے بیرن بھیّا
بابل روسے کت کنا ہاں ایسا نون کاہے بدیسو جیا
موسوں کہت نہ سدت گیوسل بل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۸)

موہے کچھو نہیں بھاوت بابل کہک کہک مورے بیتی رتیاں
آپن آوت ناہیں بابل نا لکھ بھیجیاں تو ن موہے پتیاں
موہنی مورت توری بابل لکھت رہوں ہم اپنی چھتیاں
نینن سو مورے تون جو رہت ٹل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۱۹)

دہوبیا کا پر دہوے بابل داگ نہ دہوے کوّو میرو
آگ لوہے کی بجھا وے لُہروا آگ نہ کھوت کوّو میرو
اپنوں کلیجا آپ ڈست ہوں ناگ نہ ہووے کوّو میرو
تم بن بابل ہم بھیو بیکل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۰)

کاپر میرو مئل بھیو بابل بھیلو بال ہمارو کٹّا
دہول پسنوان لگ لگ سیسن پھوٹے جیوں جوگی تون جٹّا
سیندر ننیل سب چھورا بابل نورے کارن جیو بھیو کھٹّا
رووت ڈہر ڈہر جات مورا کاجل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۴)

ہم جو جانت تم ہو جوّیا سیبس تھا روپا ین دھر ینوں
جے تم کام کہت سے کرنیوں پنیاں سیین بھر ینو ں
ہم سوں کہہ کے جو جاتیو بابل جترا کرکے بدا انجھو کر ینوں
جادن گیلو ہودن منگل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

(۲۶)

بس رے ظہور اب اگان بس کے بسکی غم کی بتیا بس کے
نکسے نہ پیر کھو بیٹن کا اِہ پانکی ین کدہوں دھنس کے
کالی ناگن درد کی نکست گیو پھر لوگاں کو ڈس کے
سرور گیلو پڑ گئی کہل بہل گیلو سو گیلو گیلو ہے گیلو

غمناک شد ۱۲۱۸ھ

(غیر مجلد نسخۂ مراثی خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف)

ظہور الحق پھلواروی کا ایک اور مرثیہ ملاحظہ ہو۔ مرثیہ بتیس بندمیں مکمل ہوا ہے۔

(۱)

بلبل چمن میں ہے غم قاسم سے نوحہ گر
گل نے کیا ہے جیب و گریباں لہو سے تر
غنچہ جھکا کے سر کو کھے ہو کے گریہ ور
کٹتا ہے آج قاسم نوکد خدا کا سر

(۲)

باغ نبی پہ آج خزاں کی ہوا بہی
شمشاد مجتبیٰ کو ملا تخت نوشہی
لیکن کہاں کسی کو حقیقت سے آگہی
ایسا ہے تخت تختۂ تابوت سے بتر

(۳۰)

وہ عندلیب باغِ رسالت امام دیں
یعنی کہ قاسم ابن حسن سرورِ زمیں
جس کی لگن لگی گلِ شبیر سے کہیں
لکن جدا چمن سے رہا زار و نوحہ گر

(۳۱)

خلعت تمام خوں سے بھرا ہائے ہائے
سہرا لوہو سے سرخ ہوا ہائے ہائے ہائے
بدلے حنا کے خوں ہی لگا ہائے ہائے ہائے
زخموں سے رشکِ باغ ہوا جسم سر بسر

(۳۲)

دیدم بوقت صبح کہ گلزار مرگریست
گل جامہ چاک کردہ بیازار مرگریست
در بوستاں ظہور دل افگار مرگریست
چوں عندلیب نالہ سرا بود گریہ ور

طپاںؔ کے چودہ (۱۴) مرثیے اور ظہورؔ کے اکتیس (۳۱) مرثیے قلمی نسخہ پھلواری میں موجود ہیں۔ پرافسر ثواب کریم صاحب ان پر کام کر رہے ہیں۔

شاہ ابوالحسن فردؔ ۱۱۹۱ھ تا ۱۲۶۵ھ[1]

نام ابوالحسن۔ تخلص فردؔ۔ معروف بہ فرد الاولیاء۔ خلف و جانشیں شاہ محمد نعمت اللہ ولیؔ۔ سجادہ نشیں پھلواری۔ بڑے عالم و فاضل بزرگ گذرے ہیں۔" ابتدا میں اپنی غزلیں اپنے چچازاد بھائی مولوی شاہ محمد نور الحق طپاںؔ

[1] گر مجید عالم ۱۲۶۶ھ ہجری میں فردؔ کو "مدظلہ" لکھتے ہیں۔ مجلّہ قلمی نسخہ پھلواری شریف۔ تجلّی نے مندرجہ بالا سن دیئے ہیں۔

کو دکھانے تھے "۔ (بلّی ص...) فارسی کے دو دیوان مطبوعہ ہیں۔ ۲۴ محرم ۱۲۶۵ھ کو انتقال کیا۔ نمونۂ کلام اُردو حسب ذیل ہے :۔

نگاہِ مست تیری کس قدر خونریز عالم ہے   عبث آنکھوں کو تیری نرگسِ بیمار کہتے ہیں

عشق نے رُسوا کیا یاں تک مجھے   نام سے میرے حیا کو ننگ ہے

مجھے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں پھلواری شریف کی بڑی خانقاہ کے کتب خانہ سے فردِ کے تیس، پینتیس اُردو مرثیے ملے ہیں[1]۔ ایک مسدس کی ہیئت کا مرثیہ ملاحظہ ہو :۔

(۱) اِس طرح قافلے پھرتے ہوئے کم جاتے ہیں
جس طرح آج کے دن اہل حرم جاتے ہیں
کفِ افسوس سبھی ملتے بہم جاتے ہیں
تر بہ تر اشک سے سر تا بہ قدم جاتے ہیں
کاروانند و ندارند دراد و جرسے
نہ رفیقے نہ انیسے نہ کسے ہمسفرے

(۳) راحتِ عیش تھا بے قدر برابر با خاک
گرد کیں سے تھا دلِ سینۂ بے کینہ پاک

---

[1] بذریعہ یوسف خورشیدی سلمہٗ۔ ریسرچ اسکالر۔ شعبۂ اردو، جامعہ پٹنہ۔

آستیں اشک سے تر، جیب و گریباں سب چاک
منھ پہ تھا گردِ الم آنکھیں تھیں خوں سے نمناک

بہ زمینیکہ فتادے کفِ پائے ایشاں
لالہ میرست زخوں نابۂ چشمِ ایشاں

(۴) ساز و سامان سفر بے سر و سامانی تھی
دستِ تقدیر میں سونپے ہوئے تھے کام سبھی
سب کی آنکھوں سے تھا خوننابہ کا دریا جاری
تھی اُٹھی سب کے دل و جاں سے تمنائے خوشی

رہروانند شکستہ دل و خستہ جگرے
جز غم و درد ندارند انیسے دگرے

(۲۱) ضبط نالہ کریں تو سینہ پھٹا جاتا ہے
نہ کریں گریہ تو دل غم سے جلا جاتا ہے
ناتوانی سے بدن اپنا گرا جاتا ہے
صبر کا تاب و تواں دل سے اٹھا جاتا ہے

رہ دراز است مرا طاقتِ رفتار نماند
تا بعمرم بجز از رنج سروکار نماند

(۲۳) صبر دل چاہیئے تا ہو رقمِ دردِ و الم
آگیا رعشہ و اندیشہ میں اب دستِ قلم

اب زباں پر ہے ہراک فرد بشر کے ہردم
جب مددگار مرے ہیں یہ امامِ عالم
در کمینم فلک از گشت نباشد باکم
کہ فلک را نہ رسد دست بسوئے خاکم

قادر علی فگار عظیم آبادی

دیوان: رام پور (۲۰۰ اشعار شاعر کا دیوان ہے)

قادر علی عظیم آبادی کی مثنوی 'عشق نامہ' کا ایک نسخہ[۱] مجھے ملا ہے۔ یہ مثنوی مولانا جامی کے قصۂ یوسف و زلیخا کا آزاد چربہ ہے۔ قادر علی کہتے ہیں:۔

ولیکن قصۂ یوسف زلیخا ہراک قصہ سی میری دل کو بھایا
کہ ہندی کیجی یہ ان کی کہانی یہاں کچھ چھوڑ نئی اپنی نشانی

ہزاراں آفریں بر روحِ جامی یہ قصہ کو کیا جو اس نی نامی

"عشق نامہ" آب حیات سائز کی ایک قلمی[۱] کتاب کا جز ہے جس میں تین مثنویاں درج ہیں۔ پہلی مثنوی 'عشق نامہ' ہے۔ دوسری مثنوی 'سحر البیان' از میر حسن دہلوی اور تیسری 'کنور کام روپ و کلا کام'۔ آخر الذکر ناقص الاخر ہے نسخہ سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے۔

---

[۱] اس قلمی مجموعہ کی ابتدا ایک فارسی نثری قصہ سے ہوتی ہے۔ جس کے تین اوراق موجود ہیں۔ آغاز داستان مفقود ہے۔ یہ مجموعہ مجھے ممتاز احمد ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ پٹنہ کے ذریعہ ملا۔

یہ مثنوی ایک سے زیادہ مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مغل ... کے پاس ایک مطبوعہ نسخہ اور زمانہ حال کا چھپا ہوا ایک نسخہ ... موجود ہے۔

مثنوی 'عشق نامہ' کا آغاز یوں ہوتا ہے : ؎

الٰہی عشق سی اپنی تو کر شاد ۔۔۔ مرا دل کر تو اپنا عشق آباد

.. ..

خطِ باطل مری دل سی مٹا دی ۔۔۔ تو اپنی حُسن کا جلوہ دکھا دی

منور شمع کر داغ جگر کے ۔۔۔ کہ بستی ہوی روشن اس نگر کی

پڑی آ دل میں میری نور ایسا ۔۔۔ کہ خاکستر یہ دل ہو طور ایسا

ہوس مِٹ جای دل سی ماسوا کی ۔۔۔ رہی باقی ہوا تیری لقا کی

مثنوی 'عشق نامہ' ۱۹۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اختتام پر مندرجہ ذیل اشعار ملتے ہیں:۔

ہزار و دو صد و دہ اور نہی دو ۔۔۔ کیا انجام جب اس داستاں کو

رگنی ابیات جو ہیں اس کی اکبار ۔۔۔ ہوئی تب سہ ہزار و بیست اشعار

لکھا تھا عشق سی جو اسکو خاما ۔۔۔ رکھا تب نام اس کا عشق ناما

.. ..

نگار اب خامشی ہی تجھکو بہتر ۔۔۔ بھلا ہی اب یہ قصا مختصر کر

گئی آنکھوں سی نیند اب ناگہانی ۔۔۔ زبان کر بند بس کر یہ کہانی

مثنوی ۱۲۰۸ھ میں منظوم ہوئی۔ زیر نظر قلمی نسخہ کا سنہ کتابت ۱۲۵۱ھ ہے۔ کاتب لکھتا ہے :۔

"تمام شد نسخہ زلیخا بزبان اُردو تصنیف قادر علی عظیم آبادی قدس اللہ سرہ بتاریخ

ہشتم ماہ جمادی الاول۔ مطابق بست ششم ماہ بھادو ۱۲۴۲ھ فصلی۔ مطابق ۱۲۵۱ھ ہجرے قدسہ از دست یکے از طلبایان کم استعداد عاصی الہ غلام صفدر برائے درس خود از کتاب یکے از دوستان دلبرا کھوری لعل سہائے سنگہ صاحب قوم کایستہ ساکن موضع جگدیشپور بمقام موضع گایگھاٹ پرگنہ بھوجپور بدروازہ لالہ گردہاری لعل صاحب قوم کایست .. .. اختتام یافت "

مجھے قادر علی فگار عظیم آبادی کے حالات سے آگاہی نہیں ہو سکی۔ بہرحال صاحبِ ذوق شخص معلوم ہوتے ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔ زلیخا کے حُسن کی تعریف ملاحظہ ہو:۔

قد اس کا سروسی رعنا ہوا ہی — بلای عالم بالا ہوا ہی

.. .. — .. ..

یہ پیشانی کے اس کی تھی صفائی — کہ آتی تھی نظر اس میں خدائی

نہیں چیں بر جبیں وہ نازنین ہو — کہاں ممکن کہ آئینی میں چین ہو

.. .. — .. ..

خمار حسن سی آنکھیں سیہ مست — نگہ کرتی تھی آہو کی طرح جست

زلیخا کے عشق کا حال دیکھیے:۔

زلیخا خواب میں دیکھہ اسکی صورت — بنی حیرت سی ماٹیکی وہ مورت

.. .. — .. ..

ہوی بھور اور وہ در خواب شیریں — رہی بیہوش ہو جیو نقش قالیں

وہ رخسارہ جو تھا جیوں شمع کافور ہوا مثل چراغ صبح بے نور

مجموعی طور پر مثنوی بہت رواں اور پُر اثر ہے۔ اس میں روایتی رنگ ہر جگہ موجود ہے۔ لیکن تشبیہات واستعارات میں شاعر نے اپنی اُپج بھی دکھلائی ہے۔

بہار کے تذکرہ نگار شعراء

غلام حسین شورش متوفی ۱۱۹۵ھ / ۱۱۹۳ھ

شورش، میر باقر حزیں کے شاگرد تھے۔ ان کی شہرت شاعری سے زیادہ تذکرہ نگاری کی وجہ سے ہے۔ تذکرہ کا صرف ایک قلمی نسخہ ابتک دستیاب ہوسکا ہے۔ یہ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ میں ہے۔ اب پٹنہ یونیورسٹی نے اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپی منگوائی ہے جو میری نظر سے بھی گذری ہے۔ پرنسپل کلیم الدین احمد صاحب کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے یہ خزانہ انگلستان سے ہندوستان آیا۔ آرٹ فیکلٹی کے "ڈین" کی حیثیت سے آپ نے بہت سے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ اُن میں یہ بھی ایک اہم کام ہوا ہے۔ مذکورہ قلمی نسخہ سے اشپرنگر نے اپنی

فہرست کتب خانۂ شاہان اودھ مرتّب کرنے میں مدد لی تھی۔ اس تذکرہ کی تالیف کی ابتدا مؤلف کی وفات کے چند سال پہلے سے ہوئی ہے اور تکمیل، وفات سے کچھ قبل۔ اس کی زبان ہرگز اُردو نہیں۔ عزیزالدین بلخی مرحوم اور دوسرے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ صاحب "گلزار ابراہیم" نے لکھا ہے کہ "شورش تذکرہ در ریختہ نوشتہ"۔ "در ریختہ" کے معنی شعرائے ریختہ کے متعلق کے ہیں۔ بہرحال ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اب ہمارے پاس قلمی تذکرہ کا باضابطہ اور مصدقہ فوٹو موجود ہے۔ بوڈلین لائبریری آکسفورڈ کی فہرست میں اس کا سال تصنیف ۱۱۹۳ھ لکھا ہے[1]۔

میر غلام حسین شورش عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے پیدائش کا علم نہیں۔ بلخی سال وفات ۱۱۹۵ھ لکھتے ہیں[2] اور قاضی عبدالودود صاحب ۱۱۹۳ھ بتاتے ہیں۔ مگر آخرالذکر صاحب مُشتبہ ہیں[3]۔ شورش کا دیوان[4] ریختہ میں مرتب تھا مگر وہ ہنوز ملا نہیں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش — ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

(تذکرۂ گلشن بیخار)

کسی کو خُم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام — قسم مغاں کی ہے ساقی کے مجھ کو نام سے کام

ہماری صبح رُخِ یار شام زلف نگار — نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح و شام سے کام

(شعرالہند)

---

[1] مقدمہ دیوان رضا' از قاضی عبدالودود۔ معاصر، پٹنہ + [2] تاریخ شعرائے بہار، بلخی ص۲۶ + [3] صدائے عام، عید نمبر ۱۹۵۳ء ص۱۹۔ پرافسر وددائی نے بھی اس سے بحث کی ہے۔ بہار اور اُردو شاعری ص۳۹ + [4] تاریخ شعرائے بہار۔ بلخی ص۲۶

ہم جو روتے ہیں لوگ ہنستے ہیں ہنستے ہی گھر سُنا ہے بستے ہیں

روبرو جانے کی رخصت نہیں دیتے درباں حالِ دل میں پسِ دیوار سنا آتا ہوں

("تاریخ شعرائے بہار)

نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ — م ۱۲۰۸ھ

نواب امین الدولہ عزیز الملک علی ابراہیم خاں بہادر، نصیر جنگ المتخلص بہ خلیلؔ عظیم آبادی۔ یہ نواب میر قاسم علی خاں عالی جاہ کے وزیر تھے۔ کچھ دنوں تک عظیم آباد کے صوبہ دار اور نائب ناظم بھی رہے۔ اس دور کے بیشتر شعراء نواب کے واقف کار اور کسی نہ کسی رنگ میں عالیؔ جاہ کے متوسّلین میں سے تھے علی ابراہیم خاں نے نواب عالی جاہ کی رفاقت خوب کی مگر عالیؔ جاہ کی بربادی کے بعد وہ نوابِ اودھ، شجاع الدولہ سے علیحدہ ہوئے اور مرشد آباد کا رُخ کیا۔ لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ان کو عدالت دیوانی ضلع بنارس کا حاکم اعلیٰ مقرر کر دیا اور لارڈ کارنوالس کے عہد میں انہیں وہاں کی گورنری بھی ملی۔ قیامِ بنارسؔ کے دور میں تالیف و تصنیف میں مشغول ہوئے۔

خلیلؔ، اُردو و فارسی دونوں کے شاعر تھے۔ لیکن ان کی شہرت تذکرۂ گلزار ابراہیم کی وجہ سے ہے۔ یہ تذکرہ مسخ شدہ[1] شکل میں انجمن ترقی اُردو (ہند)

---

[1] قاضی عبدالودود۔ صدائے عام، عید نمبر ۵۱ء ص ۲۰

دھلی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ دو قلمی[1] نسخے کم از کم پٹنے میں موجود ہیں۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی نے ۱۱۸۴ھ میں "تذکرۂ گلزار ابراہیم لکھنا شروع کیا اور ۱۱۹۸ھ میں تمام کیا[2]۔ یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب مقدمۂ دیوان رضا میں لکھتے ہیں کہ:

"مقدمۂ دیوان جوشش میں لکھا گیا تھا کہ مصنف تذکرہ (گلزار ابراہیم، ناقل) کی ننہیال عظیم آباد میں تھی، صحیح یہ ہے کہ علی ابراہیم خاں کے نانا مولوی نصیر شیخپورہ کے رہنے والے تھے۔ اور ایران سے واپسی کے بعد عظیم آباد میں اقامت پذیر تھے۔ سیر المتاخرین نولکشوری ص ۶۱۱"

نواب علی ابراہیم خاں، شیخپورہ ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے۔ تذکرہ گلزار ابراہیم بنارس کے قیام کے دوران مکمل ہوا۔ خلیل مرشد آباد میں بھی رہے ہیں۔ ان کے والد کا نام خواجہ عبدالحکیم تھا۔

تصانیف:— (۱) گلزار ابراہیم۔ شعرائے ریختہ کا تذکرہ ۱۱۸۴ھ ابتدا، ۱۱۹۸ھ (مطابق ۱۷۸۴ء) تکمیل۔

(۲) صحف ابراہیم۔ شعرائے فارسی کا تذکرہ ۱۲۰۵ھ میں مکمل ہوا۔ "ذیفِ بخشِ زماں" (۱۲۰۵ھ)۔

(۳) خلاصۃ الکلام۔ فارسی مثنوی نگاروں کا تذکرہ۔

---

[1] کتب خانہ مشرقیہ خدا بخش، پٹنہ میں ایک قلمی نسخہ ہے، اور دوسرا پٹنہ یونیورسٹی کی لائبریری میں

[2] تاریخ شعرائے بہار، جلد اوّل: ص ۶۹

(۴) وقائع جنگ مرہٹہ — لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں، ۱۲۰۱ھ۔

(۵) ایک رسالہ راجہ چیت سنگھ والی بنارس کی بغاوت، کے حالات میں۔

(۶) "خطوط" - برٹش میوزیم۔

اُن کا اُردو کلام اب نایاب ہے

تاریخ شعرائے بہار میں صرف چار اشعار درج ہیں۔ لکھا ہے، بہت تلاش سے ملے ہیں۔ ؎

خلش رکھتا ہو جب سے دل مرا چوں خار پہلو میں | ہُوا رکھتا ہے اس دشمن کا کیا دشوار پہلو میں

دل پُر درد ہو جس کا اوسے آرام کیا ہوئے | یہ سچ ہے کیونکہ سووے جس کی ہو بیمار پہلو میں

لہو رونے سے میرے تر ہوا جیب و کنار آخر | خلیل آنکھوں کی ہاتھوں ہو گیا گلزار پہلو میں

اُڑ گئے کچھ حواس سے میرے | اُٹھ گیا کون پاس سے میرے

وجیہہ الدین عشقی

شیخ محمد وجیہہ الدین عشقی، شیخ غلام حسین محرم کے بیٹے تھے۔ وطن عظیم آباد۔ عشقی کے والد محترم بھی اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُن کا ایک اُردو

۱؎ "تاریخ شعرائے بہار" از عزیز الدین بلخی راز، ص۲۴۔ اور "بہار کی اُردو شاعری" از قاضی عبدالودود، صدائے عام، عید نمبر ۵۳ ص۲ و مقدمہ دیوان جوشش و مقدمہ دیوان رضا۔ از ق۔ ع۔ و +

مرثیہ بھی قاضی عبدالودود صاحب کی نظر سے گذرا ہے۔ عشقی فارسی انشا پردازی میں بڑا پایہ رکھتے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنے بعض خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے۔ عشقی اٹاوہ اور ڈھاکہ وغیرہ میں بھی رہے ہیں۔ آخر دفعہ جو ڈھاکہ گئے تو پھر واپس نہ آئے۔ اور وہیں انتقال کیا۔

عشقی کی سب سے مشہور چیز اُن کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے شعرائے اُردو کا تذکرہ فارسی میں لکھا۔ اس کا آغاز تیرھویں صدی کے اوائل میں ہوا اور انجام ۱۲۳۰ھ میں۔ ممکن ہے اس کے بعد تک آخری قلم کاری ہوتی رہی ہو۔ تذکرہ عشقی کے دو[1] نسخے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک آکسفورڈ میں ہے اور ایک قاضی عبدالودود صاحب کے پاس۔ تذکرہ کے علاوہ "ایک دیوان[1] اور مثنوی" یادگار چھوڑی۔ تذکرہ گارساں دتاسی تذکرہ عشقی سے ماخوذ ہے۔ آغا حسین قلی خاں عاشق عظیم آبادی صاحب تذکرہ "نشتر عشق" (مؤلفہ ۱۲۳۳ھ) عشقی کے شاگرد تھے۔ اور بہتیرے شعراء اُن کے تلامیذ میں تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے بقول "عشقی اُردو برائے نام کہتے تھے"۔ ممکن ہے کہ تذکرہ 'روز روشن' میں فارسی دیوان کا ذکر ہو۔ تذکرہ عشقی میں قریباً ستر عظیم آبادی شعراء کا ذکر ہے، خواہ وہ یہاں کے پُرانے متوطن ہوں یا یہاں مقیم ہوں۔ ڈاکٹر اسپرنگر کے 'کیٹ لاگ' سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ عشقی کا قلمی نسخہ شاہان اودھ کی لائبریری میں موجود تھا اور بقول گارساں دتاسی ایک قلمی نسخہ مسٹر جے۔ بی۔ ایلیٹ کے پاس بھی تھا۔ تذکرہ[2] عشقی میں جتنے شاعروں کا ذکر ہے اُن کے

ع[1] تاریخ شعرائے بہار، بلخی ص۴۸۔ بحوالہ تذکرہ "روز روشن" + ع[2] "تاریخ شعرائے بہار" بلخی ص۱۶۔ از وزیر علی عبرتی عظیم آبادی ۱۲۶۰ھ۔

نام اور حالات مع اضافہ تحقیقات کے ڈاکٹر اسپرنگر کے "کیٹ لاگ آف اودھ لائبریری" (فہرست کتب خانہ شاہان اودھ) اور تذکرہ "گارسان دتاسی" (تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی) میں عشقیؔ کے حوالہ کے ساتھ موجود ہیں۔ شعرالہند جلد اول کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ رحمت اللہ عشقی عظیم آبادی نے ۱۱۱۵ھ میں ایک تذکرۂ ریختہ مرتب کیا۔ یہ صحیح نہیں۔ عشقیؔ تخلص اور رحمت اللہ نام کا اجتماع عظیم آباد میں نہیں ہوا۔[۱]

تذکرۂ "روزِ روشن"[۲] (سنہ ۱۲۶۰ھ) از عبرتی عظیم آبادی میں مذکور ہے کہ انہوں نے خود عشقیؔ کا دیوان و مثنوی اور دیگر تصنیفات نظم و نثر وغیرہ ڈھاکہ میں عشقیؔ کے احباب کے پاس دیکھیں۔ ہنوز مجھے اردو نمونۂ کلام کہیں نہیں مل سکا۔

نوٹ:۔ [۳] آغا حسین قلی خاں بن آغا علی خاں فاچار وجیہہ الدین عشقیؔ کے شاگرد تھے۔ ان کا وطن اصلی خراسان تھا۔ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تذکرہ "نشترِ عشق" لکھا۔ اس میں ایران و ہند کے چودہ سو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ اردو میں کہتے تھے ؎

جس سے کہ میں پوچھوں ہوں مزا عشق کا کیا ہے
رو رو کے یہ کہتا ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

عشقیؔ کے ایک اور شاگرد خواجہ حیدر جان شائقؔ، ڈھاکہ میں تھے۔
(تذکرۂ "روز روشن" عبرتی)

۱۔ بلخی و ق۔ ع۔ و + ۲۔ و ۳۔ ت۔ ش۔ ب از ع۔ بلخی ص ۶۲ و ص ۶۵ +

شعرائے شاہجہان آباد جو عظیم آباد میں آباد ہوئے

میر محمد باقر حزیںؔ۔ متوفی ۱۱۶۵ھ[1]

نام میر محمد باقر، تخلص حزیںؔ۔ دہلی کے رہنے والے۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے مرید اور شاگرد رشید۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت کے شاعر تھے۔ حملۂ نادری کے بعد پریشان حال ہوکر عظیم آباد چلے آئے۔ (قریباً ۱۱۵۴ھ)۔ نواب سید احمد خاں صولت جنگ سے وابستہ رہے۔ ۱۱۶۵ھ میں فوت ہوئے۔ ایک دیوان (قصائد و غزلیات) یادگار چھوڑا۔ سوداؔ نے بھی انہیں اکابر شعراء میں شمار کیا ہے۔ شورشؔ عظیم آبادی حزیںؔ کے شاگرد تھے۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

یہ کہکے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا تھا یوں کہ فصلِ گُل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب
چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

جو ہیں آنکھوں کی مخمور اونکو میخانے سے کیا نسبت
نگہہ کی جو ہیں تشنہ اونکو پیمانے سے کیا نسبت
ہوا ہے تو حزیںؔ دیوانہ ان شہری غزالوں کا
تجھے صحرا سے اب کیا کام ویرانے سے کیا نسبت

---

[1] تاریخ شعرائے بہار صفحہ ۔ بحوالۂ تذکرہ فتح علی گردیزی (مؤلفہ ۱۱۶۵ھ) +

اشرف علی خاں فغاں - متوفی سنہ ۱۱۸۶ھ

اشرف علی نام - مرزا علی خاں کے فرزند - فغاں تخلص - احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ (سوتیلے بھائی) تھے - حاضر جواب، لطیفہ گو، ظریف و بذلہ سنج - خطاب شاہی ظریف الملک کوکہ خاں - احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے پریشان خاطر ہو کر مرشد آباد گئے - پھر فیض آباد - نواب اودھ شجاع الدولہ نے بہت آؤ بھگت کی مگر بے تکلفی میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ داغ دیا - فغاں جل کر عظیم آباد چلے آئے - یہاں مہاراجہ شتاب رائے کی قدر دانی دامن گیر ہوئی - عظیم آباد سے کہیں نہ گئے - ۱۱۸۶ھ میں یہیں وفات پائی - ان کی قبر[1] محلہ ڈھول پورہ میں شیر شاہی مسجد کے قریب ہے - قبر کے پتھر پر تاریخ انتقال کندہ ہے - "سرور دلہا رفت" ۱۱۸۶ھ - نواب علی ابراہیم خاں خلیل کے بقول فغاں کے دیوان ریختہ کے علاوہ اُن کی دو مثنویاں بھی تھیں - اُن میں سے ایک ہجویہ تھی - نمونۂ کلام حسب ذیل ہے :- ؎

ہستی کے خرابے نظر آتے جو عدم میں	ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا
دل بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی ہے مجھے	گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا
جھٹ تو تڑپے ہر کنج قفس میں مرغ چمن	اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے	کیا اُڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں
صیاد راہ باغ فراموش ہو گئی	کنج قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

---

[1] "تاریخ شعرائے بہار" - بلخی ص۵۲-۵۶

فغاں کا قلمی دیوان، اصلاح، لائبریری دسنہ، ضلع پٹنہ میں محفوظ ہے۔ (شتاب رائے از مولانا سید ابوظفر ندوی۔ بہار نمبر ۱۹۳۵ء صـ۲۹۷)

میر ضیا الدین ضیا

میر ضیا الدین حسن نام۔ ضیا تخلص۔ دہلی کے رہنے والے۔ سودا کے ہمعصر۔ وہاں سے نکل کر فیض آباد و لکھنو ہوتے ہوئے عظیم آباد میں آکر بس گئے۔ راجہ شتاب رائے کے بیٹے ان سے نہایت اچھا سلوک کیا کرتے تھے۔ میر حسن دہلوی ان سے اصلاح لیا کرتے تھے (تذکرۂ میر حسن)۔ نواب علی ابراہیم خاں سے تذکرۂ گلزار ابراہیم لکھتے وقت تک ملاقات نہیں ہوئی۔ اس امر کا صاحب تذکرہ نے ذکر کیا ہے (تاریخ شعرائے بہار صـ۲۰)۔ ۱۱۹۶ھ تک زندہ تھے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگ خلق
اوس کے کوچہ میں ضیا تو آج پھر جانے لگا

رسوائیوں کی اپنے مجھے کچھ ہوس نہیں ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

کچھ کل سے بھی زیادہ ہے بیتاب آج تو
قاصد ضیا کو کیسی خبر آکے کہہ گیا

بھول کر بھی کبھی نہ یاد کیا ہم ترے جی سے ایسے بھول گئے

۱۔ تاریخ شعرائے بہار، نجی صـ۲۹-۲۷

شاہ رُکن الدین عشق — متوفی سنہ ۱۲۰۳ھ

شیخ رُکن الدین نام۔ عرف شاہ گھسیٹا۔ شیخ محمد کریم فاروقی کے بیٹے اور شاہ محمد فرہادؒ ابوالعلائیؒ[1] کے نواسے تھے۔ وطن دِلّی تھا۔ بچپن سے آغاز جوانی تک وہیں رہے۔ غالبًا دُرّانیوں کے حملہ کی شہر آشوبی سے متاثر ہو کر وطن چھوڑا اور مرشد آباد پہنچے۔ خواجہ محمدی خان رسالہ دار نواب میر قاسم علی خاں عالی جاہ کی رفاقت میں "ہزار سوار کی افسری کے منصب پر فائز ہوئے[1]"۔ مرزا علی لطف اور اکثر تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عشقؔ ایّام شباب میں شاہجہاں آباد سے مرشد آباد آئے۔ "یادگار عشق" از مولوی[2] سید حسن رضا صاحب ثاقب عظیم آبادی میں حضرت عشقؔ کی عمر سو برس قرار دی گئی ہے۔ اور سال ولادت سنہ ۱۱۰۳ھ متعیّن کیا گیا ہے۔ یہ تاریخی لحاظ سے بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ میر قاسم کے عہدِ نظامت کا آغاز سنہ ۱۱۷۴ھ مطابق سنہ ۱۷۶۰ء میں ہوا۔ یہ قرین قیاس نہیں کہ اکہتر سال کی عمر میں عشقؔ کو فوجی[3] ملازمت ملی ہو۔ ایک عرصہ تک اس رنگ میں بسر کرنے کے بعد فقر و درویشی کی طرف مائل ہوئے اور ترک ملازمت کر کے عظیم آباد چلے آئے۔ حضرت مخدوم منعم پاک رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ سے فیض پایا اور بقیہ عمر ذکرِ الٰہی و خدمتِ خلق

۱؎ تاریخ شعرائے بہار جلد ۲ ص ۴۷-۳۲ سنہ ۱۹۳۰ء + ۲؎ "یادگار عشق" حالات زندگی، خصوصیات شاعری و انتخاب کلام مع مقدمہ علامہ سلیمان ندوی سنہ ۱۹۲۹ء + ۳؎ 'گلشن ہند': مرزا لطف علی۔ تذکرہ مصحفی و تذکرۂ میر حسن، و تاریخ تذکرۃ الکرام از شاہ محمد کبیر صاحب ابوالعلائی داناپوری +

میں گذاردی۔ ۱۲۰۳ھ میں وفات[1] پائی۔ فدوی نے تاریخ وفات لکھی ؎

گفت فدوی سال تاریخ وفات　　ہادی ما شاہ رکن الدین عشق
۱۲۰۳ھ

کسی مستند تذکرہ میں سال پیدائش درج نہیں اور قطعی طور پر یہ بھی نہ معلوم ہوسکا کہ عشق عظیم آباد کس سال تشریف لائے۔ قرینہ غالب یہی ہے کہ ۱۱۷۴ھ کے چند سال بعد تشریف فرمائی ہوئی ہوگی۔ میر قاسم عالی جاہ کی نظامت کا عہد ۱۱۷۴ھ تا ۱۱۷۸ھ (۶۴-۱۷۶۱ء) ہے۔ جناب ثاقب عظیم آبادی نے حضرت عشق کے ورود کا سال ۱۱۶۲ھ بحوالہ کیفیت العارفین لکھا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ حضرت عشق قریباً پچیس ۲۵ سال تک عظیم آباد میں اقامت گزیں رہے۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، عظیم آباد و بہار کے اہل عقیدت آپ پر پروانہ وار نثار ہوتے تھے۔ نواب علی ابراہیم خلیل اور دوسرے تذکرہ نویس حضرت عشق کا ذکر بڑے ادب واحترام سے کرتے ہیں۔ پروفیسر دردائی لکھتے ہیں:

"اگر ملکۂ[2] نورجہاں ایرانی نژاد ہونے کے باوجود ایک ہندوستانی ملکہ کہلا سکتی ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ میں شاہ گھسیٹا یا میاں فدوی کو عظیم آبادی شاعر نہ کہوں۔"

نواب شیفتہ صاحب گلشن بے خار[3] نے بھی عشق کو "از سخن پروران معروف عظیم آباد" لکھا ہے۔

۱۔ نواب علی ابراہیم خلیل سنہ وفات ۱۱۹۵ھ لکھتے ہیں۔ لیکن ایک اور تاریخ وفات ہے محمد یحییٰ صاحب مرحوم، شاہ کی آلی کی۔ "آفتاب طریقت" (۱۲۰۳ھ)

۲۔ بہار اور اردو شاعری، معین الدین دردائی ص ۴۳ + ۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۳۴ +

عشقؔ کا اُردو دیوان مرتّب ہے۔ دیوان کا ایک قلمی نسخہ پیرس میں[۱] پرافسر گارساں دتاسی کے پاس تھا۔ ایک دوسرا قلمی نسخہ خانقاہ "تکیہ حضرت عشق"، پٹنہ سیٹی میں موجود ہے۔ تیسرا قلمی نسخہ خانقاہ پھلواری شریف کے کتب خانہ میں[۲] ہے۔ دیوان ریختہ میں غزلیں، رباعیاں اور مثنویاں ہیں۔

حضرت عشقؔ کی زندگی اور شاعری سے متعلق 'یادگار عشق' از مولوی سید حسن رضا صاحب ثاقبؔ عظیم آبادی نہایت ہی غنیمت تذکرہ ہے۔ علّامہ سید سلیمان ندوی نے مختصر مگر بصیرت افروز مقدمہ لکھا ہے۔ اسلامی پریس صدر گلی، پٹنہ سیٹی سے یہ چھوٹی سی کتاب ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔ ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ باب اول حالات زندگی میں ہے۔ باب دوم خصوصیات شاعری میں، اور باب سوم انتخاب کلام عشقؔ پیش کرتا ہے۔ تذکرہ میں ہمعصر شعرائے عظیم آباد، پھلواری شریف اور مرشدآباد کے بارے میں بھی اہم اطلاعات ملتی ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے بلا ثبوت یہ بات اپنی کتاب "تاریخ صوبۂ بہار" اور "حیاتِ فریاد" میں لکھ دی ہے کہ حضرت عشقؔ کو راسخؔ عظیم آبادی سے تلمذ تھا۔ یہ بالبداہت غلط ہے۔ راسخؔ ۱۱۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ان کے ہوش سنبھالنے سے پہلے عشقؔ مسلم الثبوت اساتذہ میں شمار کئے جانے لگے تھے۔ جیسا کہ تذکروں سے ثابت ہے۔ حضرت عشقؔ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔ اس میں صوفیانہ، عارفانہ، و عاشقانہ کیف ہے۔ دردؔ و میرؔ کا انداز ہے۔

۱۔ تذکرہ "طبقات الشعراء" - از مولوی کریم الدین: ۱۸۴۸ء + ۲۔ "تاریخ شعرائے بہار": بلخی ص ۴۶-۴۵
"یادگار عشق" از ثاقب عظیم آبادی +

آہ جانسوز کو سر دفتر دیوان کیا   عشق نے دیکھتے ہو پہلے ہی طوفان کیا

عرش تا فرش سیر کر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

آگے میاں نصیب ہے سر سبز ہو نہ ہو   دل کی زمیں میں تخمِ محبت تو بو دیا

چین ہی اس دل بے تاب کا منظور نہ تھا   ورنہ آنا ترا مجھ پاس تو کچھ دور نہ تھا

داغ دل کا تو کبھی ہم سے مٹایا نہ گیا   یہ دیا وہ ہے جو دن کو بھی بجھایا نہ گیا

نہ بتخانہ کو جاتے ہیں نہ کعبہ میں بھٹکتے ہیں   جہاں تم پاؤں رکھتے ہو وہاں ہم سر پٹکتے ہیں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ کیوں تو نے رو دیا   دل نے کیا تھا جمع سو آنکھوں نے کھو دیا

عشق یا دشمن بخیر اے یارو   آگے آتا تھا اب نہیں آتا

محنتِ دل سوئے دیدہ آتا ہے   ٹک تو مرّت! نورِ دیدہ آتا ہے

دل دھڑکتا ہے آج کچھ بے طور   کوئی خنجر کشیدہ آتا ہے

تیر کے نام پر تڑپتا ہے   اس طرح کا کہیں جگر دیکھا

ڈر سے اُس کے زباں پہ حرف نہیں   تس پہ ہے بدگمان کیا کیجئے

اُس کے دامن تلک نہ پہونچے ہم   خاک میں آپ کو ملا دیکھا

میری آنکھوں سے وہ جدا بھی نہیں   گو وہ مجھ پر نظر نہیں رکھتا

بسا ہو دل میں آ وہ خانہ ویراں   خداوندا اُسے آباد رکھنا

اپنی آنکھوں سے پوچھ اے خوش چشم   مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا

ممکن نہیں جی بچے سحر تک   باقی ہے ابھی دو پہر رات

جان کو بے قرار پاتے ہیں   دل کو بے اختیار پاتے ہیں

یہ حُسن، یہ اُدا یہ نگاہیں یہ گرمیاں   نامِ خدا کہاں ہیں کسی طرحدار میں

نذر کو کچھ نہ تھا مجھ پاس   دلِ بے اختیار لایا ہوں

ایک دن بھی خیال دلداری   نہ کیا آہ تو نے پر نہ کیا

کون سی رات خونِ دل سے عشق   دامن و آستیں کو تر نہ کیا

جاتا ہے فلک کے پار نالہ   یہ تیر بھی کارگر نہ ہوگا

دل کے ہاتھوں خراب پھرتا ہوں   اس میں کچھ اختیار ہے میرا

بولئے تو زبان جل جائے   چُپکے رہیے تو جان جل جائے

کس کی بستی ہے کون بستا ہے   کربلا جس کے گھر کا رستا ہے

تم عبث اب ڈھونڈتے ہو آشیانِ عندلیب
مُشت پر گلشن میں باقی ہے نشانِ عندلیب

مرزا محمد علی فدوی - متوفی[۱] سنہ ۱۲۱۰ھ

بھجو

مرزا محمد علی عُرف مرزا بجو یا مجو دھلی کے رہنے والے تھے۔ احمد شاہ[۱] بادشاہ کے دربار میں وقائع نویس کی حیثیت سے ملازم رہے۔ دھلی سے

ع[۱] "قاضی عبدالودود صاحب اور پروفیسر حسنین سلمہا کو اس بیان پر شبہ ہے۔ احمد شاہ کا عہد سلطنت (۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء تا سنہ) مختصر رہا ہے۔ فدوی کی پیدائش اگر سنہ ۱۱۴۰ھ کے لگ بھگ مانی جائے تو یہ ممکن ہے۔ لیکن اس صورت میں وہ جوانی میں عظیم آباد نہیں آسکتے، بلکہ ۴۵ ـ ۵۰ سال کی عمر میں یہاں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

مرشد آباد گئے۔ کچھ دنوں وہاں مقیم ہوئے سنہ ۱۱۹۰ھ میں عظیم آباد آکر مستقل سکونت اختیار کی۔ حضرت عشقؔ کے علوم ظاہری و باطنی میں شاگرد ہوئے سنہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا۔ فن موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ ان کا اُردو دیوان مکمل ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولوی سید ضمیر الحسن صاحب رئیس موضع گیلانی، مضافات بہار شریف کے کتب خانہ میں ہے۔ دوسرا روائیل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کی لائبریری میں اور تیسرا پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ مخطوطات میں۔ آخر الذکر پرافسر حسنؔ عسکری صاحب کو پٹنہ سیٹی سے ملا۔

پرافسر حسنین سلمہٗ عظیم آبادی فدوؔی پر ریسرچ کی تکمیل کرچکے ہیں۔ انہوں نے کئی سال کی محنت سے قلمی نسخوں اور تذکروں سے مواد مہیا اور دیوان فدوؔی مرتب کیا ہے۔ اُن کا مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش ہوچکا اور انشاء اللہ شائع بھی ہوگا۔

فدوؔی کی شاعری میں فنی خوبیوں کے ساتھ درد وگداز بھی پایا جاتا ہے۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:۔

چل[۲] ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے ۔۔۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

بن ملے تو یہ حال ہے فدوی ۔۔۔ وہ ملے گا تو کیا غضب ہوگا

۱۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم۔ فدوی کا تذکرہ گلشن بے خار، ص۱۴۷ اور تذکرۂ میر حسنؔ میں بھی ہے۔ نیز گلشن ہند ص۱۳۲۔ اور تذکرۂ شورش عظیم آبادی میں +

۲۔ تاریخ شعرائے بہار: بلخی۔ مگر دردائی نے 'بہار اور اُردو شاعری' میں اسی شعر کو یوں لکھا ہے:۔

؎ چل ساتھ کہ حسرت دلِ محروم سے نکلے ۔۔۔ عاشق کا جنازہ بھی ذرا دھوم سے نکلے

کیوں کی اودھر نگاہ جو وہ مجھکو پا گیا — دل پر ہوئی جو ہونی تھی آنکھوں کا کیا گیا

بیخودی اور شرم سے باتوں کا کس میں ہوش تھا — وہ اودھر خاموش تھا کل میں ادھر خاموش تھا

وہ ہم پہ مہربان کبھی ہے کبھی نہیں — جینے کا اب گمان کبھی ہے کبھی نہیں

پھرتے تھے تم تو آنکھ بچائے چھپے چھپے — نکلا کدھر ہے چاند جو آئے چھپے چھپے

تری ہم نے تاثیر بس آہ دیکھی — نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق ۱۱۶۵ھ تا ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء

مہاراجہ کلیان سنگھ، تخلص عاشق - یہ مہاراجہ شتاب رائے کے بیٹے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اُن کا منصب بھی پایا تھا۔ ان کی پیدائش بھی دہلی[1] کی ہے مگر کم عمری میں پٹنہ چلے آئے تھے۔ ان کی شاعری آغوش عظیم آباد میں پروان چڑھی۔

پرافسر سید حسن عسکری صاحب نے ندیم بہار نمبر ۱۹۴۰ء میں ایک سیر حاصل مقالہ بعنوان صوبہ بہار کے آخری ہندوستانی گورنر لکھا تھا۔ اس میں بڑی تفصیل سے اس زمانہ کے حالات کا پس منظر اور انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجہ کلیان سنگھ بہادر تہوّر جنگ کے احوال پیش کئے ہیں۔ پرافسر موصوف نے خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی (۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۹ء) مؤلفہ مہاراجہ کلیان سنگھ، ان کی دوسری تصانیف

---

[1] تذکرہ 'معراج الخیال' از عبرتی عظیم آبادی۔

کے قلمی نسخوں اور بہتیرے تاریخی شواہد سے مواد اکٹھا کیا ہے۔

مہاراجہ کا خاندان دہلی کا سکسینہ کائستھ خانوادہ تھا۔ راجہ رام نرائن لال موزوں ۱۱۶۶ھ ۱۷۵۳ء تا ۱۱۷۶ھ ۱۷۶۳ء۔ بہار، بنگال و اُڑیسہ کی نظامت پر مامور رہے۔ اس عہد میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے۔ مہاراجہ شتاب رائے نے کچھ عرصہ راجہ رام نرائن لال کے ساتھ مِل کر کام کیا۔ آخر ۱۱۷۹ھ میں مہاراجہ شتاب رائے[1] اس عہدہ پر مامور کئے گئے۔ جنگ بیرتور سے بادشاہ دہلی کا زوال اور انگریزوں کا عروج شروع ہوتا ہے اور اسی وقت سے راجہ شتاب رائے کا ستارۂ اقبال طلوع ہوا۔ مگر جب میر قاسم نے راجہ نرائن سے محاسبہ کیا اور انہیں گرفتار کر لیا تو شرکت امارت کی وجہ سے شتاب رائے پر بھی عتاب آیا۔ راجہ موصوف مصلحتاً ہر کام سے دست بردار ہو کر خانہ نشین ہوئے۔ انگریزوں کی مداخلت کی وجہ سے انہیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ ممبران کونسل انگریزی نے راجہ کو بے قصور پایا۔ لیکن نواب میر قاسم کی رعایت بھی ملحوظ تھی۔ اس لئے حکم ہوا کہ راجہ شتاب رائے نواب کی مملکت سے باہر چلے جائیں۔ انہوں نے نواب شجاع الدولہ ناظم اودھ کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی اور راجہ بینی بہادر کے ساتھ نائب صوبہ دار ہو کر باعزت رہنے لگے۔

کچھ سیاسی نشیب و فراز کے بعد راجہ شتاب رائے اپنے پرانے عہدہ پر

---

[1] شتاب رائے گورنر بہار۔ از مولانا سید ابوظفر ندوی۔ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ء۔ بحوالہ سیر المتاخرین جلد دوم

عظیم آباد واپس آگئے۔ اس وقت میر جعفر کی طرف سے میر کاظم ناظم اور راجہ دھیرج نرائن دیوان مقرر تھے۔ راجہ شتاب رائے شاہی دیوان کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انہیں کی کوشش سے شاہ عالم بادشاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی۔ انگریزوں نے خوش ہو کر شتاب رائے کو نظامت بہار دلوائی۔ دربار شاہی سے 'ممتاز الملک مہاراجہ شتاب رائے بہادر منصور جنگ' خطاب عطا ہوا۔ راجہ شتاب رائے اور دھیرج نرائن امور نظامت انجام دیتے تھے اور مسٹر مڈلٹن ان کی نگہداری کرتے تھے (سیر المتاخرین)۔ دھیرج نرائن پر غبن کا الزام آیا۔ مظفر جنگ مرشدآباد سے عظیم آباد حساب فہمی کے لئے بھیجے گئے اور انگریزوں کے حکم سے دھیرج نرائن گرفتار کر لئے گئے۔ بعد ازآں مہاراجہ شتاب رائے عظیم آباد، بہار کے تنہا ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۱۸۶ھ میں لارڈ ہسٹنگز نے مظفر جنگ اور شتاب رائے دونوں کی گرفتاری کا حکم بجرم خیانت دیا۔ راجہ موصوف تین ماہ تک نظر بند رہے۔ آخرش وہ باعزت رہا ہوئے۔ مگر بیمار و دل شکستہ۔ عظیم آباد کا نظم بھی بدل چکا تھا۔ ایک انتظامی کانسل مقرر ہوئی تھی جس کے ایک رکن راجہ موصوف بھی مقرر ہوئے تھے۔ ۱۱۸۷ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ تلافی مافات کے سلسلے میں اُن کے بیٹے کلیان سنگھ کو پہلے انتظامی کانسل کی ممبری اور پھر عظیم آباد کی نظامت سپرد کی گئی۔

میر غلام حسین مصنف سیر المتاخرین کی رائے ہے کہ:۔

"راجہ بہت زیادہ اوصاف حمیدہ رکھتا تھا۔ اور اُس عہد میں اکثر امراء سے ممتاز تھا اور اخلاق میں ان پر فضیلت حاصل تھی" راجہ شتاب رائے

کی طرز معاشرت ہند اسلامی تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ عقاید کے لحاظ سے وہ صوفی منش موحد شخص تھے۔

مہاراجہ شتاب رائے کا ادبی ذوق بھی بہت بلند اور اعلیٰ تھا۔ وہ شاعروں، فن کاروں اور صنّاعوں کے نہایت قدر دان تھے۔ اس باب میں ان کے گھرانے پر ہمہ خانہ آفتاب کی مثل صادق آتی تھی۔ اشرف علی فغاںؔ، مہاراجہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ راجہ شتاب رائے کے لڑکے خود شاعر اور شعراء کے قدر دان اور سرپرست تھے۔ وہ میر ضیاء الدین ضیاؔ سے بطور خاص حُسن سلوک کیا کرتے تھے۔ اس گھرانے اور راجہ رام نرائن لال کی بدولت اس عہد میں عظیم آباد، پٹنہ، دلّی اور لکھنؤ کا ہم پلّہ ہو رہا تھا۔ اس کی بڑی شہرت ہوئی اور شاعروں کی کثرت نے اس شہر کو اُردو کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ چنانچہ میر شبیر علی افسوسؔ اور میر امنؔ دہلوی بھی عظیم آباد آئے اور شتاب رائے کے صاحبزادے کے کرم و جود سے فیضیاب ہوتے رہے۔ عشقیؔ کا قول ہے کہ فدویؔ، عاشقؔ کی رفاقت میں زندگی بسر کرتے تھے۔

مہاراجہ کلیان سنگھ کی مہاراجگی اور مدار المہامی یوں تو عرصہ تک قائم رہی۔ لیکن اصل میں رفتہ رفتہ انگریز ہر معاملہ میں پورے طور پر قابض و دخیل ہو گئے۔ کلیان سنگھ برائے نام "نائب ناظم صوبۂ بہار" رہ گئے۔ $\frac{۱۲۰۲ھ}{۱۷۸۸ء}$ میں مہاراجہ عظیم آباد چھوڑ کر کلکتہ جا پہنچے۔ جاگیروں کی واگذاشت اور عہدوں کی بحالی کے لئے سعیٔ ناکامیاب کرتے رہے۔ مہاراجہ کے چوبیس سال کلکتے میں گذرے۔ بیمار ہو گئے۔ آنکھیں جاتی رہیں۔

۱؎ خطبۂ صدارت صلاح الدین خدا بخش سنہ ۱۹۳۰ء +

سنہ ۱۲۲۶ھ میں کلکتہ سے عظیم آباد پٹنہ روانہ ہوئے۔ یہاں اب کیا رکھا تھا۔ ویرانی ہی ویرانی تھی۔ تقریباً ایک برس یہاں رہ کر اس "شہر ناپرسان جہنم آباد" سے کلکتہ واپس چلے گئے۔ بیماری اور نابینائی میں بھی دیوان پر دیوان، مثنوی پر مثنوی پر گو شاعر منشیوں کو لکھواتا گیا[1]۔ ایک برس پٹنہ کے قیام میں پوری خلاصۃ التواریخ[2] اور واردات قاسمی لکھوادی۔ ادبی شغل تاحیات جاری رہا۔ آخر ۳۷ سال کی عمر میں ۲۶ شوال ۱۲۳۶ھ ۱۸۲۱ء میں[3] کلکتہ ہی میں انتقال کیا۔

مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق باکمال، ہمہ دان، شیریں زبان، عاشق مزاج و رنگین اطوار تھے۔ ہندو مسلمانوں کے مشترکہ تمدن کے بہترین نمائندہ۔ اپنے والد بزرگوار مہاراجہ شتاب رائے کے مسلک پر کاربند۔ مخیر، فیاض اور سرپرست علم و فن۔ عزیز الدین بلخی لکھتے ہیں :-

> "اگرچہ یہ بھی اپنے باپ ہی کے مانند مجمع کمالات تھے۔ لیکن راحت طلب اور عیش پسند ہونے کے باعث اس خدمت جلیلہ پر اون کی جانشینی سے جی چرا کر صہبائے لعل رنگ اور معشوقان شوخ و شنگ کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ سوائے فکر شعر کے اور کسی دردسر کو مول نہ لیا۔"

---

[1] میر وزیر علی عبرتی عظیم آبادی: 'معراج الخیال' + [2] خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی کے قلمی نسخے نواب زادہ سید محمد مہدی، پٹنہ سیٹی کے پاس ہیں۔

[3] 'معراج الخیال' عبرتی میں غلطی سے ۱۲۰۷ھ درج ہے۔ بقول پرافسر عسکری +

دِلّی کے محمد شاہ رنگیلے، لکھنؤ کے واجد علی شاہ رنگیلے پیا کی طرح پٹنہ کے کلیان سنگھ بھی رنگیلے، رسیلے اور عاشق مزاج تھے۔ زوال اور شکست و ریخت کے دور میں غم غلط کرنے کا فراری اور رندانہ فلسفہ احساسِ بربادی کو کم کر کے فریبِ نشاط کے رنگین دھندلکے پیدا کر دیتا ہے۔ ؎

حدیثِ مئے و مطرب گو و رازِ دہر کم تر جو
کہ کس نکشود و نکشائید بہ حکمت ایں معمہ را

کلیان سنگھ عاشق کے فارسی میں بکثرت دواوین، متعدد مثنویاں اور قصائد ہیں۔ مگر اُردو میں متفرق اشعار کے علاوہ صرف ایک سہرا اور ایک مثنوی ملتی ہے جس کے بہت سے اشعار ضائع ہو گئے ہیں۔ یہ مثنوی بہ اقساط رسالہ معاصر، پٹنہ میں شائع ہوتی رہی ہے اور پھر یکجا بھی "دائرۂ ادب" پٹنہ کی طرف سے مرتب کر دی گئی ہے جو میرے پیشِ نظر ہے۔ تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشقی اور تذکرۂ عبرتی میں عاشق کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں اور سیر المتاخرین اور خلاصۃ التواریخ و واردات قاسمی سے حالاتِ زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

مثنوی کا قلمی نسخہ بابو رامیشور پرشاد بی۔اے۔بی۔اِل پٹنہ کے پاس ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مختصر نوٹ کے ساتھ اسے معاصر میں شائع کرایا تھا۔ نمونۂ کلام حسبِ ذیل ہے:-

ہوا[1] تیرے جلوے سے بے خود کلیم — کیا اُس نے اس شعلے سے خوف و بیم

---

[1] ورق ۳ قلمی نسخہ +

دمِ وصل موسیٰ ہوا بے خبر — تجلّی سے تیری گرا کوہ پر
محمّد سزاوار دیدار ہے — کہ تیرا وو یارِ وفادار ہے

.. .. — .. ..

محمّد ہے محبوب پروردگار — محمّد ہے مطلوب پروردگار

.. .. — .. ..

محمّد کی سب سے بڑی شان ہے — محمّد کا چاکر سلیمانؑ ہے

گھٹا[1] گھر کے آئی پڑے ہے پھوار — چمکتی ہے بجلی بہ شانِ شرار
گرجتا ہے بادل عجب شور سے — برستا ہے ابرِ سیہ زور سے
عجب دھوم سے قطرہ زن ہے سحاب — چھپا ابرِ تاریک میں آفتاب

.. .. — .. ..

قرابے کا منہ کھول ساقی شتاب — پیالے میں بھر پُر تگالی شراب

.. .. — .. ..

کہ کہتا ہوں میں اب کہانی نئی — دکھاتا ہوں غم کی نشانی نئی

.. .. — .. ..

حریم[2] اُس کے تھے نازنینوں سے پُر — گھر اُس شاہ کا مہ جبینوں سے پُر
شب و روز عشرت سے تھا اُس کو کام — مئے خرّمی سے تھا لبریز جام
قمر طلعتوں سے ہم آغوش تھا — صراحیٔ عشرت سے مئے نوش تھا

---

[1] ورق ۴ قلمی نسخہ + [2] ورق ۵ قلمی نسخہ +

سُلگنے[1] لگی غم سے وہ دل جلی ہوئی اس کے دل کو عجب بے کلی

گیا دل سے آرام اور جی سے چین ہوئے مثل ابر اشک ریز اُس کے نین

اکیلے[2] چھپر کھٹ میں دولہا دولہن لگانے تھے آپس میں تازہ لگن

اِدھر سے کرشمہ اُدھر ناز تھا محبّت کا کیا خوب انداز تھا

لگائی بنے نے بنی ساتھ لاگ ہوئی مشتعل عیش و عشرت کی آگ

گلے سے لگائی بنے نے بنی تڑپنے لگی شرم سے کامنی

دیا بوسہ اُس لعل مے نوش پر رکھی اُس نے دو شاخِ گل دوش پر

مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اور کئی شعراء دوسرے مراکز اُردو سے عظیم آباد آئے، مگر پھر وہ تشریف لے گئے۔ مثلاً :۔

(۱) اَلَم دھلوی۔ صاحب میر نام۔ اَلم تخلص۔ خواجہ میر دَرد کے بیٹے۔ مرشد آباد و عظیم آباد میں رہے تھے۔ قریبًا ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی۔ تاریخ منظوری نسخہ کلکتہ ص ۲۲-۱۲۲۱

(۲) دَردمند دکنی (محمد آبادی) ثم دھلوی :۔ محمد فقیہہ نام۔ دردمند تخلّص۔ وطن محمد آباد، بیدر (دکن)۔ وہاں سے دھلی آئے (۱۱۳۶ھ)۔ شاہ ولی اللہ صاحب دھلوی رحمت اللہ علیہ اور حضرت مظہر جانجاناں کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھے۔ دلّی سے عظیم آباد آئے۔ ایک مدّت تک یہاں رہنے کے بعد دلّی واپس گئے۔ انتقال مرشد آباد میں کیا (۱۱۷۶ھ)۔ اُردو ساقی نامہ مشہور ہے۔

---

[1] ورق ۲۴ قلمی نسخہ + [2] ورق ۳۶ قلمی نسخہ +

بہار میں

اُردو

نثر نگاری

سنہ ۱۰۸۱ھ تا سنہ ۱۲۷۵ھ

حضرت عماد الدّین قلندر پھلواروی

"سیدھا رستہ" دینیات کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہ حضرت عماد الدین قلندر کی تصنیف ہے۔ جناب تمنّا عمادی مجیبی پھلواروی کو رسالہ مذکور خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ سیٹی کے کتب خانہ سے ملا تھا۔ رسالہ از ابتدا تا انتہا خط نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس رسالہ کا ایک نسخہ حضرت مصنّف کے دست مبارک کا لکھا ہوا کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ مگر باوجود تلاش جناب تمنّا یا اور کسی کو اب تک نہیں مل سکا۔ "سیدھا رستہ" کا دریافت شدہ نسخہ غالباً جناب تمنّا کے ساتھ ڈھاکہ جاچکا۔ آپ وہاں ہجرت فرما گئے ہیں۔ رسالہ معیار، پٹنہ (ماہ مارچ ۱۹۳۶ء، مرتبہ قاضی عبدالودود) میں "سیدھا رستہ" کی پوری نقل بالکل اصل کے مطابق شائع ہوچکی ہے۔ ابتدا میں سورۂ فاتحہ ہے۔ بعد ازآں یوں شروع ہوتا ہے:۔

سیدھا رستہ

اما بعد پس جانو اے مسلمان بہین آؤر بیٹی سب کہ اللہ تعالےٰ ایک ہیں۔ اون کے تئیں دھڑ بدن ہاتھ آؤر پانوں ناکھ کان پیٹ پیٹھ کوچھ نہیں ہے۔ دھڑ بدن میٹی سے بنیں ہیں، وے میٹی پانی آگ ہوا سب کے تئیں تو آپی بنائن ہیں، آسمان زمین پاہاڑ ندّی دریا سب اون ہی بنائن ہیں، اون کی تئیں صورت بھی نہیں ہے، مورت بدن کی ہووے ہے، جب اون کے تئیں بدن نہیں تو صورت کیسے ہوسکی۔ اللہ تعالےٰ کے ایسا کوؤ نہیں ہے۔ آؤر نہیں ہو سکے

ہے، اللہ تعالےٰ کا کوُو شریک ساتھی سنگھاتی نہیں ہے۔ آوُر نہیں ہو سکے ہے نہیں اُن کے تئیں کوُو جنس ہے۔ آوُر نہیں اون سے کِسو کی تئیں جنن ہے، اون کے تئیں جورو جاتا، بال بچہ نہیں، نہیں وے عورت ہیں، نہیں مرد، نہیں ہیجڑا، نہیں خنثٰی، نہیں وے لڑکا ہیں، نہیں بوڑھا، نہیں جوان، وے ہمیشہ سدا سیتی ہیں آوُر سدا تلک رہیں۔ جیسے تھے ویسے ہی ہیں، اور ویسی ہی رہیں، وے دیکھے ہیں بنا آنکھ کے آوُر سُونے ہیں بنا کان کے، اور بولے ہیں بنا موُنھ اور زبان کے .....“

رسالہ میں سات چھوٹی چھوٹی فصلیں ہیں اور رسالہ کا اختتام یوں ہوتا ہے:۔

”....... ان سب بات سیتی بچنا ہر مسلمان کے واسطے فرض ہے۔ اللہ تعالےٰ ہر مسلمان مرد عورت کے تئیں نیک کام کی توفیق دیویں۔ اور ہر بورے کام سیتی بچاویں اور اس فیقر عماد الدین کے تئیں جو شاہ برہان الدین کا بیٹا ہے اور اُن دونوں کے مائے باپ کے تئیں اور سب مسلمان عورت مرد جیتے موئے کون اپنی کرم سیتی بخشدیویں اور سب کے گناہوں سیتی درگذر فرماویں۔ اور موئے پیچھے اپنے حبیب رسول کی شفاعت روزی فرماویں آمین ثم آمین۔

رباعی

یارب نگہہ عنایت ایدھر کر دو کانٹا ہے عمادؔ تم گُل تر کر دو
ہے رنگ گنہ سیتی رُخ اس کا کالا تم غازۂ عفو سین منور کر دو

تمام ہوا یہ رسالہ صراط مستقیم معروف بہ ’سیدھا رستہ‘ بتاریخ ۲۲ر ربیع الاول شریف بیچ وقت ظہر کے ۱۰۸۱ھ ایکہزار اکاسی ہجری میں۔ ۵ ❖

الحمد للہ کہ ایں رسالہ در مدت دو روز حسب فرمائش اہل خانہ خود در زبان مروجہ دیار خود نوشتہ شدہ کہ مرداں و زناں ناخواندہ را در زبان مادری ایشاں ذریعۂ معلومات ضروریہ دینیہ گردد و برائے من ذخیرۂ آخرت شود ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ٭

حضرت[1] عماد الدین قلندر ۱۰۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ تکمیل تعلیم کے لئے اٹھارہ انیس برس کی عمر میں دھلی گئے۔ اور شیخ عبدالحق دہلوی کے نبیرہ سے علم حدیث کی سند حاصل کی۔ اسی زمانہ میں حضرت سید محمد فاضل قلندر ساڈھوری سے فیض روحانی بھی پایا۔ آپ لاہور بھی تشریف لے گئے تھے۔ پچیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور لاہور کے مدرسے میں دو سال تک درس دیتے رہے۔ پھر ساڈھورے تشریف لے گئے اور حضرت سید محمد فاضل قلندر سے بیعت کی۔ وہاں بھی قیام فرمایا۔ ۱۱۰۴ھ میں پھلواری واپس تشریف لائے۔ ۱۱۲۴ھ میں انتقال فرمایا۔ دو صاحبزادے ایک ہشت سالہ، دوسرے دو سالہ یادگار چھوڑے۔

صراط مستقیم عرف سیدھا رستہ کے اصل نسخے میں یائے مجہول بالعموم یائے معروف کی طرح لکھی گئی۔ چند الفاظ کا طرز املا حسب ذیل ہے۔

اُن = اون۔ اُس = اوس۔ اور = آوُر۔ ناک = ناکھ۔ ہاتھ = ہانتھ
آپ ہی = آپی۔ مٹی = میٹی۔ بہت = بہوت۔ دوسرے = دسر۔ دونوں =

---

[1] تذکرۃ الصالحین مصنفہ محمد حبیب اللہ صاحب عظیم آبادی صفحہ ۱۱۱-۱۱۳ - و تذکرۃ الکرام و رسالہ معارف پھلواری (پٹنہ) بابت شوال ۱۳۳۰ھ ٭

دُونوں - بُرا = بورا - دکھلانا = دیکھلانا - پھر = پھیر -

رسالہ ’سیدھا رستہ‘ کے متعلق مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب کا خیال حسب ذیل ہے :-

”...... کتاب کا سال تصنیف ۱۰۸۱ھ بتایا گیا ہے، اگر مصنف کا سال ولادت ۱۰۶۵ھ سمجھیا کہ مصنف تذکرۃ الصالحین نے لکھا ہے تو ۱۰۸۱ھ میں مصنف کی عمر ۱۶ سال سے زیادہ نہیں ٹھہرتی، اور یہ بالکل قرین قیاس نہیں کہ گیارہویں صدی میں اس عمر کا کوئی شخص تصنیف کے لئے اُردو کو منتخب کرتا جو اس عہد کی تصنیفی زبان نہ تھی اور صرف نثر ہی نہیں، بلکہ نظم بھی اس زبان میں لکھتا - کتاب کے خاتمے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تاہل کی زندگی اختیار کرنے کے بعد یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے - حالانکہ مصنف کے حالات جو تذکرۃ الصالحین میں درج ہیں ان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کا زمانہ ۱۰۸۱ھ کے بہت بعد ہوگا .. .. اگر یہ واقعی گیارہویں صدی کا لکھا ہوا ہے تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس صوبہ میں نثر و نظم اُردو کا اس سے قدیم تر نمونہ اس وقت تک دستیاب نہیں ہوا .....“

(تعارف معیار، پٹنہ، مارچ ۱۹۳۶ء ص ۷-۶)

میرے خیال میں قاضی صاحب کے شکوک باوزن نہیں - پھلواری شریف میں ہندوستانی بولی کی طرف توجہ ابتدا سے تھی - دراصل صوفی خانوادوں میں تبلیغ حق اور ترویج اسلام کی لگن تھی اور اس غرض کے لئے عام بول چال کی زبان کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا جاتا تھا - کسی نہ کسی کو تو ابتدا کرنی ہی تھی - اب تک کی تحقیقات کے

لحاظ سے حضرت عمادؔ ہی موسسِ اوّل ظاہر ہوتے ہیں - پھر یہ کوئی انوکھی ریت نہ تھی ۔ دکن میں صوفیائے کرام قدیم اُردو میں مذہبی رسالے تصنیف فرما چکے تھے۔ دوسرا شبہ عمر کے متعلق ہے ۔ یہ بھی محض وہم ہے ۔ آپ کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ غیر معمولی طور پر تیز و طبّاع تھے ۔ گھریلو زبان میں مذہبی معلومات کے متعلق مختصر سا رسالہ لکھنا کوئی بڑی بات نہ تھی ۔ آج بھی ۱۶ سال کی عمر میں ذہین افراد ادب و شعر کی تخلیق کرنے لگتے ہیں ۔ اس عمر میں ڈگری کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اچھے خاصے مضامین لکھتے ہیں ۔ تیسری بات تاہل کی زندگی کے متعلق ہے ۔ اس میں بھی کوئی پیچیدگی نہیں ۔ چودہ ۔ پندرہ سال کی عمر میں بھی بعض شادیاں ہو جاتی ہیں ۔ ممکن ہے حضرت عمادؔ کی شادی بھی پندرہ سولہ سال کے سن میں ہوئی ہو ۔ اور آپ نے "حسب فرمائش اہل خانہ خود" رسالہ صراط مستقیم معروف بہ 'سیدھا رستہ' شادی کے بعد لکھا ہو ۔ تکمیل تعلیم کے لئے آپ اٹھارہ انیس سال کی عمر میں دہلی گئے ۔ ۱۱۶۰ھ میں آپ مستقلاً وطن واپس آئے ۔ اس کا بھی امکان ہے کہ دوران تعلیم و ہدایت بھی وطن آتے رہے ہوں ۔ ہوسکتا ہے آپ کی دو شادیاں ہوئی ہوں ۔ میرے خیال میں 'سیدھا رستہ' کی تاریخ تصنیف اور مصنف کے متعلق کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی ۔ کتب خانۂ خانقاہ عمادیہ منگل تالاب، شہر پٹنہ والے نسخہ کے متعلق خود قاضی عبدالودود صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"بظاہر کم از کم ستّر ۔ اسّی برس قبل کا لکھا ہوا ہے ۔" (معیار) ۔ ہر چند کہ رسالے کے خاتمے پر کاتب کا نام درج نہیں لیکن بقول جناب تمنّا پھلواروی ۔ یہ نسخہ

حضرت شاہ وجہ اللہ قلندر (۱۱۸۲ھ-۱۲۱۱ھ) خواہرزادۂ حضرت شاہ نورالحق طپاںؔ پھلواروی کا لکھا ہوا ہے، کیونکہ ان کے خط سے رسالہ 'سیدھا رستہ' کا خط ملتا ہے۔

جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ پھلواری شریف کے صوفیائے کرام نے رُشد و ہدایت اور تبلیغ و ترویج اسلام کیلئے حضرت عمادؔ کے وقت سے مسلسل اُردو زبان کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً حضرات عمادؔ، سجادؔ، آیت اللہ جوہریؔ، نورالحق طپاںؔ، ظہورالحق ظہورؔ، وغیرہم۔ لہٰذا اِس سُنہری زنجیر کی پہلی کڑی کے متعلق وہم و شک میں مبتلا ہونا صحیح نہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ 'سیدھا رستہ' سے قدیم تر نمونۂ اُدب اس صوبہ میں اب تک دستیاب نہیں ہوا۔

حضرت ظہورالحق ظہورؔ ۱۱۸۵ھ تا ۱۲۳۴ھ

حضرت ظہورالحق پُھلواروی کے چار نثری رسالے خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی کے کُتب خانہ میں محفوظ ہیں[1] رسالہ نماز، فضائل رمضان، فیض عام اور کسب النبی۔ ان رسالوں کا انکشاف شاہ غلام حسنین صاحب ندوی پُھلواروی نے کیا۔ ان کے حوالے سے رخشاںؔ ابدالی صاحب لکھتے ہیں کہ "اتنا تو یقینی ہے کہ یہ دونوں رسالے (یعنی رسالہ نماز اور فضائل رمضان) سنہ ۱۲۰۰ھ سے قبل لکھے گئے،

---

[1] اُردو نثر کے ارتقا میں ارباب بہار کا حصہ۔ از رخشاںؔ ابدالی، اسلام پور، پٹنہ۔ (بہار نمبر، ندیم، ۱۹۳۵ء)

کیونکہ یہ اور بعض دوسرے رسالے حضرت مصنّف نے اپنے ایّام طالب العلمی میں لکھے تھے۔ اور آپ پورے سنہ ۱۲۰۰ھ میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔" غرض یہ کہ رسالہ نماز اور فضائل رمضان کا سن تصنیف سنہ ۱۲۰۰ھ سے پہلے ہے۔ فیض عام کا سن تصنیف سنہ ۱۲۲۸ھ ہے اور رسالہ کسب النبی کا سنہ ۱۲۳۰ھ ہے۔

رسالہ نماز کی نثر کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"نماز تہجّد کی بارہ رکعت ہے۔ بعد نیند سے اُٹھنے کے دوگانے دوگانے، پھر دوگانے کے بعد توبہ اور استغفار اور سب کے بعد مناجات اور بعد اس کے خدا کی یاد کرے، بلکہ صبح تک، جو توفیق ملے۔"

رسالہ "فضائل رَمضان" کی ابتدائی عبارت حسب ذیل ہے:۔

"ہلالِ رمضان دیکھ پڑھے اللھم سلمنی من رمضان سلمہ منی اللھم ارزقنا صیامہ وقیامہ وتلاوۃ القرآن بالقلب واللسان۔ ایضاً ہر روز و شب سورۂ اخلاص تین سے بہتر مرتبہ پڑھا کرے۔ حق تعالےٰ اس کے بدن کو جہنّم پر حرام گردانے۔"

رسالہ فیض عام کی طرز تحریر یہ ہے:۔

"اس سال پہلے ہجرت کے کتنے واقعے درپیش ہوئے پہلا تو مسلمان ہونا عبداللہ بن سلام یہودی کا کہ مدینہ میں رہتے تھے اور اپنی قوم میں تھے؛ بمجرد مشاہدہ کرنے شواہد کے خود اور چند یاران کے دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔

دوسرے عہد مواخات باندھنا حضرت نبینا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا درمیان ایک ایک

مہاجر اور ایک ایک انصاری کے۔ تیسرا عہد صُلح کرنا یہودیوں کا قُریظہ اور نضیر اور قنیقاع کے جناب پیغمبر صلعم سے بایں شرط کہ طرفین میں کوئی مددگاری تلک دوسرے کی دشمنوں کی نہ کرے۔ نو دجنگ کرنے کا تو کیا دخل ہے۔ چوتھا مقرر ہونا طریقہ اذان کا واسطے خبردار کرنے نمازیوں کے نماز اور جماعت سے مطابق خواب عبداللہ بن زید انصاری یا عمر فاروق کے بروائت جبرئیل علیہ السّلام نے بھی آکر طریقہ خاص اذان کا تلقین فرمایا۔ وَاللہ اعلم بالصواب "

رسالہ کسب النبی کی غرض مسلمانوں کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ میں نے غالبًا اسی رسالہ کا ایک نسخہ سیّد شاہ تقی حسن صاحب بلخی سجادہ نشین خانقاہ بلخیہ فتوحہ، ضلع پٹنہ کے پاس بھی دیکھا ہے۔ لیکن نام کسب الانبیاء پایا۔ سات صفات کا رسالہ ہے۔ مذکورہ بالا نسخہ کی کتابت ۱۲۶۱ھ میں ہوئی۔ لکھا ہے:-

" مابعد عاصی ظہور الحق عظیم آبادی عفہ اللہ عنہ جو حرفت کے مسئلوں کو اپنے والد ماجد اور اکثر علمائے سفر دیدہ اور عجم گردیدہ اور مکّی و مدنی علمائے کبار کے صحبت دیدہ سے تحقیق کیا اور اس کے جواب میں جو کچھ ارشاد ہوا عوام و خواص کے نفع کے لئے بجنسہ اس تقریر کو ہندی زبان میں لکھدیا۔ الٰہی قبول کر۔ آمین ثم آمین۔

سوال

عوام لوگ جو کھیتی کرنے والے اور کپڑے سینے والے اور بُننے والے اور حرفت کرنے والے پر طعن کرتے ہیں کچھ قرآن و حدیث اصول و فقہ سے بھی اسکی بُرائی ثابت ہے یا نہیں۔ یعنی صاف کہدو اور اجر خدا سے لو۔

جواب

قرآن و حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان حرفتوں کو نبیوں نے کیا ہے۔
اس کو یا اس کے کرنے والے کو جو بُرا سمجھتا ہے وہ مردود ہے۔
انشاء اللہ تعالےٰ جو لوگ اہل سنت والجماعت ہیں کبھی اس کو بُرا نہ سمجھینگے...."
ختم رسالہ پر سرخ روشنائی سے لکھا ہے :۔
"تمام شد بتاریخ یازدہم شہر ذیقعدہ روز چہار شنبہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۲۵۳ فصلی
از خط بندہ تیغ علی بمقام بریول (دربھنگہ) تحریر یافت ؂
رخشاں ابدالی صاحب نے اس رسالہ کے بارے میں لکھا ہے :۔
"آپ ہی کی ایک اُردو کتاب 'کسب النبی' ہے، اس کا سن تالیف ۱۲۳۰ھ
ہے۔ اس رسالہ کی غرض صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کرنا ہے، جو خود نام سے ظاہر
ہے" (ندیم، گیا۔ بہار نمبر ۱۹۳۵ء)
رسالہ کا مختصر اقتباس یوں درج ہے :۔
"بات یہ ہے کہ لوگ ناواقف کاری کے سبب اکثر کسب و حرفت کو کہ
جس کو نبیوں نے کیا ہے ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں، اس کا حال مختصر سا یہاں پر بیان کیا
جاتا ہے کہ لوگ واقف ہو جائیں اور عیب نہ کریں اور سب کوئی حرفت کرکے دکھلاویں۔
اور خوب سیکھیں اور سکھلادیں"
(ندیم، گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ء صـ ۶۳)

حضرت محمد تقی بلخی فردوسی

حضرت محمد تقی بلخی حضرت ظہور الحق کے ہمعصر تھے۔ آپ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ "فاضل کامل علامہ عصر مولوی ظہور الحق دام برکاتہ ..." حضرت بلخی کی کتاب احکام کا قلمی نسخہ مجھے پرافسر ذکی الحق صاحب، بی۔ ان کالج سے ملا۔ اس نسخہ کی کتابت ۱۲۴۸ فصلی (۱۲۵۶ھ) میں شیخ خیرات علی نے کی۔ اس وقت مصنف زندہ تھے۔ لکھا ہے۔ "تمام ہوئی یہ کتاب ترجمہ ہندی تصنیف شاہ محمد تقی بلخی فردوسی مدظلہٗ کے خط خام سے عاصی حقیر سراپا تقصیر شیخ خیراتعلی ولد شیخ نجیب علی انصارے رہنے والے محلہ عالمگنج متعلقہ شہر عظیم آباد حال سکونت موضع ارندہ ضلع شہر مذکور بیچ تاریخ دوازدہم ۱۲ شہر ذیقعد ۱۲۴۸ فصلی ...."

کتاب کی تقطیع ۵" × ۹" ہے۔ ۸۹ اوراق زرد اروِلی کاغذ کے ہیں جا بجا کرم خوردہ۔ کتاب احکام کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بیقیاس واسطے خداوند برتر کے کہ اپنے قدرت کاملہ سے دونوجہان پیدا کیا تو سب کوئی اوسکی یگانگی پر اقرار کریں اور معبود اپنا جانیں اور درود بیحد اوپر افضل انبیاء خاتم پیغمبران محمد رسول اللہ علیہ السلام کے کہ حق نے اونکو سب خلقوں سے برگزیدہ کیا اور واسطے بتانے راہ راست کے بھیجا صلے اللہ علیہ و الہ واصحابہ اجمعین۔ بعد اوسکے کہتا ہے فقیر حقیر سراپا تقصیر محمد تقی بلخی فردوسی کہ اگرچہ یہ

"قلیل البضاعت اتنا استعداد نہیں رکھتا تھا لیکن بموجب فرمانے بعضے شخصوں کے
کہ اوپر فارسے قدرت نہیں رکھتا تھا مثابلات چند کہ جاننا اوس کا ضروریات دین
سے تھا، کتابیں معتبرسے چُن کر کے زبان ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور خوف درازی
کلام سے سند لانا ان اُون کتابوں کا ترک ہوا اور وہ کتابیں یہہ ہیں شرح عقائد فارسے
تصنیف حضرت مولینا مظفر شمس بلخی کے رسالہ شرح عقائد تصنیف صاحب انیس الواعظین
کے شرح اوراد مفتاح الصلواۃ الطبعی الایدمنہ فی الاسلام اوام تصنیف فاضل کامل
علامہ عصر مولوی ظہور الحق دام برکاتہ کے کہ فی الحقیقتہ ایجاز کے اعجاز ہے، اوراد
دہ فصل تصنیف جدّنا حضرت مخدوم حسین العزّ شمس بلخی کے دعائیں اور وردین
اوسکے احادیث صیحہ سے سند ہے اور مقصود القاصدین، پس اگر کسے کو بیچ اس
ترجمہ کے کسے مقام میں شک واقع ہو تو طرف اون کتابوں کے دیکھے اور رفع شک
اپنے کا کری اور نام اس کتاب کا احکام رکھا گیا اور یہہ ترجمہ میں تین کتاب ہے
باب باب اور فصل فصل۔ کتاب پہلی بیچ بیان ایمان کے اور یہہ باب پانچ فصل ہے۔
فصل پہلی بیچ بیان حقیقت ایمان کے فصل دوسری بیچ بیان ایمان لانے ساتھ خدا
کے فصل تیسری بیچ ایمان لانے ساتھ فرشتہ کے فصل چوتھی بیچ ایمان لانے ساتھ
کتابیں خدا کے اور پیغامبرین اوس کے۔ فصل پانچویں بیچ بیان ایمان لانے ساتھ
سوال منکر نکیر اور قیامت وغیرہ کے ...... "

احکام عقاید، ایمانیات، شرح اعمال اور تفصیلِ شریعت کے متعلق ایک عمدہ
کتاب ہے۔ جستہ جستہ چند حوالے اور پیش کئے جاتے ہیں:۔

"ہر عاقل اور بالغ یعنے عورت اور مرد سے جو کے جوان ہو پہلے اوسپر فرض ہے کہ ساتھ خدا کے ایمان لاوے اور ایمان پس جاننان بیچ دل کے ہے کہ یعنے مان لینا اوس چیز کا کہ خدا کنے سے آئی ہے اور اقرار زبان کا بھی شرط ہے واسطے اوس کے ساتھ بیزاری کے ہر دین سے سوائے دینِ اسلام کے۔ پس اگر کوئی کام ایسا کرکر یا کوئی بات ایسی بولے کہ جسمیں انکار یا شرک پایا جائے ایمان اوسکا درست نہیں ہے، اگرچہ نماز پڑھے یا روزہ رکھے نزدیک خدا کے وہ کافر ہے اور حکم کفر پر اوسکے کیا جائے گا"

.......۔" بیع ساتھ شرط فاسد کے فاسد ہے اور وہ بیچ اوسکے نفع ہو بیچنے والے یا خریدار کو اگر مستحق نفع کے ہو یعنی ایسا ہو اور شرط فاسد وہ ہے کہ مناسب عقد بیع کے نہو پس شرط کرنان ملک خریدار کرکے فاسد بیع نہیں ہے کہ مناسب عقد کے ہے ......"

اختتام کتاب کی عبارت ایک دُعا کی فضیلت میں حسب ذیل ہے :-

......" روایت ہے کہ ابوبکر صدیق رضے اللہ عنہ نین فرمایا ہے کہ پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ دو سو برس کی نماز کو اوسکے کفارہ ہے اور عمر خطاب رضے اللہ عنہ نین فرمایا کہ ہم پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ چارسو برس کی نماز گذشتہ اوسکے کفارہ ہو، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہہ نے پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ چھہ سو برس کی نماز گذشتہ اوسکے کفارہ ہو، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نین فرمایا ہے کہ ہمنے پیغامبر صلے اللہ علیہ وسلم

سے سُنا ہے کہ سات سو برس کی نماز گذشتہ اوسکے کفارہ ہو۔ ہارون نے پوچھا یارسُول اللہ عمر ہم سبھوں کی ستّر یا اسّی یا سو ہے اتنا صفت کیونکر ہے فرمایا کہ نماز مای اور باپ اور اقربا بیٹا بیٹی کے اوسکے کفارہ ہو۔ تمام شد ''

معلوم ہوتا ہے کہ کتاب احکام مصنّف کی وفات کے بعد طبع بھی ہوئی تھی۔ رَخشاں ابدالی صاحب لکھتے ہیں :۔

'' اس کتاب کا نام احکام ہے ۔ اس کے مصنّف حضرت سید شاہ محمد تقی بلخی سجادہ نشیں خانقاہ بلخیہ فتوحہ ضلع پٹنہ ہیں ۔ یہ ۱۲۸۳ھ میں مٹیا برج کلکتہ میں مرزا مہدی حسن کے اہتمام سے طبع ہوئی ہے ۔ صفحہ ۲۱۶ پر کتاب تمام ہوئی ہے ۔ اور بعد والے صفحہ پر شاہ یحیٰ عظیم آبادی کے دو قطعے تاریخ فارسی میں ہیں ۔

مصنّف کے صاحبزادہ اور جانشیں شاہ عظیم الدین صاحب نے مصنّف کی رحلت کے چند برس بعد چھپوایا ہے۔ جس کی صراحت اپنے مقدمہ میں انہوں نے کی ہے ۱۲۸۳ھ سال طباعت[1] ہے ۔ لہٰذا متحقق ہے کہ ۱۲۸۳ھ سے چند سال پہلے یہ کتاب لکھی جا چکی تھی ۔ یہ تین کتاب اور چند ابواب و فصول پر مشتمل ہے ، جن میں عقاید ، مسائل فقہیہ اور اوراد و وظائف کا بیان ہے ۔ کتاب کی ابتدائی سطور یہ حاظر ہیں ''

(ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء ، صہ ۶۷)

بعد از آں عبارت نقل کی گئی ہے :۔

---

[1] سال تصنیف بلا شبہ ۱۲۵۶ھ سے پہلے ہے ۔ کیونکہ قلمی نسخہ کی کتابت اسی سال مصنّف کی زندگی میں ہوئی ہے ۔ تفصیل پہلے درج ہو چکی ہے ۔ (اورینوی)

" .... کہتا ہے فقیر حقیر سراپا تقصیر محمد تقی بلخی فردوسی کہ ....

.... کتابوں معتبر سے چُن کر زبان ہندی میں ترجمہ کیا گیا ...... "

معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخہ اور مطبوعہ نسخہ میں قدرے فرق ہے۔ املا کا، جمع و واحد کا اور کچھ اور خفیف فرق۔ مثلاً

قلمی نسخہ	مطبوعہ نسخہ
(۱) اتنا استعداد	(۱) اتنی استعداد
(۲) کہ اوپر فارسی قدرت نہیں رکھتا تھا۔	(۲) کہ اوپر فارسی کے قدرت نہیں رکھتے تھے۔
(۳) مثابلات چند کہ جاننا اوس کا ضروریات دین	(۳) مثائل چند کہ جاننا اُن کا ضروریات دین ....
(۴) ..... کتابیں معتبر سے چُن کر کے	(۴) کتابوں معتبر سے چن کر .....
(۵) ترجعہ کیا گیا۔	(۵) ترجمہ کیا گیا۔

حضرت سیّد شاہ عطا حسین منعمی گیاوی ۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ

رخشاں ابدالی صاحب کتاب "دید مغرب معروف بہ ہدایت المسافرین" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

" اس کے مصنّف حضرت سید شاہ عطا حسین صاحب منعمی قدس سرہٗ گیاوی (۱۲۳۱ھ تا ۱۳۱۱ھ) مصنف "کیفیت العارفین" و "کنز الانساب" (فارسی) ہیں۔

'ہدایت المسافرین' حضرت کا مفصل سفرنامہ حج ہے۔ اس کی تین ضخیم جلدیں تھیں ۔
(۱) سیر الہند، ہندوستان کے مشہور شہروں کے حالات پر مشتمل ' (۲) زایر عرب '
(۳) کیفیت مراجعت۔ کتاب کی تالیف ۱۲۶۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۶۴ھ میں
اختتام کو پہنچی۔ اس کی پہلی جلد 'سیر الہند' کا کچھ حصہ خانقاہ منعمیہ ' رام ساگر' گیا میں
محفوظ ہے ' جو ۳۵۰ صفحات کو محیط ہے۔ اور افسوس ہے کہ بقیہ حصص آج مفقود
ہیں۔ اس کتاب کے کافی اقتباسات' رسالہ گنجینہ (پٹنہ) کے دو نمبروں میں آچکے
ہیں .... " (ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء ص ۶۶)

سیر الہند کی زبان مقفّٰی و مسجّع، رنگین و پُر تصنّع ہے۔ ذیل کے اقتباس سے طرزِ تحریر
کا اندازہ ہوگا :۔

" الحاصل، بادشاہ بہادر شاہ نے چادر اپنے ہاتھوں سے مزار شریف پر
چڑھائی اور پھول کی چادر بھی اس پر رکھی، زآں بعد تقسیم ہوئی مٹھائی، وہاں سے
حاضری مجلس خانہ کی نوبت آئی۔ جس وقت مجلس میں شاہ کالے صاحب لائے
تشریف، اور اُٹھ گئے ان کی تعظیم کو جوان و ضعیف۔ اس وقت خواجہ اکبر علی صاحب
نقیب الاولیا مجھے لاکے شاہ کالے صاحب سے ملائے، مختصر سا کچھ میرا حال سُنائے
کہ یہ بزرگ ہیں، پورب کے رہنے والے مشائخ زادہ۔ باوجود ثروت بکمال عقیدت
زیارت کو آئے ہیں پا پیادہ۔ شاہ صاحب مصافحہ کرکے معانقہ کئے مجھ سے باتپاک
فقیر بھی ملا بہر تعظیم، چوما ان کا دست پاک۔ کرکے مسکین کا اعزاز و توقیر اپنے پہلو میں
بٹھلائے .... "

" .... جب مشائخ ہوئے مجتمع، قوال اپنا اپنا ساز ملائے، غزلیں طرح طرح کی گائے، صوفیانِ عظام وجد و شورش میں آئے۔ اِن چشتیوں کے وجد و شورش کا ابوالعُلائیوں سے نیا دیکھا انداز۔ پیروں کی توصیف کی غزلوں میں، کوئی جھومتے تھے، کوئی روتے تھے بخشوع و نیاز .... "

" ...... القصہ فقیر بحالت وجد نعرہ کرتا ہوا پہنچا بادشاہ کے پاس، مصافحہ کر اُن سے کہا، اے بادشاہ دین پناہ اگرچہ اس غزل کے اشعار و مضمون آپ کے ہیں مقال، اگر غور فرمائے حقیقت میں تو یہ اشعار فقیر مسکین کے ہیں حسب حال۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو ظاہر و باطن بنایا ہے شاہ، اور اس مسکین کی شاہی تو ہے فی سبیل اللہ۔ بہادر شاہ سن کے عاجز مسکین کی تقریر اور معائنہ کر حالت کیفیت فقیر حقیر اس مجلس میں فقیر کے ہوئے معانقہ پذیر، اگرچہ انکے پہلو میں تھے کھڑے ہمنشین و دبیر ...... "

(رسالہ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء، ص ۶۶)

یہ دہلی کی ایک مجلس سماع کا حال ہے، جس میں خاندانِ تیموری کا آخری چراغ بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی جلوہ افروز تھا۔

سیّد محمد اسحٰق عُرف پیر دمڑیا ولادت ۱۲۲۴ف / ۱۲۳۲ھ

مجھے سید محمد اسحٰق عرف پیر دمڑیا کے دو رسالے شاہ مجتبیٰ حسن صاحب رئیس بہار شریف[۱] سے حاصل ہوئے۔ سیّد محمد اسحٰق آپ کے پردادا تھے۔ بہار کے صوفیوں کا یہ خاندان نہایت معزّز و محترم ہے۔ حضرت پیر دمڑیا کے دو رسالے نثر اُردو میں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک کا نام "اصول احکام شرع" اور دوسرے کا "جذبات معینہ" ہے۔

سیّد محمد اسحٰق فاطمی والمرتضوی النسب تھے۔ مذہب "ملّت حنفی مشرب صوفی"۔ آپ شاعر بھی تھے۔ قلمی نسخوں میں آپ کی نظمیں حمد میں، نعتیہ، قصیدے، بزرگوں کی توصیف میں دیگر قصائد، مرثیئے اور صوفیانہ غزلیں بھی ملتی ہیں۔ تخلص فقیر فرماتے تھے۔ حضرت پیر دمڑیا اپنی ولادت کے متعلق لکھتے ہیں:-

"جب میرے بڑے بھائی سید شاہ محمد اشفاق عرف شاہ غوث کو کہ ولی مادرزاد تھے سات برس کی عمر میں معاندوں نے زہر کھلا کے شہید کیا اور والدین کو ہمارے نوید لا ولدی سے نا امید کیا۔ چند عرصہ تک کوئی فرزند دلبند ظہور میں نہ آیا اور فلک کجرفتار نے مژدہ خورمی کا انھونکو نہ سنایا، حکایت لسنوات مخدرات عصمت نین بہت دعا و تعویز کرایا اور اکثر روضہ چلہ پیرونکا منایا، جب ثمرہ اوسکا

---

[۱] محلہ دائرہ، بارہ دری، بہار شریف، ضلع پٹنہ سید محمد اسحٰق عرف پیر دمڑیا کے بیٹے شاہ عطا حسین ان کے بیٹے شاہ رضا حسین و شاہ فدا حسین۔ شاہ مجتبیٰ حسن شاہ رضا حسین کے بیٹے ہیں۔" اوریئوی"

پکھہ نہیں پایا سبھونکا دیہان اپنے پیروں کی طرف آیا۔ جناب دادی و پر دادی صاحبوں نے استخارہ معیّن کیا اور دلمیں اپنے ایہی یقین کیا کہ اگر بعنایات رب العالمین و بہ استمداد غوث العالمین حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین لخت جان چراغ خانماں کا پیدا ہو گا تو اوس کو واسطے زیارت آستانہ کرامت کے اجمیر شریف روضہ منیف میں روانہ کر دینگے اور اس عہد سے اپنے کبھی نہ پہرونگی۔ آخر یہ دعا بدرگاہ خدا مستجاب ہوئی ......" بعد ازیں حکایت کرامت منظوم۔

......" تاریخ پندرہویں شہر صفر المظفر روز چہارشنبہ ۱۲۲۴ھ فصلی یہ کمترین خلایق بندہ نالائق مصنّف پیدا ہوا۔ بہزار ناز و نعمت آغوش والدین میں پرورش پاکر سن بلوغ پہونچا۔ چونکہ پیدائش اسکی بتصرف پیران پیر تہی اس جہت سے اس میں یہ تاثیر تہی کہ ایّام طفولیّت سے اب تک عاشق پیراں رہا..." (جذبات معنیہ)

میں پہلے رسالہ 'جذبات معنیہ' کا مختصراً جائزہ لیتا ہوں۔ پیش نظر رسالہ ناکمل ہے۔ آخر میں ۹ صفحات ہلکے زرد کاغذ کے سادہ چھوڑے گئے ہیں اور چوبیس ۲۴ صفحات لکھے ہوئے ہیں۔ سائز "۵ × "۹ ہے۔ صفحات جابجا کرم خوردہ ہیں۔ یہ رسالہ دو اور مطبوعہ[1] اُردو رسالوں اور مصنّف کے ایک طویل قصیدہ کے ساتھ مجلّد ہے۔ پہلے قصیدہ ہے، مطلع :

---

[1] پہلے مطبوعہ رسالہ کا نام "چیچک اور مواد چیچک کے ٹیکا اور انگریزی ٹیکا کا حال مفید عام" ہے مطبوعہ گورنمنٹ پریس، الہ آباد۔

دوسرے رسالے کا نام "ایکٹ نمبر ۸ ۱۸۶۹ء بابت ترمیم ضابطہ مقدمات زمیندار اور رعایا کے" ہے۔ مطبوعہ کلکتہ جنوری ۱۸۷۰ء +

ع
کس موںہہ سے حمد خالق اکبر بیاں کروں
اور کس زبانسے منت داور بیاں کروں

۱۴ صفحات سے کچھ زیادہ پر یہ قصیدہ ہے۔ دراصل یہ قصیدہ درقصیدہ ایک ہی بحر و ردیف اور اہتمام قوافی میں ہے۔ پہلے حمد، پھر نعت، پھر توصیف اہل بیت۔ بعد ازآں وصف خلفائے راشدین اور آخریں پیرانِ طریقت کی شان میں قصیدے ہیں۔ خصوصًا حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ کے مناقب ہیں۔

قصائد کے بعد رسالہ "جذبات معینیہ" شروع ہوتا ہے۔ اس کا آغاز بھی حمد و نعت سے ہوتا ہے :۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد بید شکر بعید ذات رب العالمین   کس زبانسے ہوا واجب اوسکا پایاں کچھ نہیں
شاہ کا گرچہ پتا تم ڈھونڈتے ہو اے فقیر   چشم دل سے دیکھلو در سینہ ہائے عارفین
چاہیئے اب وصف شاہ انبیا و مرسلین   مالک ارض و سما و سالک عرش بریں
وصف جس شہہ کا کرے خود خالق کون و مکاں   کیا لکھے اوسکو فقیر بے نواء کمترین

اَب جانا چاہیئے کہ وجہہ لکھنے اس رسالہ کی یہہ ہے کہ جب اس فقیر بے تدبیر کمترین خلائق بندہ نالائق خادم الفقرائے آفاق شجاعت العشق فقیر زادہ حقیر سیّد محمد اسحاق المشتاق الی الہ عُرف پیر دمڑیا چشتی النظامی والملقب من المرشد معدن الفیض سر خلقہ ابو العرفان مقبول حسین ابو الفیاضی الباری التکوی کو اندوہ دینیہ و جذبات معنیہ متمکن حال ہوا اور کاشانہ ویرانہ سے اپنے طرف دار الخیر حضرت اجمیر نور الہ ارضہ کے

انتقال کیا۔ ابتدائے روانگی سے پھر آنے تک کچھ عجیب وغریب سامان بندہا وگوناگوں کرامات وعنایات وافضال اوس حبیب ذوالجلال کا آپکے حال پر رہا کہ اگر مشروح وادکل کو لکھے تو جلد مطول ہوئے اور حجم بھر نقل نہوئے مگر بعض بعض کرامات عجیب اور وقوعات غریب کہ ہنگام اوس سفر وسیلۃ الظفر کے مشاہدہ اور معائینہ کرتا تھا۔ جس مقام پر ٹھہرتا تھا لکھنے سے اوسی احوالات کے کاغذ بھرتا تھا اور ریک جدول بطور جنتری کے بنا کیا تہا کہ سب حالات اوسمیں لکھا گیا تھا کہ وہ مجموعہ زبان فارسی میں بقید روز و تواریخ و تعداد منازل ہوا تہا۔ سب مریدان راسخ الاعتقاد اور دوستان واثق الاتحاد نے دیکھہ اور سُنکے بہت خوش ہو داد دیا اور یہ فرمائش بصد تاکید کیا کہ اگر اسکا ترجمہ زبان ہندوی میں ہوتا تو خوب تہا بلکہ ہر دلمیں مرغوب تہا کہ وہ سب سُنکے خواہش زیارت کی دلونمیں ہوتی اور یہ کتاب تخم عقیدت کا مزرعہ دلونمیں بوتی۔ ہر چند عذر کیا اور کہا کہ زبان ہندیمیں مجھکو دخل نہیں، یہو تیرے معترض کھینچنگے چناں وچنیں لیکن پر بھی اون لوگوں نے پنچھوڑا، اس عاجز نے بھی اون لوگوں کے کہنے سے مونہہ نموڑا۔ اس لئے خلاصہ حال سفر اور کیفیات منازل وشہر کے لکھا۔ چونکہ جانا اسکا صرف بکشش وغلبات یقینہ تھا نام اوسکا جذبات[۱] معینہ رکھا، تو جو کوئی پڑھے سا تہہ دعا خیر کے اس فقیر کو یاد کرے، اب التماس بیچ خدمت اہل قیاس حق شناس کے یہ ہے کہ اسکے مضامین کو سمجھ لیں اور عبارات غیر فصیح کو خیال نہ کریں بلکہ اگر کوئی الفاظ بے ضابطہ تحریر اور غیر محاورہ تقریر کے دیکھیں تو ساتھ اصلاح کے بار احسان کا مجھہ عاجز پر دہریں .... "

ع[۱] " جذبات معینہ " سرخ روشنائی سے لکھا ہے، جس سے مختلف سرخیاں رسالے کی لکھی گئی ہیں +

یہ رسالہ اجمیر شریف کا سفرنامہ ہے۔ نثر کے بین بین ابیات و اشعار خود مصنّف کے درج ہیں۔ کہیں کہیں پوری کی پوری غزل بھی ہے۔ کلام منظوم کی کثرت ہے۔
" پہلی منزل، حضرت بہآر سے بلدہ عظیم آباد تک کہ سولہ کوس ہے" کے بیان پر رسالہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ آخری الفاظ حسب ذیل ہیں :۔

"........ جب اس عاجز کو بہت مستعد پایا حضرت مرشد سے سارا احوال ..... کا ظاہر کیا اور عزم و ارادہ سے اس احقر کے ماہر کیا"

مصنّف کئی بار اجمیر شریف کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے مگر مقصد پورا نہ ہوا۔ آخرش " روز دوشنبہ تاریخ ساتویں صفر ۱۲۷۱ھ ہجری مطابق چوبسویں کاتک ۱۲۶۲ فصلی روانہ عظیم آباد ہوئے"

سیّد محمد اسحٰق عُرف پیر دمڑیا کا دوسرا رسالہ " اصول احکام شرع " ہے۔ یہ رسالہ فقہ ہندی منظوم کے ساتھ مجلّد ہے۔ سایز ″۵ × ″۹ - کاغذ ہلکا زرد، کرم خوردہ۔ صفحات ۳۱۔ رسالہ کا آغاز یوں ہوتا ہے :۔

" بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اچھی تعریف خدائے پاک کے لئے ہے کہ جسنے یک امر سے وجود نابود دوجہان کا بنایا اور اوسمیں اپنی ساری صفت اور صنعت کر دیکھایا کہ تمامی مخلوقات اپنا پیدا کرنے والا، روزی دینے والا، آفتوں سے بچانیوالا، معصیتوں سے چھوڑانے ہارا جانیں اور اوسکے حکموں کو جان اور دلسے مانیں ...."

...... " اب آگے اس کے جاننا چاہیئے کہ یہ عجیب زمانہ ہے کہ جسمیں وعظ و نصیحت

ایک فسانہ ہے، کیسی کو توفیق دینداری اور ایمان شناسی کی نہیں، اعمال کچھ ہے اور نیّت کہیں اور احکامات شرع کی تلاش کرتے ہیں، آخر سُنی سنائی بات پر چلتے ہیں اور اپنی سمجھ پر مَرتے ہیں اور خوف خدا سے کچھ نہیں ڈرتے ہیں۔ اس جہت سے طور دین مصطفٰی کے چھوڑ کے راہ ضلالت اور ہلاکت میں پڑتے ہیں اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی برباد کرتے ہیں اس واسطے بہہ فقیر بے تدبیر کمترین خلائق بندہ نالائق محمد اسحٰق المعروف پیر دمڑیا چشتی النظامی .... نسب ہاوی الفاطمی والمرتضوی مذہب ...... ملت حنفی مشرب صوفی ... ... واسطے عزیزان اور دوستان کے اکثر کتب ہائے فقہہ سے ان اُصُولوں کو فراہم لاکے رسالہ مختصر کیا اور نام اوسکا ' اصول احکام شرع رکھا ......"

........" جانو اے مسلمانو کہ ہر کام کے واسطے اُصول ہے کہ بغیر آگاہی اوسکے کرنا فرزول[1] ہے، پس اسی طرح سے دس[2] اصول شرع ہیں کہ سب کام اور احکام مسلمانیکے اوسیکے فرع ہیں۔ فہرست اصولات، توحید[1]، ایمان[2]، اسلام[3]، اعتقاد[4]، دین[5]، مذہب[6]، اجتہاد[7]، ملت[8]، اتفاق[9]، اختلاف[10]۔ اور شرع کے معنی راہ روشن ہے، جو کوئی اس راہ پر چلیگا ضلالت اور ہلاکت میں نہ پڑے گا۔"

رسالہ کا اختتام مندرجہ ذیل جملوں پر ہوتا ہے :-

" ... ... اِس لئے رسالہ ہندی کیا کہ ہر شخص کی سمجھ میں آوے، شکر و احسان خدا کا کہ اتمام کو پہونچا۔ اللہ برتر پڑھنیوالے کو توفیق دے کہ مصنّف کو ساتھ دعاء خیر کے یاد کرے، تمام شد۔ نسخہ احکام الشرع من تصنیف شجاعت العشق فقیر....

---

[1] اسی طرح لکھا ہے، فزول = فضول +

حیقر محمد اسحق المعروف پیر دمڑیا چشتی النظامی والابو الفیاضی البہاری التیکوی + "

رسالہ کی تصنیف کی تاریخ کہیں درج نہیں ۔اس رسالہ کی زبان صاف اور رواں ہے ۔اشعار اور ابیات کے بوجھ سے دبی ہوئی نہیں ہے ۔ہاں طرز مقفیٰ کے نمونے جا بجا ملتے ہیں ۔

عالم علی عظیم آبادی (۱۲۵۷ھ)

عالم علی عظیم آبادی نے ۱۲۵۷ھ میں میر محمد تقی خیال کی مشہور کتاب 'بوستان خیال' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے ۔یہ ترجمہ ملخص ہے 'بوستان خیال' سولہ[۱۶] ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ۔اس کے ملخص ترجمہ کا نام " زبدۃ الخیال " ہے ۔" اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ قادریہ خانقاہ اسلام پور (پٹنہ) میں ہے ۔اس نسخہ میں ۳۳۰ صفحات موجود ہیں ، اور آخر کے بقیہ صفحے غائب ہیں ۔ ابتداء میں جو فہرست مضامین ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۴۸۰ صفحوں پر تمام ہوئی ہے ۔افسوس کہ مصنّف کے حالات بالکل تاریکی میں ہیں ۔اس کتاب کی زبان بہت صاف سلیس اور رواں ہے .... " (رخشاں ابدالی ، اسلام پور ۔ ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء ص ۶۳)

" زبدۃ الخیال " کا اقتباس حسب ذیل ہے ۔:

" جب ملکہ مہر افروز زوجہ اورنگ خاں بادشاہ ملک ختا ، کہ حسن تدبیر سے حکیم استقلینوس کے حاملہ ہوئی ۔ بعد نو مہینے کے دختر نیک اختر ، آفتاب صورت ،

ماہتاب سیرت پیدا ہوئی، نام اس کا زہرہ جبیں ختائی رکھا ؎

چہ دختر، اختر برج سعادت ✿ گرامی گوہر درج سعادت

اکتالیس اسباب حُسن کے، جو کُتب معتبرین میں مقرر ہیں، وہ سب اسباب ملکہ میں مجتمع تھے۔ سَر سے پاؤں تک سراپا حُسن، اور تمام عضو اُس کے نُورِ الٰہی سے مجسّم تھے۔ اور جو جو علم و ہُنر کہ بادشاہ زادیوں کو چاہیئے بارہ برس کے سِن میں سب میں لائق و فائق ہوئی۔ جس رات کو ملکہ کی سالگرہ تیرہویں برس کی ہوئی، ملکہ نے لباس مکلف اور زیورات مُرصع پہن کر بستر راحت پر آرام فرمایا۔ عالم خواب میں دیکھا کہ خود ملکہ حمام سے غسل کر، جامہ خانہ میں کپڑے بدل کر، آئینہ خانہ میں گئی۔ اپنی صورت اس کو آئینہ خانہ میں نظر نہ آئی۔ بدلے اس کے شکل و شمائل ایک جوان ماہرو کی دیکھی۔ بمجرد دیکھنے کے تیرِ عشق کا کمان ابرو سے اس کے سینہ پر لگا۔ ملکہ نے شرم سے سر نیچے کر لیا، جب پھر نظر اُٹھائی، تو وہی صورت نظر آئی۔ چاروں طرف اس مکان کے آئینے تھے۔ جدھر نظر کرتی ہے، وہی صورتِ زیبا نظر آتی ہے۔ ملکہ بے اختیار نعرہ مار کر خواب سے اٹھی۔ عشق نے اس جوان کے ملکہ کو بے قرار کیا، عشرت افزا نے چہرہ کو ملکہ کے دیکھ کر دریافت کیا، کہ ملکہ بلاشبہ کسی پر عاشق ہوئی، نہیں تو یہ حالت سوائے عاشقوں کے دوسرے کی نہیں ہوتی ......"

(ص ۲۷۶ - ۲۷۵، نسخہ خانقاہ قادریہ، اسلام پور)

مولوی شجاع الدین علی ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۲ء

مولوی شجاع الدین علی کا لکھا ہوا ایک مطبوعہ مذہبی رسالہ مجھے شاہ مجتبیٰ حسن صاحب کے کتب خانہ' بہار شریف سے ملا۔ رسالہ کے نام کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کی تقطیع ۵" × ۹" ہے۔ صفحات ۹۷۔ کاغذ ہلکا زرد، نہایت کرم خوردہ۔ رسالہ کے آخر میں درج ہے:

"تمام ہوا سولھویں ذی الحجہ اخر ۱۲۵۷ھ ہجری روز جمعہ مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۴۲ء مسیحی میں و بانطباع بشیخ دین محمد متوطن قصبہ چھپرہ کے کمل پایا ؁"

یہ رسالہ رخشاں ابدالی صاحب کی نگاہ سے بھی گذرا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:-

"...... میں ایک مطبوعہ رسالہ کی تفصیلات پیش کرنا چاہتا ہوں جو اسی ۱۲۵۷ھ میں مرتب ہوا ہے، یہ رسالہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے کتبخانہ میں ہے ....

رسالہ کا نام نہ ابتداء میں ہے (سرورق ہے ہی نہیں)، نہ سبب تالیف میں' اور نہ خاتمہ پر۔ یہ خستہ کاغذ کے ۹۵ صفحات پر چھپرہ میں طبع ہوا ہے[1]....."

بعد ازآں رسالہ کے اختتام کا اقتباس درج کیا گیا ہے جو بالکل وہی ہے جو خود میں نے دوسرے نسخہ سے اُوپر درج کیا ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ رخشاں ابدالی صاحب کے مقالہ میں ۹۵ صفحات کیسے درج ہو گئے۔ ایک ہی طباعت کے دو نسخوں میں بھلا ایسا فرق کس طرح ہو سکتا ہے۔ میرے پیش نظر نسخہ میں آخری صفحہ کے سرے پر صاف "۹۷" مطبوعہ ہے۔ غالباً رسالہ ندیم کی کتابت کی غلطی ہے کہ '۹۷' کی بجائے

---

[1] ندیم بہار نمبر ۱۹۳۵ء صفحہ ۶۴ +

۹۵ء چھپ گیا ہے۔ رسالہ کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

" ہوالقادر۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر خلقہ محمد و الہ الطیّبین الطاہرین وعلیٰ اصحابہ حماۃ الدین و ہداۃ الیقین و اتباعہ اجمعین۔ امابعد اگرچہ یہ ہیچمدان شجاع الدین علی ولد حضرت مولانا .... عالم باعمل محقق کامل فاضل عدیم المثل محدث یگانہ فقیہ زمانہ عابد بے ریا زاہد با خدا تارک الدنیا و ما فیہا متوکل علی اللہ حقایق ومعارف آگا مولوی سید تیم اللہ رضوی ترمذی بہاری .... لیکن مثل مشہور چہ نسبت خاک را با عالم پاک کہ الحق عالم ربانی و مرد با خدا و یہ ہیچ میرز مبتلا نہوسات دنیاے فانی بدنام کنندہ نکونامی چند ہے لیکن برکت انفاس متبرکہ اباء کرام وحُسن تربیت و فیضان صحبت والد ماجد علیہ الرحمۃ کے فی الجملہ علوم ضروری صرف ونحو و فقہ وعقاید وعلم کلام واصول دین وتفسیر وحدیث سے بہرہ رکھتا ہے و بایمان حقیقی تحقیقی مانند بزرگانِ خود پیراستہ و عقیدہ تقلیدی سے وارستہ۔ ہے

مذہب عاشق ز مذہب ہا جدا است ؂ عاشقاں را مذہب و ملّت خدا است"....

...... " محبت خدا ورسول و اہلبیت نبوت وتبعیت کتاب اللہ و سنّت، دِین و ایمان ہمارا ہے وتعصب ونفاق و عداوت اہلبیت نبوت کو موجبِ شقاوت دارین وضلالت نشأتین جانتا ہے، سُنّی بے تعصب وشیعہ بے تبرّا مذہب آبائی ہمارا ہے ......"

مولوی شجاع الدین علی کا زیرِ نظر رسالہ جوازِ تعزیہ داری میں ہے۔ یہ ملّا کرامت علی

جونپوری ولد ملّا امام بخش کے رسالہ "قوت الایمان" اور مولوی نعمتؔ علی عظیم آبادی کے خیالات کا پُرزور رد ہے۔ مولوی شجاع الدین علی رسالہ "قوت الایمان" کے متعلق لکھتے ہیں "کہ وہ فی الحقیقت قوت الایمان سارے اہل اسلام کا ہے۔" کتاب کی حیثیت مذہبی اور مناظرانہ ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ :۔

"........ اور خط میاں شاہ عبدالعزیز دہلوی کا کہ جواب میں سوال جواز وعدم جواز مجلس تعزیہ داری کے لکھا ہے اور راقم بھی اوس ایّام میں شاہجہاں آباد میں تھا۔ اُوسّے بھی جوازِ مجلس تعزیہ داری کی ظاہر ہے، بالجملہ بوجوہات مرقومۃ الصدر کے جواز وموجب ثواب ہونے میں اوسکے کچھ شک نہیں۔" (ص۹۷، رسالہ ہٰذا)

مصنف نے اس رسالہ سے پہلے تین اور رسالے رَدِّ نصاریٰ میں لکھ کر شائع کئے تھے۔ انہیں اس کا دُکھ تھا کہ "عرصہ چند مدّت سے غلبہ وتسلط قوم عیسائی نصاریٰ کا مملکت ہندوستان پر یومًا فیومًا ترقی پر ہے۔" (ص۳)، اور "اکثر اشخاص اپنے عقیدہ آبائی سے مرتد ہوگئے ہیں۔"

مصنّف اُس عصر کے مذہبی حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"باین وجہ تمام ملک ہندوستان عمومًا و دارالامارۃ کلکتہ وصوبہ بنگالہ وبہار خصوصًا دارالاباحۃ والضلالۃ ہے کہ کوئی متعرض حال وعقائد ومقال کسیکے نہیں ہے، اسلئے بسبب مطلق العنان ہونے ہر ایک شخص کے کہ کوئی کسیسے باز پُرس نہیں کرسکتا ہے عجب طرح کا خلاف واختلاف اہل اسلام و ہر ایک اہل ادیان وملل ونحل میں ہے۔" (ص۵)

رسالہ زیرِ نظر گو تعزیہ داری کے جواز میں ہے۔ لیکن مصنّف کو دہریوں اور ر

عیسائیوں کے خلاف قلمی جہاد کرنے کی فکر زیادہ تھی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے راجہ رام موہن رائے بنگالی کے خیالاتِ فاسدہ کا جواب بھی دیا۔ لکھتے ہیں:۔

"..... ایک رسالہ حبالہ کفر و ضلالۃ بخلاصہ مذہب وعقیدہ باطلہ دہریہ کے باین مضمون کہ جمیع مذاہب وادیان ہندو ومسلمان ویہود ونصاریٰ وغیرہ مذاہب اہل کفر و اسلام موضوع و مخترع اسی انسان فانی بنیان کا ہے، کوئی مذہب ومشرب خدا کی طرف سے نہیں ہے و سارے مذاہب وعقاید بنائے ہوئے انہیں آدمیوں کے ہیں انہوں نے جھوٹ نسبت اوسکی طرف خدا کے کر دیا ہے وجھوٹ آنا فرشتہ کا ولانا اوسکا حکم الہٰی و توراۃ وانجیل وقرآن واسطے اعتقاد عامہ مردمان کے ظاہر کیا ہے کہ لوگ خدا کے ڈر سے وخوف جزائے دوزخ و بامید آسائش جنت کے اپنے عقیدہ وایمان پر قائم رہیں، خود تصنیف و تالیف کیا۔ لیکن چونکہ جانتے تھے کہ یہ عقیدہ باطلہ اضحوکہ علما وعقلاے وفضلاے کامل کا ہوگا، نظر بر بدنامی واشتہار رسوائی اپنی بنظر عام مردمان ہندو ومسلمان وغیرہ اہل ادیان کے، نام سے اپنے نہ لکھا واوس رسالہ حبالہ کفر وضلالۃ کو بنام بابو رام موہن ایک بنگالی کے کہ وہ ظاہرا علم سنسکرت وعقیدہ براہمو میں مناسبت رکھتا تھا و وہ شخص غیر مقید و اپنے اعتقادات کا بھی پابند نہ تھا و مرد دولتمند تھا، تصنیف کر کے شہرت دیا .... لکھنا جواب کا اوسکے واجب ہوا چنانچہ اوسی ایام میں جواب باصواب اس رسالہ حبالہ کفر وضلالۃ کا بخلاصہ اس مضمون کے لکھا گیا ...." (ص ۷۹)

......" چونکہ بادشاہ وحاکم اس ملک کے عیسائی ہیں اکثر پادریان عیسائی

نے صدہا رسالہ مغالطہ جبالہ کفر و ضلالات بہ ابطال مذہب ہندو   کے لکھہ کر چھاپ
کروا سطے اغواے ہندو و مسلمان کے لوگوں کو بلاقیمت دیتے ہیں و اہل اسلام بسبب
.... و غلبہ عیسائیوں کے کچہہ جواب اوسکا باوجود اسکے کہ وہ رسالے سراسر
لغو بیمعنی و محض مغالطہ ہے نہ لکھا . بنا علیہ پادریوں کو جرات زیادہ ہوئی . اور
انہوں نے کئی رسالہ بدین مضمون کے لکھہ کر چھاپ کر مشہور کیا کہ عقیدہ ہندو و مسلمان کا
محض باطل ہے . اسلئے کہ اکثر رسائل بابطال مذہب ہندو و مسلمان کے لکھہ کر چھاپ کر
مشتہر کیا گیا و حضور میں اکثر علماے نامور مولوی شاہ عبدالعزیز دہلوی و مولوی دلدار علی
لکھنوی کے بھیجا گیا لیکن کسینے کچھ جواب اوسکا نہیں لکھا "

.........." اس لئے ہیچمدان نے ایک کتاب مدلل بابطال و رد مذہب نصرانی
کے و اثبات مذہب اہل اسلام کے تصنیف کرکے بصرف ایک ہزار پانچسو روپے کے
پانچسو نسخہ چھاپ کر لوگوں کو تقسیم کیا و نام اوسکا 'تحفہ مسیحہ' رکھا..." (صـ۱۱ و ۱۰)

مصنف کو یہ احساس بھی تھا کہ وہ وقت فرقہ واری بحثوں کے لئے سخت
ناموزوں تھا . لکھتے ہیں :-

" اس زمانہ میں علما، عقلاے اہل اسلام کو مناسب و ضرور تھا کہ کتب و
رسائل باستحسان و حقیت مذہب اہل اسلام کے عموماً و بابطال و رد مذہب غیر اسلام
کے خصوصاً مذہب عیسائی کے لکھے ...."

" .... یہ تو مقتضائے حال اس زمانہ کے مناسب تھا . برخلاف مصلحت
وقت و برخلاف مقتضائے حال اس زمانہ کے بعضے بعضے مولویان اختلاف جدید درمیان

اہل اسلام کے عموماً ڈالا ہے کہ کئی مولویوں نے رسالے اوپر تکفیر مطلق اہل اسلام تعزیہ دار کے برخلاف طریقہ اہل سنت والجماعت کے لکھا ہے ....." (صہ ۱۴ و ۱۳)

رسالہ کا طرز بیان بڑے بڑے پیچیدہ جملوں سے ترتیب پاتا ہے۔ 'جب' اور 'تب' کی بجائے 'جد' اور 'تد' استعمال ہوتے ہیں اور 'سب' کو 'سبھ' لکھا جاتا ہے۔ زبان میں پُرانے پن ہے۔ کہیں کہیں علامت فاعلی محذوف ہے۔ اور کہیں کہیں فعل کو فاعل ومفعول سے مطابقت نہیں۔ اور چونکہ ایسا کئی جگہوں پر ہے لہذا کتابت و طباعت کی غلطی نہیں کہی جا سکتی۔

میرا خیال ہے کہ مولوی شجاع الدین علی قصبہ بہار شریف کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنے والد صاحب کو "بہاری" لکھتے ہیں۔ اگر یہ نسبت صوبہ بہار کی طرف ہے تو پھر مصنف چھپرہ کے رہنے والے ہوں گے۔ اُن کی کتاب شیخ دین محمد متوطن چھپرہ کے مطبع میں چھپی تھی۔ اس سے زیادہ حال معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی محمد عالم علی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء

مجھے جناب شاہ فخر عالم صاحب، سجادہ نشین خلیفہ باغ بھاگلپور کے کتبخانہ سے ایک مطبوعہ کتاب نثر اُردو کی ملی۔ اس کا نام "دہ مجلس" ہے۔

"دہ مجلس

"تالیف مولوی محمد عالم علی صاحب، سررشتہ دار کمشنری اضلاع بھاگلپور وغیرہ

واسطے پڑھنے محرّم کی مجلسوں میں ۔

احقر العباد حیدر علی و علی حسین نے .... دار الامارۃ کلکتہ، مطبع اخوان الصفا میں، اہتمام سے مولوی عبد المجید صاحب و مولوی کرامت اللہ صاحب کے ۱۲۶۵ھ قدسی کے رمضان مبارک میں، مطابق ماہ اگست ۱۸۴۹ء کے چھپوایا۔
قیمت کتاب یکروپیہ چار آنہ "

چھوٹے سائز کی کتاب ہے تقطیع ½ ۵ × ½ ۷ ۔صفحات ۱۶۰ (ایکسو ساٹھ)۔
'دہ مجلس' کی تصنیف ۱۲۶۱ھ ہجری ہی میں ہوگئی تھی ۔مصنّف لکھتے ہیں ۔۔
"احباب صادق اور مخلصان واثق کی خدمت میں عالم علی عرض کرتا ہے کہ ۱۲۶۱ھ ہجری میں .... زبان ریختہ اُردو میں لکھا ہے ......"

فہرست مضامین 'دہ مجلس' حسب ذیل ہے :۔

"دہ مجلس" کی طرز تحریر حسب ذیل ہے :۔

"الحمد للّٰہ الذی والخ . . . (عربی عبارت) . . . عقلائے عالم وفضلائے بنی آدم پر واضح اور آشکار ہے کہ آدمیوں کا لباس حیات مستعار ہے اور اونکی عمر کی بنیاد نہایت ناپائدار۔ جس گُل نے چمن وجود کے صحرا میں شگفتگی پائی ہے بے شک صَرصَر فنا سے پژمردہ ہوا اور جسنے کشور زندگانی میں قدم رکھا اوسنے بالضرور متاع جان متقاضی اجل کو سونپا۔ چونکہ ایّام غم انجام عاشورہ محل ماتم و بکاہے اسواسطے دو کلمہ وفات کے حال میں حضرت سیّد کائینات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے لکھا جاتا ہے کہ . . . ."

". . . . . . ایکدن رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی علیہ السّلام کے زانو پر سر مبارک رکھ کر آنکھیں بند کرلیں اور چہرہ نورانی کا رنگ متغیر ہوگیا۔ فاطمہ زہرہ نے کہا واابتاہ، کچھ جواب ندیا پھر کہا باباجان ذرا آنکھ کھولئے اور کچھ مجھ سے بولئے۔ حضرت صلعم نے فاطمہ زہرا کو بیقرار دیکھ کر پاس بُلایا اور اپنے سینے سے لگا کر فرمایا خداوندا فاطمہ کو صبر دے۔ اتنے میں حسنینؑ آئے۔ رخسار سے سینہ مبارک پر ملتے

تھے اور رو رو کر کہتے تھے، اے پدر بزرگوار آپ کی مفارقت سے ہمارا کیا حال ہوگا اور تمہارے بعد ہمارے ماں اور باپ کی غمخواری کون کرے گا۔ ازواج مطہرات اور اصحاب کے رونے سے زمین اور آسمان کانپا تھا۔ حضرت صلعم نے فرمایا، لوگو صبر کرو اور دو دن جبرئیلؑ عیادت کے واسطے رسول صلعم کے پاس آئے اور مزاج کا احوال پوچھا، فرمایا، بہت ناساز ہے۔ تیسرے دن پھر آکر عرض کی، یا رسول اللہ حق تعالےٰ نے آج ملک الموت کو حضور میں بھیجا ہے، اگر اجازت ہو تو خدمت میں حاضر ہو، حکم ہوا آوے۔ جبرئیلؑ ملول و محزون الوداع الوداع کہتے ہوئے اُٹھے اور کہا پھر اتفاق دُنیا میں آنیکا نہوگا۔ الغرض ملک الموت نے پکارا کہ اگر اجازت ہو تو گھر میں آؤں۔ اسوقت فاطمہ زہرا حضرت صلعم کے سرہانے بیٹھی تھیں، جواب دیا کہ رسول خدا شدائد مرض میں مبتلا ہیں ملاقات نہوگی۔ پھر اذن طلب کیا، وہی جواب پایا۔ تیسری بار ایسی آوازِ مُہیب سے اجازت چاہی کہ سُننیوالوں کا بدن ہیبت سے کانپنے لگا۔ حضرت صلعم نے آنکھ کھولکر پوچھا کیا حال ہے؟ فاطمہ زہرہ نے عرض کی ایک اعرابی دروازے پر کھڑا ہوا آپکی رخصت چاہتا ہے۔ ہر چند عذر کرتی ہوں نہیں مانتا۔ آپ نے فرمایا، اے فاطمہ یہ ملک الموت ہے۔ مٹانیوالا لذتوں کا، توڑنیوالا راحتوں کا، یتیم کرنے والا فرزندوں کا، بیوہ کرنیوالا عورتوں کا۔ حضرت فاطمہ زہرا رونے لگیں۔ سیّد المرسلین صلعم نے فرمایا، اے جان پدر مت رو، تیرے رونے سے حاملان عرش روتے ہیں ......" (مجلس اوّل)

اندازِ بیان صاف، سلیس، واضح اور پُراثر ہے۔ مجلسیں نثر میں لکھی ہوئی ہیں

اور اختتام پر نوحے درج ہیں، جو مصنّف کے ہی منظوم کئے ہوئے ہیں۔ تخلّص عالؔم ہی رکھا ہے۔ ایک نوحہ درج ذیل ہے۔

ابن علی حیدرِ کرار واحسین　　سبطِ نبیِ احمد مختار واحسین
زیب کنار فاطمہ زہرا تھی ذات پاک　　دُرج نبی کے تھے دُرشہوار واحسین
تھے مجمعِ فضائل و بحرِ علوم دین　　علم الیقین کے واقف اسرار واحسین
توصیف جسکے چہرکی وَالشمس ہو سکے　　آغشتہ خاک وخوں میں وہ رخسار واحسین
جس زلف مُشکبار کی والیل ہو صفت　　آلودہ خاک اوسکا ہو ہر تار واحسین
وہ حلق جو تھا بوسہ گہہ ختم مرسلین　　چل جاوے اوس پہ خنجر و تلوار واحسین
لعلِ لب اونکا خشک ہوا تشنگی سے ہائے　　ہیں آنکھیں اس اَلم سے گہربار واحسین

عالؔم کا دل اَلم سے ہوا بسکہ بے قرار
کہتا ہے رو رو ہر گھڑی صدبار واحسین　　(نوحہ، ص۱۳۳)

حیدری

شاہ فخر عالم صاحب (خلیفہ باغ، بھاگلپور) کے کتب خانہ میں ایک اور مطبوعہ کتاب مجالسِ محرّم کے متعلق ہے۔ ٹائپ نستعلیق سے مشابہہ۔ اس کتاب کی ابتدائی اور آخری حصّے موجود نہیں ہیں۔ موجودہ حالت میں کتاب صفحہ دس۱۰ سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ دو سَو چالیس۲۴۰ پر ختم ہو جاتی ہے۔ ابتدائی صفحے کے سَرے

پر لکھا ہوا ہے "مجالس چہلم"۔ "دہ مجلس" اور "مجالس چہلم" کی ترتیب ایک جیسی ہے۔ مجلسیں نثر اُردو میں لکھی ہوئی ہیں اور اختتام پر نوحے درج ہیں۔ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ "مجالس چہلم" کا مصنّف کون تھا اور یہ کتاب کہاں طبع ہوئی۔ ممکن ہے دونوں کتابوں کے مصنّف مولوی محمد عالم علی ہی ہوں۔ لیکن "مجالس چہلم" کے نوحوں میں تخلص حیدری استعمال ہوا ہے اور "دہ مجلس" میں عالم۔

تخلص کے فرق سے اس طرف خیال جاتا ہے کہ "مجالس چہلم" کے مصنّف کوئی اور بزرگ ہوں گے جن کا تخلص حیدری تھا۔ اغلب یہ ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔

"مجالس چہلم" کی طرز تحریر حسب ذیل ہے :۔

"جذبات جگر سوز کے لکھنے والوں اور روایات غم اندوز کے بیان کرنے والوں نے اس احوال جاں گزا اور اس ماجرائے ہوش ربا کو صفحہ دل پر قلم آہ سے یوں رقم کیا ہے کہ ماہ محرم کی دسویں تاریخ صبح سے لیکر ظہر تک حضرت امام حسین علیہ السلام کے جتنے بھائی بھانجے بھتیجے تھے سوائے جناب علی اصغر و حضرت زین العابدین اور جناب امام حسین علیہ السلام کے دشت کربلا میں جام شہادت پی کر سیراب ہو چکے تھے۔ درجہ شہادت کو پہنچ چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان سب شہیدوں خدا رسیدوں کی خاطر اتنی بے حواسی و بے طاقتی خیمہ اہل بیت رسالت میں کسی کو نہ ہوئی تھی، جس قدر آہ و زاری حضرت امام حسین علیہ السلام کے ذوالجناح پر سوار ہونے کے وقت ان بی بیوں پردہ عصمت و عفت کی بیٹھنے والیوں نے کی ..." (ص ۱۹۵)

"مجلس چہلم" کا ایک اختتامی نوحہ درج ذیل ہے :-

" سنتا نہیں فریاد یہاں اس گھڑی کوئی ——— مجھ کو کھ جلی کی
دیتی ہوں کھڑی کب سے محمدؐ کی دوہائی ——— ہے ہے علی اصغر
اے حیدری اب تاب کہاں کیونکہ لکھیں ہم ——— اس دکھیا کی زاری
جسطور سے کہتی تھی وہ قسمت جلی مائی ——— ہے ہے علی اصغر
انا للہ وانا الیہ راجعون " (صا۲۰)

مولانا محمد احسن گیلانی (۱۲۶۶ھ)

مولانا محمد احسن صاحب مرحوم گیلانی ضلع پٹنہ کے رہنے والے، مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کے مدرس اوّل تھے۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم، پرافسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے مولانا محمد احسن گیلانی کے ایک اُردو رسالہ کا انکشاف کیا اور اسے بہار میں "اُردو نثر کی پہلی کتاب" کی حیثیت سے رسالہ ندیم، گیا، بہار نمبر ۱۹۳۳ء میں پیش کیا۔ اس رسالہ کو مصنّف نے بہ زمانۂ تحصیل علم بنارس میں تحریر کیا۔ خود مصنّف فرماتے ہیں :-

" اب اوپر دانشمندان خبیر و روشن دلانِ صافی ضمیر کے پوشیدہ نہ رہے کہ خادم الطلبہ محمد احسن ولد سید شجاعت علی رہنے والا متصل صوبۂ بہار کا بارادہ تحصیل علم آوارہ از وطن ہو کر ۱۲۶۶ھ میں وارد شہر بنارس تھا " اور خاتمہ کی عبارت

یوں ہے :-

"تمام شد ایں کتاب در شہر بنارس ماہ صفر ۱۲۶۶ھ"

مولانا مناظر احسن مرحوم لکھتے ہیں کہ :-

"صوبۂ بہار میں اس سے پیشتر کوئی کتاب نثر اُردو زبان میں غالباً نہیں لکھی گئی"

"اُردو زبان کے اس قدیم دور میں ان حقائق و اسرار، معارف و نکات کے موتیوں کو اس کے صفحات میں بکھرا ہوا پایا"

...." اسلام کی جدید ذہنی ضرورتوں اور آیندہ پیش آنے والے عقلی و علمی خطروں کو بھانپ کر سارے ہندوستان میں بھی اُس وقت تک شاید کوئی کتاب اُردو زبان میں تصنیف نہ ہوئی تھی"

مقالہ نگار کے بیان سے مصنّف کے موضوعِ سخن کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس کہ مولانا مناظر احسن مرحوم کا مقالہ ناتمام رہا۔ اس لئے کتاب کے متعلق تفصیلی علم حاصل نہ ہوسکا۔ ادارہ ندیم نے لکھا تھا کہ :-

"کتاب پر تفصیلی تبصرہ جو مولانا ممدوح نے فرمایا ہے نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہار نمبر کے محدود صفحات میں اتنی گنجائش نہیں۔ اس لئے یہ مضمون یہیں پر ختم کر دیا گیا ہے۔ ہم مولانا ممدوح سے اس اختصار کے لئے معافی چاہتے ہیں اور ناظرین ندیم کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ کسی اور نمبر میں بقیہ مضمون کا مطالعہ فرمائیں گے" مجھے بہت تلاش و جستجو پر بھی بقیہ مضمون اور قلمی رسالہ نہیں مل سکا۔

مولانا ولایت علی زبیری صادقپوری متوفی ۱۸۵۴ء

اسلامی تہذیب وتمدّن کی قماش کا بہت بڑا حصہ مذہبی ہے۔ ملّت اسلامیہ کی ثقافت کی بُنیاد ہی دینی ہے اوراس کے دنیاوی ڈھانچہ کے پیچ وخم میں بھی مذہب کی میخیں لگی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی کلچر کے ہرشعبہ میں مذہب کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ ادبیات اسلامیہ میں ہرطور پر مذہبی محرّکات کی جلوہ گری ہے۔

اُردو زبان واَدب کی پیدائش وارتقا میں ہندومُسلم کلچر کی آمیزش ہے۔ اس کے مُسلم حصّہ میں بھی اسلامیّت کے ساتھ ساتھ عجمیّت وہندیّت کے واضح نقوش ملتے ہیں، اورہندو حصّہ میں ہندیّت کے روشن خدوخال کے ہم پہلو اسلامی عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ اُردو ادب کے آغاز کے وقت نظم میں عجمیّت اورہندیّت کے اثرات زیادہ گہرے پڑے ہیں اورنثر میں اسلامی اثرات زیادہ۔ دکن اورشمالی ہندوستان کے صوفیوں کے مذہبی رسالوں کے علاوہ قصّہ کہانیوں میں بھی اخلاقی ومذہبی مقصدیّت موجود ہے اس امتیاز کو سمجھنے کے لئے ملّا وجہی کی مثنوی قطب مشتری اورقصہ سب رس کا تقابلی مطالعہ رہ نمائی کرے گا۔

بہار کے اُردو نثری اَدب کے آغاز میں بھی اسلامی مذہبیّت کا تیز رنگ دکھائی دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بہار کی ابتدائی اُردو نثر اسلامیّت کے تاروپو سے ہی بُنی گئی ہے۔ صوفیائے کرام اوراہل درد علماء نے ترویج وتائید اسلام کی

خاطر مختلف مذہبی رسالے لکھے۔ قدیم بہار کی ادبی روایتیں بھی کچھ ایسی ہی ہیں۔ بودھ بھکشوؤں نے مذہبی اور اخلاقی محرکات کے تحت مذہبی لٹریچر اور اخلاقی ادب پالی پراکرت میں پیش کیا تھا۔ بہاری صوفیا بہاری بھکشوؤں کی طرح سبزہ زار ادب میں بھی اپنا زعفرانی جامۂ مذہب پہنے ہوئے خوش خرام ہوتے ہیں۔

علمائے صادق پور نے بھی اردو نثر کی تخلیق میں بہت بڑا حصّہ لیا ہے۔ صادق پور نہ صرف بہار بلکہ سارے ملک کی مذہبی و سیاسی تاریخ میں ایک غیر فانی اور اہم نام ہے۔ صادق پور (عظیم آباد) ایک احیاء، ایک تحریک، ایک تنظیم کا مرکز تھا جو ہند گیر وُسعت و اہمیّت رکھتی تھی، اور چونکہ یہ ایک عوامی تحریک تھی اور زمانہ نے نئی کروٹیں لی تھیں علمائے صادق پور نے اپنا ذریعۂ پیام اُردو کو بنایا۔ لارڈ آکلینڈ کی حکومت کے زمانہ میں (سنہ ۱۸۳۷ء) عدالتوں اور سرکاری محکموں سے فارسی زبان کا رواج اُٹھا دیا گیا۔ خاندانِ ولی اللّٰہی نے بھی قرآن شریف کے اُردو ترجمے بجائے فارسی تراجم کے عامۃ المسلمین کے سامنے پیش کئے۔ لہٰذا علمائے صادق پور نے بھی اپنے مذہبی رسالے اُردو ہی میں لکھے، نیز حضرت سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور تفاسیر کے نکتوں کو اُردو میں منتقل کیا۔ اُردو ادب کو صادق پوری تحریک سے بیش بہا فائدہ پہنچا کیونکہ یہ مُنظّم اجتماعی کوشش تھی اور عوامی میلانات کی حامل۔

صادق پوری رسالوں کے موضوعات و مقاصد کو سمجھنے اور صاحبانِ رسائل

- شاہ عبدالقادر متوفی سنہ ۱۲۴۲ھ نے قرآن شریف کا پہلا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ با محاورہ ہے۔ دوسرا ترجمہ آپ کے برادر مکرم شاہ رفیع الدین نے کیا۔ یہ تحت اللفظ ہے +

کے ثقافتی محرکات کو جاننے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صادق پوری تحریک کے سلسلوں کے متعلق مختصراً کچھ بیان کیا جائے۔

مُغلیہ عہد میں خالص اور ٹھیٹھ اسلام پیش کرنے کی سعیٔ مشکور حضرت احمد سرہندی مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہوئی۔ اُس دَور میں ہند اسلامی تہذیب وتمدّن کی ذیلی وثانوی سطحوں کے علاوہ اسلامی عقاید وافکار کے مرکزی طبقات میں بھی عجمیٔ وہندی ملاوٹ شدّت سے ہونے لگی تھی۔ ایک مذہبی تہذیب کے حواشی پر دوسری تہذیبوں کی آمیزش وامتزاج کو اُس حَد تک برداشت کیا جا سکتا ہے جو مرکزی اُمور کو خطرے میں نہ ڈالے۔ لیکن ایک مذہبی ثقافت اپنی بُنیادوں اور اپنے دائرۂ خاص میں کسی قسم کے امتزاج وترکیب کو بہ رضا و رغبت قبول نہیں کرتی۔ عہدِ مُغلیہ میں بالعموم ہند اسلامی کلچر کے غیر اسلامی عناصر خطرناک طور پر بڑھ رہے تھے۔ دورِ جہانگیر میں حضرت سرھندیؒ نے اسلامی وحدانیّت ووَحدت کی تجدید کی پُرزور کوشش فرمائی اور دورِ احمد شاہ میں حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے اسلامی سیرت اور صحیح اسلامی سماجی سیاسی اور اقتصادی فضا پیدا کرنے کی جدوجہد کی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ بارہویں صدی کے مجدّد تھے تو حضرت سیّد احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی ہجری کے مجدّد ومامور تھے۔ حضرت بریلوی کا سلسلہ حضرت محدّث دہلوی سے براہ راست ملا ہوا ہے۔ مولانا ولایت علی کے رسالہ شجرۂ باثمرہ میں آپ کا شجرہ یوں پیش ہوا ہے:-

---

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ' از حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ +

"...... عارف رموز خفی وجلی حضرت مولینا ولایت علی ومولینا عنایت علی ومولینا فرحت حسین ومولینا شاہ محمد حسین قدس اللہ اسرارہم - خلیفہ امیرالمؤمنین امام اوحد حضرت سید احمد مجدد مائۃ ثالثۃ عشر ما زالت برکاتہم - خلیفہ سند المحدثین خاتم المفسرین حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ - خلیفہ حجۃ اللہ علی العالمین قطب الملۃ والدین شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ - خلیفہ حضرت والد بزرگوار خود حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم قدس سرہٗ +" (ص ۹۲)

صادق پوری تحریک کا تعلق حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت وتحریک سے تھا - آپ نے مسلمانوں کی اصلاح اور تبلیغ اسلام کے اہم فرائض کی طرف ایک مامور کی حیثیت سے توجہ کی - ۱۲۳۳ھ کے قریب حج کو جاتے ہوئے سید صاحب کا قافلہ عظیم آباد، پٹنہ وارد ہوا - آپ براہ کلکتہ حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے - مولانا سید ولایت علی کی تحریک سے صادق پور، پٹنہ کے چند اکابر مع اپنے متعلقین کے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت سے مشرف ہوئے - ان بیعت کرنے والوں میں سید ولایت علی کے علاوہ ان کے بھائی عنایت علی، مولوی شاہ محمد حسین مولوی احمد اللہ[۱]، ان کے ایک چچا مولوی یحییٰ علی اور ان کے والد مولوی الٰہی بخش، ساکنان صادق پور تھے - یہ سب بزرگ خود بھی علم وفضل کے مالک تھے - ۱۲۳۹ھ میں حضرت سید احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قافلہ پانچ چھ سو مریدوں کے ساتھ حج سے واپس ہو کر

۱؎ حکیم عبد الحمید صاحب پریشاں کے والد ماجد - حکیم صاحب علامہ عظیم الدین احمد مرحوم صدر شعبہ جات اُردو، فارسی، عربی - پٹنہ کالج کے نانا تھے +

پٹنہ وارد ہوا۔ حضرت بریلویؒ نے اس دفعہ صادق پور میں قیام کیا اور علماء صادق پور کے سارے خاندان حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے[1]۔ آپ نے مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولوی شاہ محمد حسین کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا اور پنجاب کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لئے ضروری سامان فراہم کرنے کی تاکید کی۔ جب سید صاحب کا قافلہ روانہ ہوا تو مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی بھی ساتھ ہو لئے۔ کچھ دنوں بعد حضرت نے پنجاب کے سکھوں سے جہاد کرنے کے لئے راجستھان، سندھ، بلوچستان، ایران و افغانستان کا سفر فرمایا۔ ہندوستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں وارد ہوئے اور اُس علاقہ کو سارے کا سارا فتح کر لیا[2]۔ مولانا ولایت علی و مولانا عنایت علی بھی معیت میں موجود تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنی جد وجہد سے بنگالہ و بہار کی ایک بڑی جمعیت فراہم کی تھی اور کثیر رقم بھی جمع کر لی تھی۔ ان کی تنظیم کا صدر مقام صادق پور، پٹنہ تھا ۱۸۲۷ء ۱۲۴۳ھ تا ۱۸۳۱ء کا زمانہ اس جہاد کا دورِ اوّل تھا۔ جو حضرت سید احمد بریلوی رح کی شہادت پر جنگ بالاکوٹ، صوبہ سرحد میں ختم ہوا (۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء) اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعون۔

حضرت اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے اصلاح و تبلیغ کے کام میں بہت فروغ حاصل کیا اور مسلمانانِ ہند میں دیرپا ذہنی و فکری، ایمانی و اخلاقی بیداری و زندگی پیدا کر دی۔ جنگ بالاکوٹ میں شاہ اسمٰعیل دہلوی بھی شہید ہوئے۔ اس جنگ

---

[1] تاریخ مگدھ از فصیح الدین بلخی عظیم آبادی، صفحہ ۱۱۴

[2] تواریخ عجیبہ، موسوم بہ سوانح احمدی، مؤلفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری +

کے بعد تحریکِ احمدی کا سارا کام بگڑتا ہوا معلوم ہوا۔ لیکن علمائے صادق پور کی ثابت قدمی نے بگڑی بنا لی۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی نے نئے سرے سے تنظیم و تبلیغ کا کام جاری کیا اور اپنی جماعت کو اسی قدر طاقتور بنا دیا جس قدر وہ حضرت سیّد احمدؒ کی زندگی میں تھی۔ اس جماعت نے، جو بیشتر بہار کے علاقوں سے جمع کی گئی تھی، پھر خطۂ پنجاب پر چڑھائی کی اور چند سال کے جدال و قتال کے بعد ایک وسیع شمالی مغربی[1] خطۂ ملک پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ سکھوں نے ہزیمت اٹھا کر انگریزوں کا سہارا پکڑا۔ دراصل سکھ اس جماعت کے پے بہ پے حملوں سے کمزور ہو ہی چکے تھے۔ انگریزوں نے پسند نہ کیا کہ ہندوستان کے شمالی مغربی علاقے میں ایک نئی پُرجوش طاقت اُبھرے۔ انھوں نے مجاہدین کو متنبہ کیا اور وہ اُن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے لگے۔ لہٰذا مجاہدین کا ٹکراؤ انگریزی فوج سے بھی ہونے لگا۔ ۴۸ - ۱۸۴۷ء تک سارا مفتوحہ علاقہ مجاہدین کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مولانا ولایت علی اور اُن کے بھائی مولانا عنایت علی گرفتار کر کے پٹنہ بھیج دئیے گئے۔ جہاں ان سے میعادی مچلکے لئے گئے۔ میعاد گزرنے پر دونوں بھائی پھر ستھانہ پہنچ گئے۔ وہیں مولانا ولایت علی نے ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ ان کے جانشیں مولانا عنایت علی قرار پائے۔ انھوں نے سرکارِ انگریزی کے خلاف جنگ کرنے کی بڑی سرگرمی سے تیاریاں کیں، لیکن ناکامیاب رہے۔

۱۸۵۲ء میں پنجاب کے افسران کے ہاتھ میں کچھ ایسے خط پڑے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ راولپنڈی چھاؤنی کے دیسی سپاہیوں کو سرکارِ انگریزی سے برانگیختہ و باغی

---

[1] ہری پور سے کاغان تک اور ستھانہ سے سرحدِ کشمیر تک، دریائے سندھ و دریائے جہلم کے درمیان۔

کرنے کی سازش کی ابتدا پٹنہ سے ہوئی تھی اور وہیں سے مولوی احمد اللہ اور چند دوسرے علمائے صادق پور کے زیر اہتمام روپے، سامان رسد اور اسلحے بغرض جہاد ستھانہ بھیجے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی خانہ تلاشی ہوئی اور ان پر کڑی نظر رکھی جانے لگی۔ ۱۸۵۷ء ۱۸ جون کو مولوی احمد اللہ صادق پوری، مولوی شاہ محمد حسین صادق پوری اور مولوی واعظ الحق ساکن بخشی محلہ نظربند کر دیئے گئے۔ انہیں ولیم ٹیلر کمشنر پٹنہ نے تین مہینے نظربند رکھا۔ ان واقعات کے بعد ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا۔ غدر کے کئی برس بعد ۱۸۶۳ء میں پھر مجاہدین سے انگریزوں کی ٹکر انبیلہ و کوہ سیاہ کے میدانوں میں ہوئی۔ لڑائی کے دوران میں اور اس کے بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ بغاوت کی آگ دھیمے دھیمے سارے ملک میں سلگ رہی ہے، صادق پور میں تحریک آزادی و تنظیم جنگ جاری ہے اور مجاہدین کے قافلے مع سامانِ جہاد سرحد کو روانہ ہو رہے ہیں۔ ملک کے مختلف مقامات میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ صادق پور کے علماء میں مولوی احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولوی یحییٰ علی اور مولوی عبدالرحیم گرفتار کیے گئے۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو بھی گرفتار کیا گیا۔ یہ سب انبالہ بھیج دیئے گئے اور انہیں مقدمہ کے بعد حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی[1] (۱۸۶۴ء / ۱۲۸۰ھ)۔ ۱۸۶۵ء میں مولوی احمد اللہ پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا اور انہیں بھی حبس دوام کی سزا ملی[2]۔ اُن کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی۔ مولوی احمد اللہ اور مولوی یحییٰ علی نے وطن سے دُور جزیرۂ انڈمان میں علی الترتیب ۱۸۸۲ء و ۱۸۸۶ء میں انتقال کیا۔ حکیم عبدالحمید خلف اکبر

---

[1] تذکرۂ صادقہ۔ [2] پٹنہ گزیٹیئر ص ۳۳۔

مولوی احمد اللہ اور اُن کے خاندان پر سخت مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اس داستانِ[1] درد کو انہوں نے اپنی فارسی مثنوی 'فسانۂ جانگداز' میں پیش کیا ہے۔ ؎

مَن بہ تشویش و فکر لیل و نہار

بخت در خواب و فتنہ ہا بیدار

حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک، اہل صادق پور کی نصرت و اعانت اور اس تحریک کے مُسلسل نشیب و فراز پر تبصرہ مقصود نہیں۔ غرض یہ تھی کہ میں اس تحریک کی ارتقائی اور تخلیقی قوت کو پیش کر دوں، تاکہ اس امر کی پوری حقیقت ظاہر ہو جائے کہ تحریکِ احمدیؒ نے اُردو ادب، خصوصاً اُردو نثر کو کافی تقویت پہنچائی۔ ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کالج، کلکتہ بند ہو گیا تھا۔ اس زمانہ سے ۱۸۴۵ء تک اُردو نثری ادب کی دنیا میں خلا سا نظر آتا ہے۔ آخر الذکر سن کے قریب کسی ہندو ادیب نے 'گلِ باصنوبر چہ کرد'، کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا اور رجب علی بیگ سرور نے 'فسانہ عجائب لکھا۔ ۱۸۴۵ء کے بعد بھی سہل و سلیس نثر کی طرف توجہ نہ تھی۔ لیکن سیّد احمد بریلوی کی جماعت نے ہدایت و تعلیم اور ردِّ مخالفین کے لئے سلیس و عام فہم اُردو میں کثرت سے رسالے لکھے اور فارسی سے ترجمے کئے۔ مولوی عبد اللہ نے ہوگلی پریس سے سیّد صاحب کی تصنیف 'تنبیہ الغافلین'، کا اُردو ترجمہ شائع کیا۔ شاہ اسمٰعیل شہید کی 'تقویۃ الایمان'، بزبان اُردو' فرقۂ اہل حدیث میں آج تک متداول ہے۔ اسی سلسلہ میں علمائے صادق پور نے بھی متعدد اُردو رسائل لکھے، جن کا ذکر آگے آئیگا۔

---

[1] معاصر، پٹنہ، جولائی ۱۹۴۹ء، ص ۸۱-۸۳

ان بُزرگوں میں مولانا ولایت علی کی شخصیت بہت اہم تھی ۔

مولانا ولایت علی حضرت تاج فقیہہ مدنی ثم منیری کی نسل میں سے تھے ۔اس طرح آپ کو حضرت مخدوم شاہ شرف الدین احمد منیریؒ سے بھی نسبت حاصل تھی۔[1] مولانا ولایت علی نے حضرت سید احمد بریلوی کی رفاقت میں دین کی بڑی خدمتیں انجام دیں۔ مولانا کے گھرانے میں پیری مُریدی کا سلسلہ جاری تھا۔ مگر حضرت مجدد کی بیعت نے آپکو شریعت وسُنّت کا دیوانہ اور اسلام کا سرفروش مجاہد بنا دیا۔ حضرت احمدؒ کی تنظیم تحریک حریت انسانی اور دعوتِ احیائے اسلام تھی ۔ آپ کو اور آپ کی جماعت کو سکھوں سے اس لئے جنگ کرنی پڑی کہ پنجاب میں مُسلمانوں پر نہ صرف عرصۂ حیات تنگ تھا بلکہ وہ اسلام پر بھی آزادانہ عمل نہیں کر سکتے تھے۔ ہرچند کہ حضرت بابا نانک ایک اسلام دوست صوفی تھے، تاہم اُن کے بعد پنجاب میں ایسے سیاسی حالات پیدا ہوئے کہ مُسلمان خدا کا نام بلند کرنے کے لئے اذان تک نہیں دے سکتے تھے۔ ہر طرف قتل و غارت کی فضا تھی' انسان کی بُنیادی آزادیاں سلب کرلی گئی تھیں ۔ اور ظلم کی انتہا ہو چکی تھی۔ ساری ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی۔ لیکن قانونی طور پر ابتک مغل بادشاہ مَلِکُ الہند تھا۔ انگریز مشرقی اور وسطی صوبوں کو جارحانہ طور پر دابے بیٹھے تھے ۔ مگر ایسٹ انڈیا

---

[1] مولانا ولایت علی کے برادر زادہ مولانا عبدالرحیم نے باشندگان صادقپور کے حالات میں ایک کتاب' الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور' لکھی تھی۔ جس سے بہار کے سادات زبیری وجعفری اور دوسرے وابستہ خاندانوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے +

کمپنی کی حکومت محض نیابت و نظامت کی حکومت تھی اور وہ بھی بالجبر۔ تحریکِ احمدی کے دوسرے دَور میں جب مجاہدین کی انگریزوں سے ٹکرّ ہوئی تو وہ بالکل حق بجانب تھی۔ انگریز بادشاہ نہ تھے۔ اُن کی کوئی اخلاقی و قانونی حیثیت اس ملک میں نہ تھی۔ شمالی مغربی سرحد کا علاقہ کسی منظّم حکومت کا خطّہ بھی نہ تھا۔ وہ یاغستان تھا۔ پنجاب کے صوبہ میں جو مظالم ہو رہے تھے اُن کا سدّ باب مغل بادشاہ کو کرنا چاہیئے تھا لیکن دراصل اُس وقت ملک ہند میں سلطنت برائے نام تھی۔ ایسی صورت میں انسانی آزادی اور حرّیتِ ضمیر کی حفاظت کا فرض ہر باغیرت شخص پر عاید ہوتا تھا۔ حضرت مجدّد کی جماعت نے اس فرض کو ادا کیا اور غاصب و فتنہ پرور کمپنی کی حکومت نے حیلہ جُوئی اور مخاصمت سے کام لیا۔ ایسی صورت میں کمپنی کے سپاہیوں سے جنگ شرعی اور اخلاقی طور پر صحیح و جائز تھی۔ اس جہت سے تحریکِ احمدی آزادئ ہند کی سب سے پہلی ملک گیر عوامی تحریک بن گئی۔ سُلطان ٹیپو اور سراج الدولہ کی جدّوجہد مقامی اور خواصی تھی۔ حضرت سیّد احمد بریلوی کا مقصد تو صرف مسلمانوں کا اخلاقی و روحانی احیاء تھا۔ لیکن تمکنتِ دین کے لئے ہر شرعی کوشش آپ کے اور آپ کی جماعت کے نزدیک جائز تھی۔ اسی طرح آزادئِ ضمیر کے قیام کے لئے سعئ پیہم بھی اس برگزیدہ جماعت کے خیال میں لازمی تھی۔

اب اس جماعت کی خدمتِ اُردو کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ سرِ فہرست مولانا ولایت علی صادق پوری عظیم آبادی کا نام نامی آتا ہے۔ آپ کے مُصنّفات میں فارسی اور اُردو کے متعدد مذہبی رسالے ہیں۔ مثلاً ردِ شرک۔ اربعین فی المہدیّین،

رسالۂ دعوت، تیسیر الصلوٰۃ، شجرۂ باثمرہ، تبیان الشرک، رسالہ عمل بالحدیث وغیرہ۔

مجھے ایک مطبوعہ مجموعۂ رسائل مولوی عبدالغفار صاحب صادق پوری سے ملا۔ اس کا نام "مجموعۂ رسائل تسعہ" ہے۔ اس مجموعہ میں مندرجہ ذیل رسائل شامل ہیں۔

(۱)	ردِّ شرک	(۲)	عمل بالحدیث
(۳)	اربعین فی المہدیین	(۴)	رسالۂ دعوت
(۵)	تیسیر الصلوٰۃ	(۶)	شجرۂ باثمرہ
(۷)	بُت شکن	(۸)	فیض الفیوض
(۹)	تبیان الشرک		

یہ رسالے مولانا ولایت علی وغیرہ بزرگوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ پانچ[۵] رسائل اُردو میں ہیں۔ تین[۳] فارسی میں ہیں اور ایک[۱] عربی میں۔ یہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری کے حسب الارشاد مطبع فاروقی دھلی میں طبع ہوئے۔ سنہ درج نہیں۔ سائز "۶ × "۱۰۔ صفحات ۱۵۶۔ پہلے میں مولانا ولایت علی کے رسالوں کا تذکرہ کروں گا۔

رَدِّ شرک

از تصنیف مولانا ولایت علی صاحب معہ ترجمہ مولوی الٰہی بخش صاحب بہاری۔

بقول مولوی عبدالغفار صاحب صادقپوری یہ رسالہ شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف تقویۃ الایمان کا مختصر اور واضح خلاصہ ہے۔ ترجمہ عام فہم اُردو میں ہے۔ اصل کتاب کی عبارت کو صفحہ کے ایک حصّہ میں اور ترجمہ کو دوسرے مقابل حصّہ میں خط کھینچ کر لکھا گیا ہے۔ اُردو عبارت یوں شروع ہوتی ہے۔

"وہ زبان کہاں ہے جس سے ہادیِ مطلق کا شکر بجا لاؤں ۔اور وہ ہاتھ کہاں ہے جس سے اُس کی تعریف کے لکھنے میں ہمّت کروں ۔اُس خدا نے ہملوگوں کوامواجِ شرک کے ہچکولوں سے بچاکر توحید کے کنارہ پر پہنچایا باوجود اس کے کہ طوفانِ شرک میں ایک جہان ڈوبا ہوا ہے اور میدانِ ضلالت میں ایک عالم سرگرداں ہے۔اور درُود بیشمار اُس سرورِ کائنات کے حضور میں پیش ہے کہ اولادِ آدم کی نجات سوائے اُن کی پیروی کے کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔اور اُن کی آل واصحاب پر جنکی پیروی عین رسول خدا کی پیروی ہے، صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ بعد حمد ونعت کر چند فصل شرک اور اقسامِ شرک کے دفع میں لکھتا ہوں اور اس کا اختتام واحدِ حقیقی سے چاہتا ہوں۔"

اندازِ ترجمہ سمجھانے کے لئے اصل فارسی عبارت بھی درج ذیل ہے۔ ترجمہ کی نہج فارسی اسلوب کے عین مطابق ہے۔

"کو زبانہائے کہ شکر ہادی مطلق بجا آورد و کجا دستے کہ بہ تحریر ثنایش ہمت گمارم کہ مایان را از طلاطمِ امواجِ شرک بر کنارۂ توحید برآوردہ باآنکہ یک جہان غرقہ بطوفان اوست ویک عالم سرگشتہ بہ بیابان او۔ و درود نامعدود بحضور سرورِ کائنات کہ بغیر اتباعش برائے نجات بنی آدم طریقہ دیگر نیست۔ و بر آل واصحابش کہ اتباعش عین پیروی رسول اللہ است، صلے اللہ علیہ وسلّم، اما بعد فصلے چند بدفع شرک واقسامش می گویم وانصرامش از واحد حقیقی میجویم"

پہلی فصل ــ "اس فصل میں ان لوگوں کے اقوال کی تردید ہے۔ جو اللہ کی

کتاب اور رسول کی حدیث سے بذریعہ حیلوں کے منھ پھیرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانی کا کرتے ہیں، اس کا بیان یہ ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قران مجید اور حدیث شریف کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے تمام علوم اور کل کتابیں پڑھی ہیں اور اپنے زمانہ میں علّامہ دہر ہو۔ ایسے لوگوں کے جواب میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے
هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ .... (آیت شریفہ)۔ وہی ہے خدا جسنے بھیجا اَن پڑھوں میں ایک رسول اُنہیں لوگوں میں سے جو پڑھتا ہے اُن اَن پڑھوں پر خدا کی آیتیں اور اُنکو پاک کرتا ہے اور اُنکو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت' یعنی رسول بھی اَن پڑھ تھے اور اصحاب کرام بھی اَن پڑھ تھے۔ باوجود اسکے جب رسول خدا نے صحابۂ کرام کو اللہ تعالےٰ کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو اصحاب سُنکر شرک وفساد سے پاک ہو گئے۔ پس اگر ناخواندہ آدمی قرآن مجید اور حدیث شریف کو نہیں سمجھ سکتا ہے اور استعداد فہم نہیں رکھتا ہے تو بھلا صحابہ کرام نے کیونکر سمجھا اور عیبوں سے پاک کس طرح ہوئے ....." (صـ۳)۔

رسالہ کے چھبیس ۲۶ صفحات اور سات فصلیں ہیں۔

رسالۂ عمل بالحدیث

از تصنیف! مولانا ولایت علی صاحب معہ ترجمہ مولوی الٰہی بخش صاحب رسالہ کی تین فصلیں اور سولہ صفحات ہیں۔ نثر اُردو کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"...... کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دلِ مُردہ رکھتے ہیں اور ظاہر سے باطن تک نہیں پہونچتے ہیں، اپنی اوقات عزیز کو دُنیا حاصل کرنے میں برباد کرتے

ہیں اور ہمت کا قدم غور و تامل کے میدان میں نہیں رکھتے ہیں اور چور کی طرح ہر آشنا و ناآشنا کی تھیلی میں نگاہ ڈالتے ہیں اور اندھوں کی طرح ہر عاقل اور دیوانے کے مونڈھے پر ہاتھ رکھتے ہیں ......" (ص۳۲)

اَرْبَعِیْن فِی الْمَهْدِیِّیْن

از تالیف جناب مولانا ولایت علی صاحب معہ ترجمہ۔ مجموعۂ رسائل تسعہ کے صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۶۳ کے سرے تک یہ رسالہ عربی زبان میں مع ترجمۂ اردو چھپا ہوا ہے۔ غالباً یہ ترجمہ بھی مولوی الٰہی بخش نے ہی کیا ہے۔ نمونۂ تحریر حسب ذیل ہے:۔

" پہلی فصل میں وہ حدیثیں ہیں جو شان میں سارے ہادی من اللہ کے ہیں جو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے پیچھے آویں گے۔ روایت ہے ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ سے، کہا اُن حدیثوں میں کہ یاد رکھتا ہوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ہے کہ بیشک اللہ اُٹھاوے گا اس اُمّت کے واسطے ہر سَو کے سرے پر اس شخص کو کہ نیا کر دکھاوے گا اس امت کو دین اُس کا[1] " (ص۴۶)

رسالۂ دعوت

از تالیف لطیف مولانا ولایت علی صاحب۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور سولہ صفحات پر محیط ہے۔ مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی تصنیف حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ کی زندگی کے اواخر میں یا جنگ بالاکوٹ کے معاً بعد ہوئی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سن تصنیف ۱۸۳۱ء کے لگ بھگ ہے۔ چند

---

[1] ابوداؤد اور مشکوٰۃ، کتاب العلم (حدیث شریف)

اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں :-

" اے اللہ تجھکو سب قدرت ہے، تو ایسا کرم کر کہ اس رسالہ کو سُن کر ہمارے جتنے بھائی مُسلمان ہیں اُن کے دل کے شُبھے اور وسواس سب جاتے رہیں اور گروہ محمدی میں داخل ہو جاویں کہ محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سیدھی راہِ نجات کی اُن کے ہاتھ لگے اور درود ایسے نبی پر اور اُن کی آل واصحاب پر آمین یا رب العالمین - جو لوگ ہوشیار ہیں وے جو کام کرتے ہیں پہلے اُس کے اوّل و آخر ابتدا انتہا کو سوچ لیتے ہیں اور ہر جگہ موافقت و مخالفت لڑنے مارنے میں بے تکلف قدم نہیں رکھتے ۔ اُن کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ بعضے شخصوں کی عادت ہے کہ صاحبِ دعوت کی بات کو اُس کے روبرو قبول نہیں کرتے' ان کے واسطے یہ رسالہ لکھا گیا، کہ تنہائی میں اس کو خوب انصاف اور تامل کی نظر سے دیکھیں، اگر کچھ اپنے کام کا پاویں اور اپنے دین و دُنیا کی منفعت سمجھیں تو اُس پر چلیں، ایسا نہ کریں کہ مارے خفگی کے پورا نہ دیکھیں کیونکہ عاقلوں کا قول ہے کہ بات دُشمن کی بھی سُن لینی چاہئے، پھر اگر پسند نہ آوے تو ماننے نہ ماننے کا اختیار اپنے ہاتھ ہے ...... " (ص ۶۳)

" ...... اس رسالے میں تھوڑا سادہ احوال امام وقت کا ہے کہ جس کی تحقیق کے واسطے حضرت کے حضور میں جانا کچھ ضرور نہیں، بلکہ اپنے شہر و دیار میں جہاں ہووے اُس کو تحقیق و تامل کرے - یہ باتیں موجود پاوے گا لیکن انصاف شرط ہے - احوال امیرالمؤمنین کا حضرت کے پہچاننے کو تھوڑی سی عقل سیدھی اور

تھوڑی سی واقفیت حدیث سے چاہیئے کہ اکثر اولیاء اللہ کو پرتو بعضے انبیاء کا عنایت ہوتا ہے، ہمارے حضرت کو اللہ نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پرتو عنایت کیا اور گروہ پر حضرت کے صحابہ کا پرتو ڈالا کہ لوگوں کے دل میں محبت اتباع سُنت کی اور غیرت ایمان کی حد سے زیادہ ہوئی۔ اللہ کا دین زیادہ ہونے کے واسطے دل بیقرار ہونے لگا، جب بیقراری حد سے زیادہ بڑھی تو اللہ تعالے نے اُن کے دل میں الہام صادقہ فرمانا شروع کیا اور بشارتیں دیں کہ ہم نے تجھکو امام صاحب اقبال اور اولوالعزم کیا اور دین کے بتانے میں اور حکم شرع جاری کرنے میں صاحب تاثیر برکت والا بنایا، اب تھوڑی سی تیری التفات و توجہ میں لوگوں کو ہم بڑے بڑے عمدہ مقام پر ولایت کے پہونچا دیں گے اور تھوڑی سی محنت میں ہم تجھ کو سردار بنا دیں گے۔ اور اکثر ملکوں پر فتح دیں گے۔ اور جو کوئی تیرے ہاتھ پر بیعت کریگا اُس کو میں آپ کفایت کروں گا، اور رستہ دین کا بتاؤں گا، اور دُنیا سے اُس کا دل بیزار کروں گا۔" (ص ۶۴)

"..... پھر جب حق دعوت کا ملک ہندوستان میں ادا ہو چکا۔ تب بطریق اپنے نبی کے تابعین کے ساتھ ارادہ ہجرت کا فرمایا۔ پھر جس مقام پر یہ قافلۂ متبرکہ وارد ہوتا تھا، وہاں کے تمام اطراف کے لوگ صورت دیکھنے بے اختیار ہو کر آتے تھے اور نہایت عقیدت سے بیعت کرتے تھے، باوجودیکہ نہ کبھی کی واقفیت نہ آگاہی، بلکہ زبان بھی اُن کی نہ سمجھتے تھے۔ اسی طرح اللہ نے تمام ہند و خراسان کے لوگوں کو مطیع بیعت کر دیا۔ اس طرح سُنت رسول اللہ کے

مطابق آجتک کسی کو ہجرت کرتے نہ سُنا تھا۔ سُبحان اللہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول کا کیسا پیرو کامل پیدا کیا۔ بعد اُس کے محض اللہ پر توکّل کر کے جہاد شروع کیا .... " (ص۶۵)

" ..... جسکو اللہ جب تک چاہتا ہے چُھپاتا ہے جب چاہتا ہے ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے حضرت کی خلوت کوئی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی سی نہ سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں اُنکے عرصہ بعید گذرے گا۔ یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش میں حضرت کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ عرصۂ قریب میں مثل خورشید درخشاں کے ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوارِ ہدایت سے منوّر فرمائیں گے ....." (ص۶۷)

اس کے بعد اس گروہ کے بیعت کرنیوالوں کا احوال ہے، مخالفوں کا احوال ہے، مولویوں کی دعوت اور مخالف علماء کی حالت ہے، مشائخ کی دعوت اور ان کا احوال ہے، مخالفوں کے دوستوں، اُن کے مُرید اور شاگردوں، دوبارہ بیعت میں مضائقہ کرنیوالوں، فاسقوں اور فاجروں، امیروں، حاسدوں، جاہل غیرت والوں، شیعوں اور خلفاء کے ہاتھ پر بیعت نہ کرنے والوں کی دعوت ہے۔ آخری فصل یوں شروع ہوتی ہے:۔

" بعضے مسلمانوں کا دل بیعت کرنے کو رغبت کرتا ہے۔ مگر انکو یہ خیال ہوتا ہے کہ حضرت دُور تشریف رکھتے ہیں اور کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں دل شرماتا

۱؎ جنگ بالاکوٹ کے بعد یہ شبہ پڑ گیا تھا کہ حضرت سید احمدؒ شہید ہوئے یا بچکر نکلے اور روپوش ہو گئے۔ عین ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو، اور کچھ عرصہ کے بعد جناب کی وفات ہوئی ہو۔ اسے غیبوبت امام کہتے ہیں +

ہے۔حقیقت کو سمجھنا چاہیئے کہ جو شخص بیعت محض اللہ کی خوشی کے واسطے کرتا ہے اور دوسری غرض کوئی نہیں متعلق ہوتی، تو وہ بیعت حقیقت میں اللہ سے ہوتی ہے اور اللہ کا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔قرآن میں یہ خبر مذکور ہے .... اللہ سب کو توفیق دیوے کہ جلد اس گروہ مقبول میں داخل ہو کر دین کے سرسبز ہونے اور اللہ رسول کی رضامندی کی باتیں حاصل کرنے میں شریک ہوویں۔ آمین یارب العالمین +"

تمت

رسالہ تیسیرُ الصّلوٰۃ

از تصانیف مولانا ولایت علی عظیم آبادی ۔یہ رسالہ اُردو میں ہے۔ نو ۹ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ ۷۹ تا ۸۷ ۔نماز اور اقسام نماز کے متعلق ہے۔ طرز تحریر حسب ذیل ہے:۔

"...... خداوند آج اس کو اُمید اپنے اعمالوں کی اور تدبیر کی بالکل جاتی رہی ۔محض بے اختیار ہے ۔تو جیسا چاہے ویسا کرے۔ ہم تجھ کو سپرد کرتے ہیں۔تو محض اپنے کرم سے اس کو بخش دے ......" (ص۸۷)

رسالۂ شجرۂ باثمرہ

مؤلفہ مولانا ولایت علی ۔صفحہ ۸۸ تا ۹۴ ۔یہ رسالہ صحیح طریقۂ تصوّف کے متعلق ہے۔ طرز بیان درج ذیل ہے:۔

"...... نادانوں کے خیال میں یہ بات جمی ہے کہ جب تک مُرید نہیں ہونگے

ہمارے گناہوں کی پوچھ ہم سے ہووے گی۔ بعد اسکے اگلے پچھلے سارے گناہ پیر بخشوالیں گے۔ اور قیامت میں اُنکے جھنڈے تلے جانے سے کوئی ہمارے گناہ ہم سے نہ پوچھیگا۔ بلکہ ہمارے پیر سے پوچھیں گے۔ وے جو کچھ جانیں گے بتا دیں گے۔ ہمکو اتناہی چاہیئے کہ پیروں کی جناب میں اپنا اعتقاد مضبوط رکھیں۔ غرض پیر کو عاقبت کا گدھا، گناہوں کا بوجھ اُٹھانے والا ٹھہرایا ہے۔ اس خیال سے شجرے کو اپنا ایمان جانتے ہیں، اور اسکی تعظیم حد سے زیادہ کرتے ہیں ؎ (ص۸۵)

"...... یوں سمجھئے کہ کوئی کسی کا عذاب بلکہ کسی کے سَر کا درد بھی اپنے سَر میں لے نہیں سکتا۔ کوئی کسی کے بدلے نہیں پوچھا جاتا۔ ایک دن باپ دادے، پیر اُستاد سب سامنے سے آنکھیں چُراویں گے۔ آخر جس کا خون اُسی کی گردن ہو جاوے گی۔ اور ہر مرید کو شجرہ اپنے پاس رکھنا کچھ ضرور نہیں۔ پیرزادے جو ہر سال شجرہ پڑھوانے کی تاکید کرتے ہیں۔ اُن کی غرض ہر سال کچھہ کھانے کمانے کی ہے۔ اُن کا قول مشہور ہے کہ بُرا کھیت مولی کا کہ ایک دفعہ اُکھاڑنے سے میدان ہو جاوے۔ بھلا کھیت ساگ کا یوں جوں کاٹو، توں توں بڑھے ؎

تبیان الشرک

مصنفہ، مولانا ولایت علی۔ صفحہ ۱۴۲ تا ۱۵۶۔ رسالہ ردِّ شرک، بزبان فارسی لکھا گیا تھا۔ چند فصلوں کے اضافہ کے ساتھ یہ رسالہ عوام کے سمجھنے کے لئے اُردو میں لکھا گیا۔ جا بہ جا حضرت سعدیؒ کی طرح مضامین کو نظم میں بھی ادا کیا ہے۔ اندازِ بیان درج ذیل ہے :-

" بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵ اللہ ہمارا بہت دور ہے شریکوں سے، اگرچہ لوگ اپنی عقل میں آدم مشت خاک کو اس مالک عرش و افلاک کا شریک جانتے ہیں، اور اس غبار نا پائدار کی تعظیم برابر اس پاک پروردگار کے کرتے ہیں کہ جس کام میں نبی اور ولی کو دخل نہیں اور جس کے حکم میں فرشتوں کو دم مارنے کی طاقت نہیں۔ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ یعنے جس کام کا ارادہ کرے اس کو کر ہی کے چھوڑے اور کسی کے روکنے سے نہ رکے۔

۵۔ بڑے چھوٹے ہیں سارے بے اختیار جو چاہے کرے میرا پروردگار

رسالہ بدعت (تقریر بر بدعت)

از مولانا ولایت علی ۔ مطبوعہ کلکتہ ۔ ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ یہ رسالہ مجموعۂ رسائل نسخہ میں نہیں ۔ مولوی عبد الغفار صاحب صادق پوری کی کی ہوئی ایک نقل از اصل مجھے آپ کے فرزند محمد اسمٰعیل سے ملی ۔ نمونۂ نثر حسب ذیل ہے :۔

" سبب تحریر ۔ بعد اسکے سُنا چاہیئے کہ کتنے لوگ صراط مستقیم[۱] پر بلکہ جناب امام حضرت سید احمد صاحب پر اعتراض اور نسبت بدعت کی کرتے ہیں وجہ یہ کہ مولانا اسمٰعیل علیہ الرحمۃ کا رسالہ جس کا نام ایضاح الحق ہے بدعت کے باب میں فارسی زبان میں جو تصنیف فرمایا اس کے سمجھنے کی اکثر لوگوں کو لیاقت نہیں، اس سبب اس عاجز سے بدعۃ کے باب میں آکر پوچھتے اور تنگ کرتے ہیں اس واسطے ہندی زبان میں تھوڑی سی تقریر بدعۃ کی جو آسان اور سہل اور سوا تقریر مولانا ممدوح کے ہے لکھ دیا کہ ہر کسی کے سمجھ میں آوے اور آیت سے اسکو مدلّل کر دیا ۔ سیدھی سمجھ والے کو بہت

۱؎ از شاہ اسمٰعیل شہید علیہ رحمت ۔ فارسی ۔ ۱۶۷ صفحات، بڑی تقطیع +

ہے۔" (صلا) ....

"امور متعلق بعثت۔ اور جن کے بتلانے کے واسطے حضرتؐ آئے۔ مثلاً حضرت اسواسطے مبعوث ہوئے کہ اُمّت کو منع کریں کہ جس چیز سے غفلت پیدا ہو اور دُنیا میں تنگی ہو وہ نکریں چنانچہ مکان، کھانے، کپڑے میں حد باندھ دی کہ بہت اسراف نہ کریں۔ حرام چیزیں نہ کھاویں۔ ریشمی، زرّیں اور کوسم زعفران کا رنگا ہوا کپڑا نہ پہنیں۔ اور اُمت کو حکم کریں کہ جن باتوں سے خدا کا دھیان بڑھے اور دُنیا کا انتظام دُرست ہو وہ کریں۔" (صلا)

اس رسالہ میں اشغال، مراقبہ، خواب، رویائے صالحین، الہام و وحی اور اقسام الہامات سے بہت ہی تشفی بخش بحث کی گئی ہے۔

مولانا عنایت علی صادق پوری عظیم آبادی

مولانا عنایت علی عُرف منجھلے صاحب۔ آپ مولانا ولایت علی کے منجھلے بھائی اور آپ کے شریک کار تھے۔ قبل بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے بھی حضرت سید احمد بریلویؒ کی بیعت کی تھی اور آپ کی خلافت بھی حاصل کی تھی۔ غزوات میں مولانا عنایت علی نہایت جری تھے۔ آپ خالدؓ دوراں کہلاتے تھے۔ آپ کی شجاعت بے مثل تھی۔ فن سپہ گری میں بھی آپ کو مہارت حاصل تھی اور فوجی تنظیم کی صلاحیت

بھی ثابت ہے۔ تفصیلات مولانا ولایت علی کے حال میں بیان ہو چکی ہیں۔ مجموعۂ رسائل تسعہ میں ایک رسالۂ اُردو موسوم بہ "بُت شکن شامل ہے" جس میں تعزیہ کی بُرائی اور اس کے بنانے اور پُوجنے والوں کی بیوقوفی اور نادانی کا بیان ہے"۔ یہ رسالہ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کا تصنیف کیا ہوا ہے۔ سنِ تحریر درج نہیں۔ نمونۂ تحریر حسب ذیل ہے:۔

"...... اسی طرح اب سمجھو وہ جنّت جس کی چوڑائی ساتوں آسمان و زمین کے برابر ہے اور تمام آباد، کہیں جنگل اور ویران نہیں۔ ایک بالشت زمین اُسکی قیمت میں ساری روئے زمین سے زیادہ۔ ایک ادنیٰ مکان وہاں کا تمام دُنیا کے محل سے بہتر۔ یہ نعمتیں اللہ نے امام کو بخشیں۔ بیشک وہ ایسے عیش میں اسوقت ہیں۔ اور اُن کا دُشمن جو یزید تھا۔ وہ دوزخ میں جلتا ہوگا۔ جس کے شعلے آسمان سے بات کرتے ہیں۔ چنگاریاں اُس کی جیسے اُونٹوں کی قطار۔ ساٹھ برس کی راہ سے آدمی کو کھینچتی ہے۔ جیسے بھُوکا اژدہا۔ مچھر وہاں کے اُونٹوں کے برابر۔ مکھیاں جیسے ہاتھی۔ کھٹمل جیسے گینڈے۔ جُوں جیسے بھینسیں۔ یہ سب ہزاروں بدن میں لپٹ رہے ہیں اور سانپ بچھو بیشمار، ایسے زہردار کہ اگر دُنیا میں آکے دَم پھُونکیں، گھانس سارے جہان کی جَل جاوے اور درخت خشک ہوجاویں۔ وہاں کی بیڑیوں کی زنجیر کی ایک ایک کڑی سَتّر سَتّر ہزار گز کی۔ سیخ کا پھَل جیسے شیطان کا سَر۔ اُس کا ایک قطرۂ عرق زمین پر پڑے تو تمام زمین کے ڈوم چمار خاک روب تک اُس کی بُو سے تاب نہ لا کر مرجاویں۔ وہ کھانے کو ملے گا اور تانبا پگھلا اور لہو پیپ گرم پانی پینے کو.... ......" (ص ۹۸-۹۷)۔

رسالہ بُت شکن صفحہ ۹۴ سے صفحہ ۱۰۶ تک پھیلا ہوا ہے اور آخر میں ایک طنزیہ غزل ہے۔ عبارتِ نثر میں بھی طنز کی تیز کاٹ جا بہ جا محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً :۔

" ...... ایک سال ایسا ہوا کہ محرم کا عشرہ اور ہندوؤں کا رتھ جاترا ایک ہی دن پڑا۔ جب بازار میں ڈھپ ڈھپ بجتا۔ اور لوگوں کی بھیڑ چلی آتی دیکھی تو مسلمان تعزیہ پرستوں نے سمجھا کہ تعزیہ آتا ہے۔ اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور اونچا سا لکڑی کا بنا ہوا اور اُس پر چنور ہوتا دیکھ دست بستہ ہوکر ادب سے سلام بجا لائے۔ نزدیک پہنچے ، دیکھا تو معلوم ہوا کہ رتھ جاترا ہے۔ توبہ توبہ کرکے دوکان میں غیرت سے گھس گئے۔ اس واسطے کہ جو تعزیہ نہیں پوجتے ٹھٹھا کریں گے۔ اور کبھی ایسا ہوا کہ ڈھپ ڈھپ کی آواز سُن کر ہندوؤں کو دھوکا ہوا ، وہ سمجھے کہ ہمارا ٹھاکر چلا آتا ہے۔ جب بہت قریب پہنچے تب معلوم ہوا کہ تعزیہ ہے۔ اور کبھی یوں ہوا کہ دُور سے اُس کی چھتری اور ڈھول بجتا چنور ہوتا دُھوم دَھام سے آتا ہوا دیکھ کر ہندو کہنے لگے کہ ہمارا ٹھاکر ہے اور مُسلمان کہنے لگے کہ ہمارا تعزیہ ہے۔ آخر خوب ردّ و بدل ہوئی اور آپس میں شرط ہونے کی نوبت پہنچی۔ یہ تہتک اور فضیحتی دیکھ کر کتنے ہی غیرت والے مسلمانوں نے اُسی سال تعزیہ پوجنے سے توبہ کی ......" (ص۱۰۵)۔

غزل کے چند اشعار بھی نقل کئے جاتے ہیں :۔ ؎

جھاڑ و مہندی و شدّہ و یا نشان و عَلَم — بنائے لوگوں نے بُت لا کلام لکڑی کے
کریں ہیں عیش ہمارے امام جنّت میں — یہاں پڑے ہیں تمہارے امام لکڑی کے

نکالو کھود کے ہندو کی طرح پتھر کا　　　　یہ پائدار نہیں ہوتے کام لکڑی کے

تمت

مولانا فیاض علی

"رسالۂ فیض الفیوض - از تصنیفات فاضل اجل عالم اکمل حضرت مولنا فیاض علی صاحب علیہ الرحمۃ والغفران خلف الصدق حضرۃ مولوی الٰہی بخش مرحوم مغفور، صادقپوری عظیم آبادی خلیفۂ حضرت مولنا ولایت علی صاحب زبیری الہاشمی صادقپوری ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم .. .. اما بعد واضح ہو کہ جب کہ جناب مولنا فیاض علی صاحب خلف اوسط حضرت مولنا الٰہی بخش غفرلہما رب العرش صادقپوری عظیم آبادی یکے از خلفائے عظام حضرت مولنا ولایت علی علیہ الرحمۃ زبیری الہاشمی صادقپوری عظیم آبادی ملک افغانستان سے ۱۲۷۲ھ ہجری میں اپنے وطن عظیم آباد کو تشریف لئے آتے تھے ۔ اثنائے راہ میں وارد دہلی ہوئے ۔ اُس وقت بعض لوگوں نے وہاں کے آپ سے کچھ سوال کیا ۔ اُس کا جواب فی الفور بالبدیہہ بغیر رجوع بطرف کتاب آپنے دیا اور روانہ عظیم آباد ہو گئے ۔ بعد اُس کے اُن لوگوں نے اُس سوال و جواب کو صاف کر کے اور اُس کا نام فیض الفیوض رکھ کر چھپوا دیا ۔ چونکہ وہ رسالہ فارسی زبان میں تھا، عوام اُس کے فوائد و منفعت سے محروم تھے ۔ لہٰذا فیقر سراپا تقصیر الٰہی بخش بہاری عفی عنہ حسب ارشاد فاضل اجل عالم باعمل یادگار سلف

ممتاز خلف جناب مولانا عبدالرحیم صاحب زبیری الہاشمی صادقپوری عظیم آبادی دام فیضہ خلف اکبر جناب مولانا فرحت حسین قدس سرہٗ برادر حقیقی حضرت مولانا ولایت علی الرحمۃ والغفران کے اُسکا ترجمہ عام فہم اُردو میں اصل کتاب کو صفحہ کے اوّل کالم میں اور ترجمہ کو دوسرے کالم میں لکھ کر عام اہل اسلام کے پیش نظر کرتا ہے ....." (ص۱۰۷-۱۰۶)۔

مولانا[1] فیاض علی مولانا الٰہی بخش صادقپوری کے بیٹے اور شیخ ہدایت علی مہدانوی کے پوتے تھے۔ آپ نے درسی کتابیں اپنے برادر معظم مولوی احمداللہ سے پڑھیں اور سندِ حدیث مولانا ولایت علی سے لی۔ آپ کا وعظ نہایت پُر اثر ہوتا تھا۔ آپ بڑے مناظر بھی تھے۔ آپ اپنے مرشد مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد میں بھی شریک ہوتے رہے۔ دلیری اور شجاعت کے ساتھ اُمورِ تمدّن کے بھی ماہر تھے۔ آپ مولانا ولایت علی کے انتقال (۱۸۵۲ء) کے بعد سرحد سے پٹنہ واپس آ گئے تھے پھر چند سالوں کے بعد سرحد افغانستان کی طرف ہجرت کر گئے اور مُلک سوات بُنیر کو پہنچے اور وہیں وفات پائی۔

رسالۂ فیض الفیوض مع ترجمہ اُردو موسوم بہ منبع الفیوض مجموعۂ رسائل تسعہ کے صفحہ ۱۰۶ سے صفحہ ۱۳۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ سوال و جواب اجتہاد و فقاہت، تقلید و سُنّت، استنباط و تفکّر فی الدین کے متعلق ہیں۔ طرزِ کلام درج ذیل ہے:۔

"سوال (۴)، بعد لازم کرلینے ایک مذہب کے دوسرے مذہب میں چلا جانا صحیح ہے یا نہیں۔ اور یہ جو حنفیوں کے بعض فتوی میں لکھا ہے کہ اگر شافعی

---

[1] الدّر المنثور فی تراجم اہل صادقفور، معروف بہ تذکرۂ صادقہ از محمد عبدالرحیم صادقپوری۔

مذہب والا حنفی مذہب میں چلا آئے تو اسکو خلعت دیا جائے۔ اور اگر حنفی مذہب والا شافعی مذہب میں چلا جائے تو اسکو سزا دینی چاہیئے۔ اسکی کیا دلیل ہے۔ اور اگر مقلد فقیہہ ہے اور علم تفسیر و حدیث و اُصول و فقہہ کو جانتا ہے اُس کو اگر کسی مسئلہ میں دوسرے مذہب کے علماء کے قول کی کسی دلیل سے ترجیح معلوم ہو تو اس مسئلہ میں اس کو اپنے امام کے مذہب سے انتقال کرنا لازم ہے یا نہیں۔

جواب (۴) ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جانا بشرطیکہ لہو و لعب کے قصد سے نہ ہو درست ہے۔ ہمارے شیخ ملک العلماء مولٰنا عبد العلی قدس سرہٗ مُسلم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ جس شخص نے ایک مذہب معین کو اپنے اوپر لازم کر لیا اُس پر واجب نہیں ہے کہ عمر بھر اُسی مذہب پر رہے۔ اگر وہ ایک مذہب سے دوسرے مذہب میں چلا جائے تو صحیح ہے ....
...... اب رہی یہ بات کہ حنفی اگر شافعی مذہب میں چلا جائے تو اُس کو سزا دینی چاہیئے اور شافعی اگر حنفی مذہب میں چلا جاوے تو اُس کو خلعت دینا چاہیئے، یہ محض مخترع مبتدع قول ہے، اس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ تعصب سے پیدا ہوا ہے۔ مُلّا علی قاری سم القوارض میں کہتے ہیں کہ یہ جو حنفیوں میں مشہور ہے کہ حنفی جب شافعی مذہب ہو جائے تو اُس کو سزا دیجائے اور جب اُسکا اُلٹا ہو تو خلعت دیا جائے یہ ایک بناوٹ کی بات ہے .....
.... اور امام ابو شامہ فرماتے ہیں کہ جو شخص فقہ کے ساتھہ مشغول ہو اُس کو لائق ہے کہ نہ بس کرے ایک

امام کے مذہب پر اور اُس کو لائق ہے کہ مسائل میں سے اُنہیں مسائل کی صحت کا اعتقاد کرے جو قریب تر ہو کتاب وسُنت وحکمت کے، دلالت سے اور یہ آسان ہے اُس پر جب کہ علوم متقدمہ کے معظات کا یقین رکھتا ہے۔ اور چاہیئے کہ پرہیز کرے تعصب سے الخ۔" (ص۱۲۴-۱۲۲)

مجھے چند مطبوعہ رسالے مولوی عبدالغفار صاحب صادق پُوری سے ملے۔ دو رسالے ایک ساتھ چھپے ہیں اور تین رسائل ایک ساتھ۔ اوّل الذکر ۲۸ صفحات پر مشتمل ہیں۔ سائز "۶ × "۸۔ کاغذ ہلکا زرد اور زردی مائل سُفید، مخلوط۔ اختتام پر مندرجۂ ذیل عبارت درج ہے:۔

"الحمدللہ کہ تفسیر الحمدللہ کی ہندی زبان میں جو حضرت رئیس المومنین امام العارفین سیّد المسلمین قدوۃ السالکین پیرو مرشد حضرت سیّد احمد صاحب نے نفع پہنچائے اللہ ہمکو اور سب مُسلمان بھائیوں کو اُنکی بقا سے اور زیادہ کرے فیض اور ارشاد اُنکا، آپ اپنی زبان فیض و ہدایت ترجمان سے فرما کے جامع علوم ظاہری و باطنی جناب مولانا عبدالحی صاحب دام فیضہٗ سے تحریر کروائی۔ اور حقیقت صلواۃ کی جو بیان نماز پنجگانہ ہے اور کئی فائدوں کے ساتھ جسنے ایک فاضل کامل نے حضرت پیرو مرشد کے مریدوں میں سے، حضرت کی زبان اقدس سے سُنکے ہندی زبان میں لکھا ہے، بتصحیح سے جناب مولانا بدیع الزماں صاحب زاد اللہ برکاتہٗ، کے کلکتے کے مصر گنج میں دسویں محرم ۱۲۶۸ھ ہجری میں چھاپی گئی۔" (ص۲۸)۔

پہلے رسالہ حقیقت نماز ہے۔ نمونۂ بیان حسب ذیل ہے :-

"الٰہی شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہمارے دل کو روشن اور زبان کو گویا کیا، اور ایسے نبی مقبول کو خلق اللہ کی ہدایت کے واسطے بھیجا، کہ جس کی ادنیٰ شفاعت سے دونو جہان کی نعمت پاویں، اور اس کی رہنمائی سے عرفاں کی لذت اٹھاویں" (صا)

صفحہ ۱۷ کے سرے تک حقیقتِ نماز بیان ہوئی ہے۔ بعد ازآں تفسیر الحمد شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۲۸ تک جاتی ہے :-

"سورۂ فاتحہ اس سورے میں اللہ نے دعا کی طرح تبلائی اور اللہ کے تبلائے برابر کسی کا تبلایا نہیں ہوتا۔ اس واسطے یہ سُورت بڑی بزرگی رکھتی ہے۔ اور دُعا میں دستور یوں ہے، ہر کوئی جانتے ہے، کہ باوجودیکہ سب آدمی محتاج بے مقدور ہیں، پر سُوال کرنے میں جو آدمی سخی کریم باہمت اَور بامقدور ہوتا ہے، اُسی سے مانگتے ہیں۔ (ص۱۷) ۔ . . . .

دوسرے مجموعے میں پہلا رسالہ نماز بامعنی ہے۔ یہ صفحہ ۴ کے وسط تک ہے۔ دوسرے مجموعہ کا سائز بھی وہی ہے جو پہلے مجموعہ کا ہے۔ رسالے مطبوعہ ہیں۔ کاغذ زردی مائل سفید۔ طرزِ تحریر حسب ذیل ہے :-

" . . . . . . سُنا چاہیئے کہ نماز میں جو جو سورتیں اور دُعائیں معمولی لوگ پڑھا کرتے ہیں، اگر اِنکے معنوں کو بھی یاد کر لیں تو اللہ کی رحمت دِلپر نماز میں ٹپکے اور جہاں مضمون عتاب کا آوے تو دِل خود بخود ڈر جاوے اور آنکھوں میں پانی بھر آوے اور جہاں انعام و اکرام اور عیش و آرام جنّت کے سمجھیں تو بے اختیار

دلمیں فرحت اور تازگی پیدا ہونے لگے اور بُرے کام کیطرف دل نجاوے، آپسے آپ متقی بن جاویں ......" (صـ۱)

بعد ازیں رسالہ جہادیہ شروع ہوتا ہے۔ یہ منظوم ہے اور صفحہ ۴ کے وسط سے صفحہ ۷ تک پھیلا ہوا ہے۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:۔

"بعد تحمید خدا نعت رسُول اکرم — یہ رسالہ ہے جہادیہؔ کہ لکھتا ہے قلم
واسطے دین کے لڑنا نہ پئیے طمع بلاد — اہل اسلام اِسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
ہند کو اسطرح اسلام سے بھر دے اے شاہ — کہ نہ آوے کوئی آواز بجز اَللہ اَللہ

صفحہ ۸ جو آخری صفحہ ہے نکاح ثانی بیوگان کے متعلق نثر میں ہے۔ یہ دوسرے مجموعہ کا تیسرا رسالہ ہے۔ طرز بیان حسب ذیل ہے:۔

"اِن دنوں میں ہندوؤں کی رسموں میں سے ایک رسم مسلمانوں میں بہت بڑی پھیلی ہے کہ جہاں عورت کا شوہر مرا تو اُسکا نکاح نہیں کر دیتے بلکہ اُس کے کرنے کو عیب سمجھتے ہیں اور اَللہ تعالےٰ نے دوسرے نکاح کو قرآن میں بہت تاکید سے فرمایا اور اُسکی تعریف کی ....." (صـ۸)۔

اس رسالہ کے اختتام پر چند نصیحت آموز اشعار ہیں۔ رسالوں کے دوسرے مجموعے کے مؤلف کے بارے میں کوئی علم حاصل نہ ہو سکا۔ اَغلب یہی ہے کہ یہ رسالہ اہل صادقپور میں سے کسی کا لکھا ہوا ہے۔

دراصل جدید اُردو نثر کی "تاریخ حلقۂ سرسید احمد خاں سے نہیں شروع ہوتی بلکہ دائرۂ سید احمدؒ بریلویؒ سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اوّل الذکر نے رسالۂ

تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ثانی الذکر نے تہذیب الایمان کے لئے متعدد رسالے شائع کئے۔ دونوں تحریکیں اصلاحی تھیں۔ حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریک میں صادقپوریوں کا بڑا ہاتھ تھا۔ مختصر یہ کہ جدید اُردو نثر کی ترویج کی محفل میں اوّلیت کا سہرا دائرۂ سید احمد کے سر ہے۔ اس حقیقت سے ابھی تک پوری واقفیت بھی نہیں اور عام طور پر اسے تسلیم نہیں کیا گیا۔

۱۴۵

بہار میں اُردو ادب کے عام میلانات

میں اپنی اس پیشکش کو ختم کرتے ہوئے بہار میں اُردو ادب کے عام میلانات کے متعلق کچھ عرض کرنی چاہتا ہوں ۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ اس دیار کی شاعری میں صوفیانہ اور مذہبی رنگ غالب ہے ۔ مرثیے تو جذباتِ عقیدت و غم سے بھرے ہوئے ہیں ہی ، غزلوں اور مثنویوں میں بھی عارفانہ میلان نمایاں ہے گو عام عاشقانہ اور منظری شاعری کی نمائندگی بھی ہوتی رہی ہے ۔

نثر نگاری پر بھی مذہبیت طاری ہے ۔ ناصحانہ ، واعظانہ اور رہبانانہ نثری رسالوں کے نمونے اکثر و بیشتر ملتے ہیں ۔ ہاں داستانیں اور قصّے بھی لکھے گئے ہیں ۔ ایک نثری داستان کا نمونہ تو میں نے پیش کیا ہے اور بعض[1] نمونے مجھے مل نہیں سکے ۔

حق تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء تک بہار میں اُردو ادب صوفیوں اور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہی رہا ہے ۔

زبان و بیان کے طرز اور اسلوبِ اظہار کے اعتبار سے بہار کے اُردو ادب پر ہندوستانیت کا رنگ چوکھا رہا ہے ۔ اُردو زبان و ادب کی روایات کے دو اہم دھارے

---

[1] مثلاً سیّد حمید الدین بہاری کی ' خوانِ الوان ' جو فورٹ ولیم کالج میں بہ سرپرستی ڈاکٹر گلکرائسٹ لکھی گئی تھی ۔ ' اُردو ادب میں جان گلکرائسٹ کا مقام ' ہماری زبان ' ۸ ر فروری ۱۹۵۷ء علی گڑھ ص ۱۱ ۔

ہیں ، " ہندوستانیت " اور " عرب عجمیت "۔

اُردو نظم و نثر کے طرز و اسلوب میں بھی یہ دو میلانات صاف نظر آتے ہیں۔ کبھی 'ہندوستانیت " کا غلبہ رہتا ہے اور کبھی 'عرب عجمیت' کو فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بہار میں اٹھارہویں صدی عیسوی تک خصوصًا طرز و اسلوب کے لحاظ سے 'ہندوستانیت' کو غلبہ حاصل رہا ہے اور بعد از آں توازن کی صورت پیدا ہوئی۔ اس صوبہ میں 'عرب عجمیت' کو کبھی کامل فوقیت حاصل نہیں ہوئی۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بہار کی شاعری میں موضوعِ سخن، فضا اور زبان کے اعتبار سے مقامی رنگ چمک اور بہاری آہنگ گونج اٹھتا ہے۔

دور اولیٰ کے کئی بہاری شعراء کے کلام میں بحر و وزن کا استعمال ناہموار طور پر ہوا ہے۔

۱۸۵۷ء تک بہار کے تذکرہ نگاروں نے اُردو شعراء کے تذکرے فارسی میں لکھے۔ اِن کے معیارِ تنقید و ترتیب پر بھی کلیم الدین احمد صاحب کی وہ تنقید صادق آتی ہے جو اُنھوں نے تذکروں کے متعلق اپنی کتاب " اُردو تنقید پر ایک نظر " میں لکھی ہے۔ یعنی یہ تذکرے برائے نام تنقیدی ہیں اور حالات کی پیشکش اور ترتیب کے لحاظ سے بھی ناقص ہیں۔

معذرت

مجھے اپنی تنگ دامانی اور بے بضاعتی کا افسوس ہے۔ اس کتاب میں بہتیرے شعراء اور کئی اُدباء نہیں شامل کئے جا سکے۔ جو شریک انجمن ہوئے بھی ہیں۔ اُن کے

کلام وسخن کی پوری نمائندگی نہیں ہوسکی۔ بعض اہلِ فن کی تاریخِ پیدائش یا تاریخِ وفات یا دونوں باوجود کوشش کے معلوم نہ ہوسکیں۔ اس وجہ سے ترتیبِ کتاب میں نقص رہ گیا۔ اور بعض دوسری جہتوں سے بھی نقائص رہ گئے ہوں گے۔ یہ میری خطا یا کمزوری ہے۔ میں ان سب نقائص کے لئے اہلِ نظر حضرات سے معذرت خواہ ہوں۔

ہوں۔

نوٹ

صفحہ ۲۵ :۔ ڈاکٹر اس۔سی سرکار سابق صدر شعبۂ تاریخ، پٹنہ کالج اپنے خطبات میں اس حقیقت کو بیان فرمایا کرتے تھے کہ "آریہ حملہ آور تین بڑی بڑی لہروں میں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہیں۔"

صفحہ ۹۳ :۔ اشفاق حسین اور شکیلہ اختر کے مقالے "بہار کے دیہاتی گیت" معاصر، پٹنہ فروری و مارچ ۱۹۴۴ء (جلد ۷، نمبر ۲، ۳) میں شائع ہوئے تھے۔ از صفحہ ۶۷ تا ۷۶ +

صفحہ ۱۰۱ :۔ پرافسر گورکھ ناتھ سنہا کے غیر مطبوعہ مقالہ تک میری رسائی ہوئی ہے۔ موصوف نے شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی کو بھی توجہ دلائی تھی کہ وہ اس امر کی تفصیلی تحقیق کرے کہ "بہار کے اکثر راجپوت گھرانے ترکوں اور مغلوں کی افواج کے ساتھ اس دیار میں آئے۔"

صفحہ ۳۸۱ :۔ "مجالس چہلم" حیدر بخش حیدری۔ مصنف آرائش محفل کی تصنیف ہوسکتی ہے۔ صاحب اربابِ نثر اُردو نے سید حیدر بخش حیدری کی کتاب "گلِ مغفرت" کا تذکرہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اس کا ایک مطبوعہ نسخہ دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ نایاب ہے +

اختر اورینوری

کتابیات

(۱) لنگوسٹک سروے آف انڈیا، گریرسن۔

(۲) انڈو ایرین اینڈ ہندی از ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی ۱۹۴۰ء/۱۹۴۲ء

(۳) بنگالی زبان کا آغاز و ارتقا از ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی سنہ ۱۹۲۶ء

(۴) نیشنلزم اینڈ کلچر از روڈولف روکر سنہ ۱۹۴۶ء

(۵) تفسیر کبیر از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد سنہ ۱۹۴۴-۵۷ء

(۶) ہندوستانی لسانیات از ڈاکٹر محی الدین زور۔

(۷) اُردو شہ پارے، از ڈاکٹر محی الدین زور۔

(۸) افادات سلیم از پرافسر وحید الدین سلیم۔

(۹) وضع اصطلاحات از پرافسر وحید الدین سلیم۔

(۱۰) ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از بیمز، ترجمہ سید احتشام حسین۔

(۱۱) خطبات و مقالات گارسان دتاسی، ترجمہ انجمن ترقی اُردو ہند۔

(۱۲) پنجاب میں اُردو از پرافسر محمود شیرانی۔

(۱۳) دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی۔

(۱۴) نقوش سلیمانی از علامہ سید سلیمان ندوی

(۱۵) اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولانا عبدالحق

(۱۶) سب رس، از ملا وجہی دکنی مع مقدمہ مولانا عبدالحق۔

(۱۷) قطب مشتری از ملا وجہی دکنی مع مقدمہ مولانا عبدالحق۔
(۱۸) آب حیات از محمد حسین آزاد۔
(۱۹) داستانِ اُردو از نواب نصیر حسین خیالؔ۔
(۲۰) مقدمہ تاریخ زبان اُردو از ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔
(۲۱) اُردو زبان کا ارتقا از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔
(۲۲) عرب و ہند کے تعلقات از علامہ سید سلیمان ندوی۔
(۲۳) انٹروڈکشن ٹو پراکرت از ڈاکٹر اے۔سی۔ وولنر ۱۹۳۹ء
(۲۴) پالی از ڈاکٹر لاؤ۔
(۲۵) جلوۂ خضر از صفیر بلگرامی۔
(۲۶) کاشف الحقایق معروف بہ بہارستان سخن از نواب امداد امام اثرؔ ۱۸۹۷ء۔
(۲۷) بہار اور اُردو شاعری از پرفیسر معین الدین دردائیؔ۔
(۲۸) تحقیقی مقالے از پرفیسر معین الدین دردائیؔ۔
(۲۹) تاریخ شعرائے بہار از سید عزیز الدین بلخیؔ۔
(۳۰) دیوان جوشش عظیم آبادی، مرتبہ قاضی عبدالودود۔
(۳۱) کلیات راسخ عظیم آبادی۔ مطبوعہ
(۳۲) راسخ از حمید الدین عظیم آبادی۔
(۳۳) بہار نمبر ندیم، گیا۔ ۱۹۳۳ء و ۱۹۳۵ء و ۱۹۴۱ء۔
(۳۴) رسالہ معاصر، پٹنہ کی پوری فائل از ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۶ء

(۳۵) ساتھی، پٹنہ کے خاص نمبر۔

(۳۶) صدائے عام، پٹنہ کے خاص نمبر۔

(۳۷) پٹنہ یونیورسٹی جرنل کے مختلف پرچے۔

(۳۸) کرنٹ اسٹڈیز، پٹنہ کالج کے مختلف پرچے۔

(۳۹) یادگارِ عشق عظیم آبادی مرتبہ شاقب عظیم آبادی۔

(۴۰) رسالہ معیار، پٹنہ کی فائل۔

(۴۱) اُردو تنقید پر ایک نظر از پرافسر کلیم الدین احمد۔

(۴۲) تذکرۂ گلزار ابراھیم از خلیل عظیم آبادی۔

(۴۳) تذکرۂ شورش عظیم آبادی۔

(۴۴) تذکرۂ عشقی عظیم آبادی۔

(۴۵) شاہ مجتبےٰ حسین صاحب بہار شریف کے کتب خانہ سے حاصل شدہ چند قدیم مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسُخے۔

(۴۶) چھوٹی اور بڑی خانقاہ پھُلواری شریف سے حاصل شدہ قلمی مجموعے اور نسُخے۔

(۴۷) حکیم شعیب صاحب مرحوم پھُلواروی سے حاصل کئے ہوئے مخطوطات۔

(۴۸) خانقاہ منگل تالاب، پٹنہ سیٹی کی چند قلمی مثنویاں۔

(۴۹) مشرقی کتب خانہ خدابخش خاں پٹنہ کے قلمی نسُخے، مثلاً کلیات راسخ عظیم آبادی (خود نوشتہ) اور مکتوبات حضرت مظفر شمس بلخی۔

(۵۰) مثنوی گوہر جوہری کا قلمی نسخہ، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری۔

(۵۱) پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے متعدد مخطوطات۔

(۵۲) پروفیسر سید ذکی الحق بی۔ ان کالج سے حاصل کی ہوئی قلمی کتابیں۔

(۵۳) مولوی عبدالغفار صاحب صادقپوری سے حاصل شدہ قلمی اور مطبوعہ رسالے۔

(۵۴) الدُّرالمنثور از مولوی عبدالرحیم صاحب صادق پوری

(۵۵) حیات سید احمد بریلوی، از جعفر تھانیسری۔

(۵۶) سیرت اسمٰعیل شہید۔ مطبوعہ لاہور۔

(۵۷) تقویت الایمان از حضرت اسمٰعیل شہیدؒ۔

(۵۸) اُردو گزٹ، الٰہ آباد، برائے ممالک مشرقی کی ایک فائل۔

(۵۹) پٹنہ کمشنری کے ریکارڈ۔ اور تاریخ مگدھ (مطبوعہ) از سید فصیح الدین بلخی۔

(۶۰) شاہ فخر عالم، سجادہ نشیں خانقاہ خلیفہ باغ، بھاگلپور کے کتبخانہ کی قدیم مطبوعہ کتابیں اور قلمی نسخے۔

مذکورہ بالا کتابوں، رسالوں اور قلمی نسخوں کے علاوہ اور بہت سی کتب و رسائل و مخطوطات سے مدد لی گئی ہے۔ پروفیسر جئے دیو مصر اٹپنہ کالج کی مدد سے میتھیلی رسم الخط میں لکھے ہوئے مخطوطوں کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ اسی طرح ودیاپتی کی کیرتی لتا اور کیرتی پتاکا، اور ایک مگھی رسالہ کے چند نمبروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ میں ہر چشمۂ فیض کا ممنون کرم ہوں+

اختر اورینوی

اشاریہ

ط

ظ

ع

.. ..

.. ..